الطاف
حسین
حالی
حیاتِ جاوید

# حیاتِ جاوید

جلد اوّل

مولانا الطاف حسین حالیؔ

ارسلان بکس

علامہ اقبال روڈ میرپور، آزاد کشمیر

# فہرست

## تیسرا باب (1857ء - 1868ء)

## چوتھا باب (1869ء - 1870ء)

## پانچواں باب (1870ء - 1878ء)

## چھٹا باب (1878ء - 1898ء)

## دوسرا حصہ

## سرکاری خدمات



## پولٹیکل خدمات



## ملکی و قومی خدمات

# حیات جاوید

یہ ضخیم کتاب جو 1901ء میں سرسید کے انتقال کے بعد شائع ہوئی' حالی کی سات سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ وہ اسے کئی سال سے مرتب کر رہے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی سرسید کو دکھائی اور نہ سرسید نے دیکھنے کی خواہش کی۔ جب سرسید کا انتقال ہو گیا تو حالی کو اس بات کا بڑا قلق ہوا کہ انھوں نے اس کا مسودہ سرسید کو کیوں نہ دکھایا تاکہ انہیں اندازہ ہوتا کہ ان کے بارے میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ سرسید کی وفات کے بعد حالی اور بھی تندہی سے اس کی تکمیل میں مشغول ہو گئے تاکہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں ان کے محسن کی سیرت جلد سے جلد پہنچے اور اس سے سبق لے سکیں۔ لیکن وہ اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کام خراب ہو جائے۔ اپنے ایک خط میں خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں: "لوگ ہر طرف سے اصرار کر رہے ہیں کہ دو تین مہینے کے اندر اندر کتاب مکمل کر دو۔ مگر میں ہرگز کسی کی نہیں سنوں گا اور جب تک میرے حسب دلخواہ سرسید کی لائف مکمل نہ ہو گی اس وقت تک اس کا شائع ہونا نہ چاہوں گا۔ عربی میں ایک مثل ہے کہ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کام کتنی دیر میں ہوا بلکہ سب یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسا ہوا۔ لوگ اس بات کا لالچ دیتے ہیں کہ جس قدر جلد لائف تیار ہو گی اسی قدر کثرت سے فروخت ہو گی۔ مگر اس بات کی مجھے مطلق پرواہ نہیں۔ لائف عمدہ لکھی جائے اگرچہ اس کی ایک جلد بھی فروخت نہ ہو"
یہ ہے ایک سچے فن کار کا نقطۂ نظر۔

یہ خط اپریل 1898ء کا ہے۔ دو سال بعد مارچ 1901ء میں حیات جاوید چھپ کر تیار ہوئی تو مولانا حالی نے اپنے بیٹے کو خط میں لکھا "خدا کا شکر ہے کہ یہ فرض ادا ہو

گیا اور یہ کہنے کی کسی کو گنجائش نہ رہی کہ جس شخص نے قوم کی ایسی خدمات کیں قوم میں کسی کو اس کی لائف لکھنے کی توفیق نہ ہوئی"۔

اگرچہ اس سے پہلے حالی سیرت کی دو کتابیں لکھ چکے تھے۔ مگر اس کتاب کے لکھنے میں انہوں نے جو ڈھنگ اختیار کیا اور جو اصول ان کے پیش نظر تھے' ان کی تشریح کے لئے حیات جاوید کے دیباچے کا تھوڑا سا اقتباس پڑھئے:۔

"ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن اول تو ایسی بایو گرافی چاندی سونے کے ملمعے سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی' اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنہوں نے اس موج خیز اور پر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے' ان کو سب نے بھلا جانا کیوں کہ ان کو کسی کی برائی سے سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے کیوں کہ انہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیکھ سے کہیں ادھر ادھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے' بڑے بڑے علما مفسرین کو لتاڑا ہے' اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے' قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے؟ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھونک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر پر نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف سے اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے"۔

سرسید سے حالی کی عقیدت کی بڑی وجہ اس بلند مقصد اور قومی خدمت سے ان کی محبت تھی، جو سرسید کے پیش نظر تھا۔ حالی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی رہ نمائی اور اصلاح کا جو حق سرسید نے ادا کیا اور جس طرح اپنی پوری زندگی قومی خدمت میں بسر کی وہ ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم سرسید کے عظیم الشان کاموں اور پر خلوص خدمات کو حقیقت اور صداقت کی روشنی میں دیکھے اور اس سے سبق لے اور قومی رہنما ان کی سیرت اور کارناموں سے سیکھیں کہ قوم کی خدمت کیسے کی جاتی ہے۔ لیکن ان کا منشا محض سرسید کے "فضائل و مناقب" بیان کرنا اور "مدلل مداحی" نہیں تھا۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے۔ بلکہ حالی نے پوری ایمان داری اور صداقت کے ساتھ سرسید کی خوبیاں اور کمزوریاں دکھائی ہیں اور ان کے کارناموں کو تنقیدی نظر سے پرکھا ہے، یہ ضرور ہے کہ انسان کو اپنے عزیز یا دوست کی کمزوریاں ذرا مدہم اور خوبیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لیے اگر حیات جاوید میں سرسید کی تعریف کا پہلو ضرورت سے زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے تو مقام تعجب نہیں۔ جہاں تک عمداً "مدلل مداحی" کا سوال ہے، حالی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حالی نے علمی دنیا اور عملی دنیا اور عملی زندگی دونوں میں عمر بھر دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس لیے یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے سرسید کے لیے جو کچھ لکھا اس میں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھیے کہ حالی پچیس سال تک سرسید کے نہایت قریبی دوست رہے تھے اور انہوں نے ان کی سیرت اور شخصیت کو قریب سے دیکھا اور ان کے کاموں میں ان کا ساتھ دیا اور ہاتھ بٹایا تھا۔ سرسید کے مقاصد اور ان کی صفات اور ان کے نقطۂ نظر کو جس طرح وہ سمجھ سکتے تھے دوسروں کے لئے مشکل تھا۔ کسی انسان کی سیرت اور کاموں کو ٹھیک ٹھیک وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اس کے ساتھ کافی وقت گزارا ہو اور خلوت و جلوت میں اس کے ساتھ رہا ہو۔ حالی سرسید کے دوست، رفیق کار، معتقد اور دیرینہ ساتھی تھے،

اس لیے ان کی سیرت اور کارناموں سے قوم کو روشناس کرانے کا حق حالی سے زیادہ اور کس کو ہو سکتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے حیات جاوید میں سرسید کی ایک مکمل اور جامع تصویر دکھائی اور مورخ و نقاد دونوں کے فرائض کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے فلسفیانہ نقطہ نظر سے سرسید کی زندگی اور کاموں کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس کتاب میں سرسید کے ساتھ ساتھ قوم کی ذہنی زندگی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے بقول آل احمد سرور ''اس میں صرف سرسید کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آگئی ہے۔ حالی نے تمام مواد کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ سرسید کے تمام کارناموں کا محرک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا' بالکل صحیح ہے۔ اور انہوں نے سرسید' مذہبی خدمات پر بجا طور پر زور دیا ہے' سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ حالی کے ہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو ''مدلل مداحی'' یا ''کتاب المناقب'' اور ایک رخی تصویر کہا گیا' حالاں کہ سوانح نگاری میں یہ سنگ راہ کا کام دیتی ہے''۔

حیات جاوید کی زبان اور طرز بیان بہت رواں اور سلجھا ہوا ہے باتوں باتوں میں بڑے بڑے مشکل مسائل پانی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کہیں ذہن اٹکتا ہے نہ دماغ ٹھوکر کھاتا ہے۔ ان کے ایک نقاد نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ''حیات جاوید میں تو انہوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے ہیں اور ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے جو اپنی جگہ سے اٹھایا نہیں جا سکتا....''۔

لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود اگرچہ ''حیات جاوید'' نے شہرت بہت پائی لیکن پھر بھی اسے اتنی مقبولیت نہ حاصل ہو سکی جتنی حالی کی بعض دوسری تصانیف کو ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ قوم کے ناشروں اور کتب فروشوں نے شروع سے اس سے بے اعتنائی برتی۔ اس قدر قابل قدر اور نتیجہ خیز کتاب کے مقابلے میں'

جس کی قدر صرف صاحب ذوق اور علم دوست حضرات ہی کر سکتے تھے' انہوں نے زیادہ بکنے والی کتابوں کی اشاعت میں روپیہ لگانا پسند کیا اور اس لیے کتاب کی اتنی اشاعت نہ ہو سکی جتنی ہونی چاہیے تھی۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آج کل کا زمانہ تیز رفتاری کا ہے لوگوں کی مصروفیات حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں' ہر کام میں عجلت اور ہر چیز میں اختصار پسند کیا جانے لگا ہے۔ ناولوں کی جگہ مختصر افسانے نے لے لی ہے۔ کتابوں کی جگہ ان کے خلاصے پسند کیے جاتے ہیں .... اس لیے ہزار صفحے کی یہ ضخیم کتاب پڑھنا لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

شاید ایک اور وجہ یہ بھی ہو کہ سرسید کے بعد ان کی طرف سے غلط فہمیاں پھیل گئیں لوگ سرسید کے اصلی مقصد کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان کی شخصیت سے انہیں زیادہ دلچسپی نہ پیدا ہو سکی۔ اس لیے ان کی سیرت کو پڑھنے اور ان کے کارناموں کو سمجھنے کی زیادہ طلب نہ رہی۔ نئے زمانے میں ایک گروہ یعنی ترقی پسندوں نے سرسید کو انگریزی حکومت کا خیر خواہ اور ساتھی سمجھ کا ناقابل اعتنا جانا۔ دوسرے گروہ یعنی رجعت پسندوں نے ان کی وقتی مصلحت کو ان کا اصول زندگی قرار دے کر ان کی تصویر میں اپنے رنگ بھر دیے۔ یعنی ان کو پورا ابن الوقت بنا دیا۔ حالانکہ اگر "حیات جاوید" کا غور سے مطالعہ کیا جاتا تو ان دونوں فریقوں کی غلط فہمی دور ہو جاتی اور سرسید کا مقصد اور مشن آئینہ ہو جاتا۔ ہمارا خیال ہے کہ سرسید کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کرنے کی ایک یہی صورت ہے کہ کوئی صاحب نظر مورخ اور ادیب "حیات جاوید" کا خلاصہ مرتب کر کے شائع کرے۔ اس طرح ایک طرف سرسید کی سیرت سے قوم روشناس ہو گی۔ دوسری طرف حالی کی یہ ادبی اور قومی محنت سوارت ہو گی اور یہ انمول کتاب جو آج کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہے قبولیت کا وہ درجہ پالے گی جس کی وہ حقدار ہے۔

یہاں ہم "حیات جاوید" کا ایک اقتباس دیتے ہیں جس میں حالی نے سرسید کی

ترقی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

"سرسید کی لائف میں جیسا کہ ان کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر ان کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ قطع نظر ان جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا' اتفاقات حسنہ نے بھی ان کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمت مجتمع تھی۔ ان کی ددھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور ان کی ننھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت' حسین تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانے کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی ننھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ انہوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں کی صحبت برتی ان کی ماں ایک نیک نہاد' سنجیدہ اور دانش مند بی بی تھیں' جن کی تعلیم و تادیب سرسید جیسے جوہر قابل کے لئے اکسیر کا حکم رکھی تھی۔ انہوں نے حسن اتفاق سے ایسی حالت میں نشوونما پائی کہ نہ ان کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا۔ وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے۔ مگر اپنے رشتے داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ ان پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا کہ قوائے جسمانی مضمحل ہو جائیں اور نہ ان کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی کہ جدھر منہ اٹھ گیا چل نکلے۔

ان کے والد ایک آزاد منش اور تعلقات دنیوی سے الگ تھلگ رہنے والے آدی تھے۔ گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود منتظم اور رعب و داب کے نہایت متحمل اور بردبار تھیں۔ پس وہ بے جا تشدد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانے میں اکثر والدین

سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلت بیٹھ جاتی ہے سرسید پر کبھی نہیں گزری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی وہ اکثر رنگین جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیرزادوں سے ملنے جلنے لگے سوسائٹی کا پرچھاواں ان پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیے تھا۔ مگر ہونہار نوجوانوں کی لغزشیں بھی ان کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لیے لہو و لعب سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتش گیر مادہ بھرا ہوا تھا وہ آخر کار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو عنفوان شباب میں ہوا و ہوس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حب قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا' اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا۔

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

جس حد تک کہ سرسید کی تعلیم ہوئی اس کو بھی ان کی ترقی کا موئد سمجھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے' قدیم یا جدید کسی طریقے میں پوری تعلیم حاصل نہیں کی۔ اگر وہ پرانے طریقے کی تعلیم پوری کر لیتے اور علوم قدیمہ کا رنگ ان پر پوری طرح چڑھ جاتا' پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کو قبول کرنے کی قابلیت ان میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑ جاتے اور تعصب کے تو بر تو پردے ان کی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقے کی تعلیم بھی ان نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجے کی سویلزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں وہ آخر کار اس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں' یہاں تک کہ وہ ان کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کی جاتی ہیں' محض

بے سود اور لاحاصل جاننے لگتا ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کا پرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا ہونا منجملہ ان اتفاقات حسنہ کے تھا جنھوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے انہیں جھجکنے نہیں دیا"۔

(حیات جاوید)

حیات جاوید کی طرف سے اس وقت قوم نے جو بے توجہی برتی اس کا حالی کو بڑا قلق تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کی چھے سات سالہ جاں کاہ محنت کا یہ ثمر ملا۔ اگرچہ اس کا افسوس ہونا بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن حیات جاوید کا مصنف شہرت کا پرستار اور تحسین کا بھوکا نہ تھا۔ وہ کام کا اصلی انعام خود کام کو سمجھتا تھا۔ انہیں رنج اس بات کا تھا کہ انھوں نے اپنے نزدیک مسلمانوں کے محسن اور قوم کے ایک بے مثال فرزند کی یہ سیرت اس خیال سے لکھی تھی کہ قوم اس سے سبق حاصل کرے گی اور اپنی گرتی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں کیسے دل شکستہ انداز میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ اس قلیل عرصے میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہو گئی ہیں مگر ایسی قدردانی سے وہی شخص خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا کوئی اور مقصد خیال نہیں کرتا۔ بلاشبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ کے لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی مگر میرا یہ خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سرسید کا کوئی دوست کتاب کا بالکل نوٹس نہ لے۔ اور اخباروں کو جانے دیجئے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ جس کو سرسید کی یادگار کہا جاتا ہے.... اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی لیکن اسی کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بارگراں کو اپنے ذمے لے کر سرسید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبک دوش کیا ہے ---"

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی بے وقتی نے ہیرو

کی قدر بھی گھٹا دی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آج پچپن برس بعد بھی اردوداں طبقے میں یہ احساس اور بیداری نہ پیدا ہو سکی کہ وہ اس قابل قدر کتاب کی اصلی خوبی اور بڑائی کو سمجھتی۔ حالی کی عظمت اور بڑائی حالی کی خدمات اور کارناموں کا تو ہم بہت کچھ اعتراف کرتے ہیں' لیکن حالی کی تصانیف کی طرف سے یہ بے اعتنائی برتتے ہیں! حالی اور سرسید دونوں کی ادبی' سیاسی اور سماجی خدمات کیا اس کی مقتضی نہیں ہیں کہ نہ صرف حیات جاوید بلکہ سرسید اور حالی کی کل تصانیف کو اہتمام' خوبی اور صحت کے ساتھ شائع کرایا جائے تاکہ آئندہ نسلیں ہم پر یہ الزام نہ لگا سکیں کہ ہم اپنے بہترین سپوتوں اور بہترین ادیبوں تک کے کارناموں سے بے پروائی برتتے رہے۔

صالحہ عابد حسین

پہلا باب :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سر سیّد مرحوم کی لائف

## پہلا حصّہ

## ۱۸۱۷ء ۱۲۳۲ھ عیسوی سے ۱۸۳۸ء ۱۲۵۴ھ تک

## تاریخ ولادت، خاندان بچپن، تعلیم اور عنفوان شباب

## تاریخ ولادت اور خاندان

سیّد احمد خاں ۵، ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلّی میں پیدا ہوئے[1]۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سیّد ہیں اُن کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے

---

[1] مہدی قلی خاں وزیر فرخ سیر نے اپنی وزارت کے زمانے میں تراہہ بہرام خاں کے قریب ایک بڑی حویلی بنائی تھی جس میں دیوانخانہ فیلخانہ اور اصطبل وغیرہ متعدد مکانات تھے اسکو سرسیّد کے نانا خواجہ فریدالدین احمد نے خرید لیا تھا اور اب تک وہ خواجہ فرید کی حویلی کے نام سے مشہور ہے اسی حویلی کے ایک حصہ میں جو خواص پورہ کہلاتا تھا سید احمد خاں پیدا ہوئے تھے ۱۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور جیسا کہ شجرۂ نسب مندرجہ خطبات احمدیہ سے پایا جاتا ہے اُن کے سلسلۂ نسب میں سب سے اخیر امام حضرت امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا علیہما السلام ہیں اور اسی لیے وہ اپنے تئیں تقوی سید کہتے تھے۔

جس زمانے میں کہ بنی فاطمہ کو بنی اُمیہ اور بنی عباس کے ظلم و ستم سے عرب اور عراق عرب میں رہنا دشوار ہو گیا تھا اور اس لیے اکثر سادات کے خاندان وطن مالوف چھوڑ کر دور دراز ملکوں میں جا رہے تھے اُسی پر آشوب زمانے میں کسی وقت سرسید کے اجداد بھی دامغان میں جو ایران کا قدیم مشہور شہر ہے، چلے آئے تھے اور آخر کار ہرات میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی غالباً اُن کے بزرگ ہندوستان میں پہلے ہی پہل شاہجہان کے عہد میں آئے ہیں اور اُس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک اُن کو اس سلسلۂ علیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا ہے۔

سید محمد دوست جو کہ سرسید پانچ پشت اوپر ہیں، دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے۔ وہ مع اپنی جمعیت کے ایک مورچہ پر متعین تھے جب اس مورچہ کو انھوں نے تنہا بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کر لیا تو عالمگیر نے اُن کو یکہ بہادر کا خطاب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن ہرات کو چلے گئے اور پھر ہندوستان میں واپس نہیں آئے، مگر اُنکے بیٹے سید برہان نے وہاں سے آکر دلی میں سکونت اختیار کی۔ سید برہان کے بیٹے سید عماد اور اُن کے دو بیٹے سید ہادی اور سید مہدی تھے۔ سید ہادی جو کہ سرسید کے دادا تھے اُن کو عزیز الدین عالمگیر ثانی کے سنہ ۲ جلوس مطابق ۱۱۶۸ھ ہجری میں خطاب جواد علی خاں اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار دو اسپہ و سہ اسپہ اور اُن کے بھائی سید مہدی کو بھی دہی منصب

اور قباد علی خاں کا خطاب ملا تھا۔ قباد علی خاں دکن چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ مگر جواد علی خاں بدستور دلی میں بادشاہ کے پاس رہے۔ جب عالمگیر ثانی کا زمانہ ختم ہوا اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے تو سرسید کے دادا کے خطاب میں جواد الدولہ اور اضافہ کیا گیا اور عہدۂ احتساب وکرور صوبۂ شاہجہان آباد اور ۱۵ سنہ جلوس شاہ عالم مطابق ۱۱۸۸ھ میں عہدۂ قضائے لشکر عنایت ہوا اور ۱۸ شعبان سنہ ہجری کو انھوں نے دنیا سے رحلت کی۔ سرسید کہتے تھے کہ "سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور اُن کا پورا دیوان اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہوگیا۔"

سید ہادی کے بیٹے یعنی سرسید کے والد میر متقی ایک آزاد طبیعت کے آدمی تھے، اگرچہ شاہ عالم کے زمانے میں اور اُنکے بعد اکبر شاہ کے زمانے میں جو درجہ دربار عام اور دربار خاص میں اُن کے والد کا تھا وہی درجہ میر متقی کا بھی رہا مگر چونکہ بادشاہت صرف برائے نام رہ گئی تھی اور اُس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ جن لوگوں کو خطاب اور منصب دے اُس کے لوازمات بھی دے سکے اس لیے جب سید ہادی کے بعد اُن کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اُس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا۔ مگر چونکہ اُن کو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اِس لیے شاہ عالم کے انتقال کے بعد اُن کا رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ مثمن برج سے پیوستہ جو مکان خوابگاہ کے نام سے مشہور تھا اور جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جاسکتا تھا، میر متقی برابر وہاں جاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اُس خاص دربار میں گیا ہوں۔"

میر متقی کے آبائی سلسلہ میں میر قطبی کے سوا، جو مجذوب ہوگئے تھے اور

جن کے لوگ بہت معتقد تھے، اور کوئی باقی نہیں رہا تھا اور اُن کی ننھیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ میر متقی کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب اُس کے گوشۂ جنوب مشرق کی طرف تھا جو کئی دفعہ نادر گردی اور مرہٹہ گردی میں لُٹ چکا تھا اور اُس کے اکثر حصے منہدم ہو گئے تھے۔ دالان اور کچھ مکان جو باقی رہ گئے تھے، اُن میں رہتے تھے اور دن کو جامع مسجد کے مشرقی دروازے پہ جو مکانات ہیں، اُن میں بیٹھتے تھے۔

اس زمانے میں شرفائے دہلی تیراکی اور تیر اندازی کو ایک جوہرِ شرافت جانتے تھے۔ میر متقی کو ان دونوں فنون میں کمال حاصل تھا۔ اکثر مرشد زادے اور شریف زادے ان دونوں فنوں میں اُن کے شاگرد تھے۔ خود سرسید نے بھی تیراکی اور تیر اندازی اُن سے سیکھی تھی۔ سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں جو قطع نظر تیر اندازی کے تیر اور کمانیں بنانے میں نہایت مشاق تھے، میر متقی ہی کے شاگرد تھے

میر متقی اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے جس کا اثر سرسید اور اُن کی اولاد میں اب تک موجود تھا۔ اُن کو حضرت شاہ غلام علیؒ سے جن کی خانقاہ دلّی میں مشہور ہے، بیعت تھی اور شاہ صاحب اُن پر پدرانہ شفقت رکھتے تھے، ہر روز بعد حلقہ کے ایک مرید جس کو حکم دے رکھا تھا، میر متقی کی زنانی ڈیوڑھی پر آتا اور سب چھوٹے بڑوں کی خیر و عافیت پوچھ کر شاہ صاحب سے جا کر عرض کر دیتا اور جب میر متقی یا اُن کے گھر میں کوئی اور بیمار ہو جاتا تو مرزا غفور بیگ صاحب تو رجوی کو جو شاہ صاحب کے خلیفہ اور مریدانِ خاص میں سے تھے اور خود مرزا مظہر جانِ جاناں سے اکتساب کر چکے تھے، سلبِ مرض کے لیے اُن کے مکان پر بھیجتے اور وہ ہمیشہ جب تک کہ بیمار کو صحت نہ ہوتی برابر آتے تھے۔

جو خاص عنایت شاہ صاحب کو میر متقی کے حال پر تھی اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب نے شدّتِ مرض میں مرزا صاحب کی قبر کے پاس اپنے لیے قبر کھدوانے کا حکم دیا تو میر متقی نے عرض کیا کہ میری آرزو یہ ہے کہ ٹھیک آپ کی پٹی میری قبر ہو۔ چنانچہ اُن کے لیے بھی سرداپہ تیار ہوا اور بعد انتقال کے، جو ۱۵ رجب ۱۲۵۴ھ ہجری میں واقع ہُوا، اُسی سرداپہ میں شاہ صاحب کی پائنتی مدفون ہوئے۔

میر متقی کے والد سیّد ہادی اور خواجہ فرید الدین احمد سے جن کا ذکر عنقریب آئے گا بہت رسم و راہ تھی، میر متقی بھی والد کے انتقال کے بعد خواجہ فرید سے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے اور خواجہ فرید بھی اُن کے حال پر بہت مہربانی کرتے تھے۔ جب وہ ایران اور آوا کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے اپنی بڑی بیٹی عزیز النسا بیگم کی شادی میر متقی سے کردی۔ اب میر متقی اپنے قدیم موروثی مکان سے اُٹھ کر مہدی قلی خاں والی حویلی میں جو خواجہ فرید نے خرید لی تھی آرہے۔

میر متقی نہایت وضعدار اور راست باز آدمی تھے۔ معین الدین اکبر شاہ کے ایک بھائی مرزا شمس الدین تھے جن کی طرف سے بادشاہ کے دل میں نہایت رنج اور کچھ توہمات متعلق بہ دعویٰ سلطنت تھے۔ اتفاق یہ کہ میر متقی کو مرزا شمس الدین سے بھی نہایت خلوص تھا اور وہ اُن کے ہاں برابر آتے جاتے تھے۔ مرزا شمس الدین بھی اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ اُن کو اپنی مسند کے برابر بٹھاتے تھے اور خاص اپنا جھنڈا پینے کو عنایت کرتے تھے۔ اکبر شاہ نے لوگوں کی دراندازی سے ایک بار اُن کو مرزا شمس الدین سے ملنے سے منع کیا۔ میر متقی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ کیا حضور کو فدوی کی جاں نثاری میں کچھ تردّد ہُوا ہے! بادشاہ نے

ہنسکر فرمایا نہیں نہیں۔ میر متقی نے عرض کیا تو پھر میں اپنے قدیم طریقہ کو چھوڑ کر مفت میں کیوں رو سیاہی لوں۔ بادشاہ نے پھر کبھی اُن سے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور وہ بدستور مرزا شمس الدین سے ملتے رہے۔

اکبر شاہ کے اخیر زمانے میں وزارت کے اختیارات مرزا سلیم کے ہاتھ میں جو بادشاہ کے چاہتے بیٹے تھے، چلے گئے تھے اور اس لیے راجہ سوہن لال جو مرزا سلیم کی سرکار میں دیوان تھے۔ وزارت کا کام کرنے لگے تھے چونکہ میر متقی کی راجہ سوہن لال سے موافقت نہ تھی اس لیے انھوں نے دربار کا جانا بہت کم کردیا تھا۔ اکثر ضروری موقعوں پر سرسید جایا کرتے تھے۔ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے اور تمام ستپا دربار کی بدل گئی تو میر متقی کا دربار میں جانا بالکل موقوف ہوگیا تھا۔ مگر جو تنخواہ قلعہ سے مقرر تھی وہ اور نوروز کو بادشاہ کی طرف سے سنہری روپہلی جھلّوں کے آنے کی رسم اور اسی قسم کی اور اعزازی رسمیں ان کی وفات تک بدستور جاری رہیں۔

# سرسیّد کی ننھیال

سرسید کی ننھیال کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ سیرت فریدیہ میں جو خود سرسید نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین احمد کے حالات میں لکھی ہے، مندرج ہے یہاں ہم اُس کا خلاصہ ایک یادداشت سے جو سرسید نے سیرت فریدیہ لکھنے سے پہلے لکھوائی تھی، اخذ کرکے لکھتے ہیں۔

سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں اوّل اُن کے دادا خواجہ عبدالعزیز بعنوان تجارت دلّی میں آئے تھے جو کشمیری شال کی تجارت کرتے تھے اور اُنھوں نے یہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اُن

کے بیٹے خواجہ اشرف تھے جن کے آٹھ بیٹے ہوئے ازاں جملہ دو شخصوں نے مختلف حیثیتوں سے بہت امتیاز حاصل کیا تھا اول خواجہ نجیب الدین جو نواح دہلی میں شاہ فدا حسین کے نام سے مشہور ہیں۔ سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ کے پیرووں کا پیدا ہوگیا تھا، شاہ فدا حسین اس فرقہ میں ابتدائی عمر سے داخل ہوگئے تھے اور رسول شاہ کے جانشین مولوی محمد حنیف کے چیلے بن گئے تھے۔ شاہ فدا حسین نے تمام درسی کتابیں اپنے مرشد مولوی محمد حنیف سے پڑھیں اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو مرشد کے حکم سے کتابیں کنویں میں ڈالدیں۔ وہ خاص کر حقائق و معارف میں بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ فصوص الحکم، فتوحات مکیہ اور دیگر تصنیفات شیخ اکبر اور دیگر قائلین وحدت وجود کی بہت خوبی سے پڑھاتے تھے۔ مگر وضع یہ تھی کہ چار ابرو کا صفایا کیے ایک غرقی باندھے اور سارے بدن پر بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ جب حجرہ سے باہر نکلتے تو تہمد گھٹنوں تک لپیٹ لیتے اور سر پر ایک مثلث رومال باندھ لیتے تھے ایک بار اکبر شاہ نے اُن کے پاس آنا چاہا مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "وہ نہایت خوش خلق اور خوش تقریر تھے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو جو اُن کی بھتیجی تھیں اپنے پاس بلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اُس کا لطف میرے دل سے نہیں بھولا۔ دلی میں اُن کے دیکھنے والے اب تک موجود ہیں۔ وہ آخر عمر میں الور چلے گئے تھے اور ۱۲۵۹ھ میں وہیں انتقال کیا اور وہیں رسول شاہیوں کے تکیہ میں جو جمیلی باغ کہلاتا ہے۔ ان کا ڈھیر ہے۔"

دوسرے سرسید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ جو اپنے خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال لائق دانشمند صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ انھوں نے لکھنؤ

جاکر علامہ تفضل حسین خاں سے جب کہ آصف الدولہ زندہ تھے ریاضی کی تحصیل کی تھی خواجہ فرید ریاضی میں مجسطی اور رسائل متوسطات جو اکر کے نام سے مشہور ہیں نہایت تحقیق سے پڑھاتے تھے اور زیچ اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ وہ خود آلات رصد کے بنانے اور رصد کرنے پر قادر تھے۔ بہت سے لوگوں نے اُن سے ریاضی کی تحصیل کی اور اُس میں کمال بہم پہنچایا اور نامور ہوئے۔ ازاں جملہ مولوی کرامت[1] علی مولوی رجب[2] علی خاں، خواجہ محمد ناصر[3] جان اور حکیم رستم علی خاں اُن کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ خود اُن کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں جو فنون ریاضی میں طو بدلی رکھتے تھے انھیں کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۲ء میں جب طالب علمی کے ارادے سے پہلی ہی بار میرا دلّی جانا ہوا اُس وقت زین العابدین خاں زندہ تھے۔ اور دلّی میں اُن کی ریاضی دانی اور فنون ریاضی میں سے خاص کر موسیقی کے علم و عمل کی بہت شہرت تھی۔

سرسید کہتے تھے کہ "خواجہ فرید کے تصنیف کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے علم ہیأت اور آلات رصد کے باب میں تھے جو ایام غدر میں ضائع ہو گئے مگر اُن میں سے تین رسالے خود انھیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی عنایت سے دستیاب ہوئے ہیں جن کو مدرسۃ العلوم کے کتب خانہ میں داخل کر دیا ہے۔" انھیں میں ایک

---

[1] یعنی مولوی کرامت علی خلف مولوی حیات علی جو دلّی کے مشہور عالم تھے اور اخیر کو حیدرآباد چلے گئے تھے۔ ۱۲

[2] یعنی ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی خاں جنھوں نے پنجاب گورنمنٹ میں نہایت رسوخ پایا تھا۔ ۱۲

[3] یہ حضرت خواجہ میر درد کے سجادہ نشین تھے ۱۲

رسالہ ہے فوائد الافکار فی عمال الفرجار۔ اس کے دیباچہ[1] میں انھوں نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ان کی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور ریاضی کے ساتھ جو اُن کو فطری مناسبت تھی اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

خواجہ فرید لکھنؤ کے پہلے سفر میں دو تین برس وہاں رہ کر ریاضی کی تکمیل کے بعد دلّی واپس چلے آئے تھے۔ یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں وہ پھر لکھنؤ گئے۔ اُن کے جانے کے بعد اُسی سال آصف الدولہ نے قضا کی اور سعادت علی خاں ان کے جانشین ہوئے۔ اسی زمانہ میں مدرسۂ کلکتہ کے لیے جس کو انگریزوں نے قائم کیا تھا، ایک سپرنٹنڈنٹ کی ضرورت ہوئی اور لکھنؤ کے یورپین عہدیداروں کی سفارش سے خواجہ فرید اس عہدہ پر بمشاہرۂ سات سو روپیہ ماہوار مقرر ہو کر کلکتہ چلے گئے۔

اس کے بعد مارکونس اوف ولزلی کو جو اُس زمانہ میں گورنر جنرل تھے ایک خاص مقصد کے لیے جس کی تفصیل سیرت فریدیہ میں درج ہے، ایران میں سفارت بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ ۱۸۰۳ء میں مسٹر لوٹ کا اور اُن کے ساتھ خواجہ فرید کا بھیجنا تجویز ہوا۔ مگر راہ میں مسٹر لوٹ بیمار ہو کر واپس چلے آئے اور گورنر جنرل کے حکم سے اکیلے خواجہ فرید بطور مستقل سفیر کے بوشہر ہوتے ہوئے طہران میں پہنچے اور فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں حاضر ہوئے اور مقاصد سفارت کو جن میں سب سے زیادہ

---

[1] سیرت فریدیہ جس میں سر سیّد نے اپنے نانا خواجہ فرید کا حال لکھا ہے اس میں یہ دیباچہ بھی نقل کیا ہے۔ چونکہ اس کا مضمون دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا خلاصہ اردو زبان میں اس مقام پر لکھ دیا جاتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کتب ریاضی کے کسی حاشیہ میں میری نظر سے گزرا تھا کہ آلات ریاضی میں سے ایک آلہ تھا جس کو پرکار متناسب کہتے تھے اُس سے اکثر اعمال نجومی اور بعض اشکال ہندسی اور مسائل حسابی آسانی سے حل ہو جاتے تھے مگر چونکہ اب وہ آلہ مفقود ہے اس لیے اُس کا علم اور عمل بھی باقی نہیں رہا۔

اہم یہ امر تھا کہ ایران کی طرف سے ہندوستان میں بجائے حاجی خلیل خاں مقتول کے دوسرا سفیر بھیجا جائے، سنجویل انجام دیا، اور محمد نبی خاں کا ایران کی طرف سے بطور سفیر کے ہندوستان میں بھیجا جانا تجویز ہوگیا۔

اس کے بعد گورنمنٹ انگریزی نے خواجہ فرید کو آوا واقع برہما میں ایک پولیٹکل معاملہ کے طے کرنے کو بطور ایجنٹ کے مقرر کر کے بھیجا۔ وہاں سے آنے کے بعد جب کہ ملک بندیلکھنڈ فتح ہو چکا تھا پرگنات اگاسی وغیرہ جو اب ضلع باندہ میں شامل ہیں، مالگذاری وصول کرنے کے لیے عہدۂ تحصیلداری پر مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں تحصیلداروں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ کل زر مالگذاری میں سے کچھ فیصدی حق التحصیل ملتا تھا۔ جب یہ انتظام نہ رہا اور زمانۂ حال کے موافق تحصیلدار مقرر ہونے لگے تو وہ اس عہدہ سے کنارہ کش ہوکر بارہ تیرہ برس بعد دلی میں واپس آئے مگر چند روز رہ کر پھر کلکتہ چلے گئے۔

$\frac{1231}{1815}$ ہجری میں اکبر شاہ ثانی نے اُن کو کلکتہ سے بلا کر خلعت وزارت اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا۔ انھوں نے ایام وزارت میں اس وجہ سے کہ بادشاہ بہت قرضدار ہو گئے تھے، قرضہ ادا کرنے اور آمدنی و خرچ برابر کرنے میں بہت کوشش کی۔ شاہزادوں اور بیگمات اور عملۂ شاہی کی تنخواہوں میں سے دس فیصدی تنخواہ کم کر دی۔ بڑا خاصہ[1] اور چھوٹا خاصہ جن میں زر کثیر صرف ہوتا تھا اور بعضے اور غیر ضروری کارخانے یک قلم موقوف کر دیئے۔ اس کے سوا

---

[1] بڑا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو تمام ملازموں، عہدیداروں، خواصوں اور باری داروں کو بادشاہ کی طرف سے ہر روز دونوں وقت دیا جاتا تھا۔ چھوٹا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو ہر روز تیار ہو کر محل میں بھیجا جاتا تھا اور درباری امیر یا حکیم جو اپنی باری یا کسی اور ضرورت سے قلعہ میں رہ جاتے تھے ان کو محل سے بھیجا جاتا تھا ۱۲

دیوانِ عام کی تانبے کی چھت جو شاہ عالم کے عہد میں بھاؤ مرہٹے نے سنہری ملمع کے
سبب خالص سونے کی سمجھ کر اکھڑوا ڈالی تھی اور وہ اُس وقت سے اکھڑی پڑی تھی
اس کا سونا الگ اور تانبا الگ کر کے جتنا تانبا نکلا اُس کے شاہی ٹکسال میں پیسے
بنوا ڈالے اور سونا فروخت کر دیا۔ ان تدبیروں سے کئی لاکھ روپیہ کا قرضہ ادا کیا گیا۔
اب آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا اور سب کی تنخواہیں جو کئی کئی مہینے بعد ملتی تھیں ماہ بماہ
ملنے لگیں۔ لیکن قلعہ میں اُس سے عام ناراضی پھیل گئی اور آخر کار اُن کو عہدۂ وزارت
سے کنارہ کش ہونا پڑا اور وہ پھر کلکتہ چلے گئے۔

ایک بار پھر خواجہ فرید کو بادشاہ نے کلکتہ سے بلا کر عہدۂ وزارت پر مامور
کیا مگر اس دفعہ بھی چند وجوہات سے تین یا ساڑھے تین برس وزارت کا کام انجام
دے کر بہ اصلاح جرنیل اخترلونی کے جو دلّی میں ریذیڈنٹ تھے آخر کار استعفا
دیدیا۔ دوسری بار وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے
معقول سفر خرچ اور اپنا معتمد بھیج کر خواجہ فرید کو لاہور بلایا۔ مگر جیسا کہ آگے ذکر
کیا جائے گا وہ اپنی بڑی بیٹی یعنی سرسید کی والدہ کے سمجھانے سے لاہور نہیں
گئے اور سفر خرچ واپس کر دیا اور پھر اخیر وقت تک باوجودیکہ قلعہ کی طرف سے
ایک دفعہ پھر بلاوا ہوا اُنھوں نے کوئی تعلق اختیار نہیں کیا اور ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں انتقال
کیا۔ ان کی تاریخ وفات اس جملہ سے کہ "جا بہ بہشت یافتم" بے کم و کاست
نکلتی ہے۔

دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد ایک حکیم مشرب یا صوفی منش آدمی تھے۔
ایک زمانے میں وہ بھی اپنے بھائی شاہ فدا حسین کی طرح رسول شاہیوں میں
داخل ہو گئے تھے اور مُکّا شاہ جو رسول شاہ کے ایک ممتاز چیلے تھے، اُن کے
مرید ہو گئے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں یہ ضرور نہیں ہے۔ کہ خواہ مخواہ چار ابرو

کا صفایا کریں بلکہ دنیا دار اور متاہل لوگ بھی اس طریقہ میں داخل ہوتے ہیں اسلیئے دبیرالدولہ نے مرنے سے دو برس پہلے تک کبھی ڈاڑھی مونچھ نہیں منڈوائی مگر مرنے سے دو برس پہلے اُن کو یہ خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیروی کرنی بھی چاہیے۔ آخر ایک دن چار ابرو کا صفایا کرا دیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا ہوا اور لوگوں نے بہت کچھ طعن و تعریض کی مگر انھوں نے اُس کی کچھ پروا نہیں کی لیکن ایک دفعہ کے سوا پھر کبھی ایسا نہیں کیا۔ سرسیّد کہتے تھے کہ "جب انتقال ہوا تو اُن کی ڈاڑھی کسی قدر بڑی ہو گئی تھی"۔

دبیرالدولہ کے دو بیٹے تھے جو سرسیّد کے ماموں ہوتے تھے۔ بڑے کا نام وحیدالدین خاں جو مرزا جہانگیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے۔ بہ بعد فتح دہلی کے فوج کے کسی سپاہی کی گولی سے نماز پڑھتے ہوئے مارے گئے۔ دوسرے نواب زین العابدین خاں جن کو اُن کے والد کی وفات کے بعد دبیرالدولہ کا خطاب بادشاہ نے دیا تھا۔ ان کو قدیم ریاضی میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی یہ تمام آلات رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ اُنھوں نے ایک بہت بڑے قطر کا برنجی کرہ اور برنجی اصطرلاب نہایت عمدہ بنایا تھا نیز بہت سے آلات جن کی تفصیل، سیرت فریدیہ میں مندرج ہے اُن کے ہاتھ کے بنے ہوئے موجود تھے۔ اُن میں ایجاد و اختراع کا بڑا ملکہ تھا۔ اُنھوں نے پتنگ بنانے کے اصول وضع کیے تھے، اس باب میں ایک رسالہ لکھا تھا جو غدر میں ضائع ہو گیا۔

سرسیّد کی والدہ کا حال جو سیرت فریدیہ میں لکھا ہے یا ہم نے دلّی میں سرسید کے رشتہ داروں سے اور خود سرسید سے سُنا ہے۔ چونکہ اُس کو سرسید کی تربیت اور اُن کے اخلاق و عادات بلکہ اُن کے تمام واقعاتِ زندگی میں بہت بڑا دخل ہے، اِس لیے ہم اس کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سرسیّد کے والد

میر متقی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ایک نہایت آزاد منش آدمی تھے۔ خصوصاً جب سے شاہ غلام علی صاحب کے مرید ہو گئے تھے اُن کی طبیعت میں اور بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا۔ سرسید سے ایک دفعہ اُن کے بچپن کے حالات پوچھے گئے تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ میری تمام سرگذشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے۔

؎ طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است
چوں بپائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم

سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اُن میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی، وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھی اور ابتدا میں کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر اولاد کی تربیت کا اُن میں خداداد ملکہ تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب میں اُن کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ اُن کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں باندھ رکھی تھیں اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر اُن سوت کی لڑوں سے کبھی مجھے مارا نہیں۔

سرسید لکھتے ہیں کہ "جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو بھی خبر ہو گئی تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو اُنھوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لاکر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی انھوں نے کہا "دیکھو آپا جی تم سے بہت

ناراض ہیں، میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔" میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرائیں۔ انھوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہُوا۔"

سر سید کی والدہ کی دانشمندی اور دور اندیشی ذیل کی حکایت سے بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ سر سید کہتے تھے کہ "جب دبیر الدولہ نے وزارت سے دوسری بار استعفا دیدیا تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا معتمد اور ایک معقول رقم سفر خرچ کے لیے اُن کے پاس بھیجی اور لاہور بُلایا۔ سالا کنیا چاہتا تھا کہ وہ منظور کرلیں مگر اُن کی بڑی بیٹی یعنی میری والدہ نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح چاہیں آپ آرام سے بسر کر سکتے ہیں اور اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی آپ کے آرام و آسائش میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ آپ کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں جانا اور اُس سلطنت کے اختیارات لینے اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا میں تو ہرگز صلاح نہیں دیتی کہ اس ضعیفی کے زمانے میں کہ آپ کی طبیعت بھی اکثر علیل رہتی ہے۔ آپ لاہور کا ارادہ کریں۔"
دبیر الدولہ کے دل پر اُن کے کہنے کا ایسا اثر ہُوا کہ لاہور جانے سے انکار اور سفر خرچ واپس کر دیا اور پھر کبھی کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔

سر سید کا بیان ہے کہ "میرے بڑے بھائی کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھیں، ایک مہینے تک یہی حال رہا۔ جب اُنکا انتقال ہو گیا سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔ اُنھوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق

تک مصلّے ہی پر بیٹھی رہیں. انھیں دنوں میں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی
تھی. تمام سامان شادی کا ہوچکا تھا. صرف چار دن تاریخ عقد میں باقی رہے تھے.
جب یہ حادثہ ہم پر گذرا تو اُن لوگوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرنی چاہی،
میری والدہ نے جب یہ سُنا تو اس واقعہ کے تیسرے دن اُن کے گھر گئیں اور کہا میں
شادی میں آئی ہوں. ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور شادی کے ملتوی کرنے سے
تمھارا بڑا نقصان ہوگا جو خدا کو منظور تھا وہ ہوچکا تم شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو جب
کہ میں خود تمھارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ
سکتا ہے."

سرسید کہتے تھے کہ "جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس میں سے پانچ فیصدی کے
حساب سے میری والدہ ہمیشہ الگ رکھتی تھیں اور اس سرمایہ کو حسن انتظام کے ساتھ
نیک کاموں میں صرف کرتی تھیں. کئی جوان لڑکیوں کا اُن کی امداد سے نکاح ہوا. اکثر
پردہ نشین عورتیں جو معاش سے تنگ ہوتیں اُن کی پوشیدہ خبر گیری کرتیں. غریب
خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتیں اُن کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں
اور دوسرے نکاح کو بُرا سمجھنے والوں سے نفرت کرتیں غریب رشتہ داروں کے
گھر جاتیں اور خفیہ یا کسی حیلہ سے اُن کی امداد کرتیں. بعض رشتہ دار مردوں نے
ایسی عورتوں سے نکاح کر لیا تھا جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر وہ اُن کے
گھر برابر جاتیں اور اُن کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں."

سرسید کہتے تھے کہ "میری تمام ننھیال کو شاہ عبدالعزیز اور اُن کے خاندان
سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت
تھی. شاہ صاحب کے ہاں سنت اور نذر و نیاز کا کہیں پتہ نہ تھا. اُن کی عادت
تھی کہ جب کوئی اپنی حاجت لیجاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دعا کرو خدا

اس کی حاجت پوری کرے، یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا۔ اُنھوں نے خود کوئی منت یا نذر و نیاز کبھی نہیں مانی۔ تعویذ یا گنڈے پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر اُن کو مطلق اعتقاد نہ تھا۔ لیکن اگر کوئی کرتا تو اُس کو منع بھی نہ کرتیں اور یہ کہتیں کہ اگر ان کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جس کے خوف سے وہ ایسا کرتے ہیں تو اُن کو یقین ہو جائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا اگر ایسا کیا جاتا تو نہ ہوتا۔ سرسید کا بیان ہے کہ "میری ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے مگر شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر سب اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور اُن کے ہاں کے اور بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جب بچہ کو دیا جاتا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی سید حامد اور سید محمود کو بھی اُن کی ننھیال والوں نے وہ گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ اِن کے ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں" سرسید کہتے تھے کہ "اس زمانہ میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں۔ اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا البتہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ قرآن پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دلا کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردہ کو پہنچتا ہے مگر میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا مطلق قائل نہیں اور عبادت مالی میں بھی سوا اس کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لیے کسی کے سپرد کر جائے اور کسی صورت میں نیابت کا قائل نہیں ہوں۔"

سرسید کا بیان ہے کہ "جب میں دلّی میں منصف تھا تو میری والدہ کی یہ

نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضروری ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں، کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ، پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جاتا تھا۔"

سرسید کی والدہ جیسی سمجھ دار اور دانشمند تھیں اس سے زیادہ نیک دل اور پاک سرشت تھیں۔ سرسید کا بیان ہے کہ "مسماۃ زرین ایک لاوارث بڑھیا تھی میری والدہ اس کی خبرگیری کرتی تھیں۔ جب میں دلّی میں منصف تھا اتفاق سے میری والدہ اور زرین دونوں ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کی بیماری بھی ایک ہی سی تھی حکیم نے والدہ کے لیے کسی قدر افاقہ کے بعد ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا، تجویز کیا۔ مگر جس قدر تیار ہوا تھا وہ مقدار میں ایک ہی بیمار کی چند روزہ خوراک تھی۔ میں اس معجون کو تیار کرا کے والدہ کے پاس لے گیا اور ان سے کہہ دیا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے۔ انھوں نے لے لی۔ مگر اس خیال سے کہ یہ زرین کو بھی مفید ہوگی۔ لیکن اس کو کون بنوا کے دے گا، انھوں نے خود اس معجون کو نہیں کھایا اور برابر زرین کو کھلاتی رہیں۔ زرین کو اس سے بہت فائدہ ہوا، مگر والدہ بھی بغیر اس معجون کے استعمال کے اچھی ہوگئیں۔ چند روز بعد میں نے کہا کہ معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا۔ وہ ہنسیں اور کہا کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا! آخر معلوم ہوا کہ وہ ساری معجون زرین ہی نے کھائی مگر خدا نے دونوں کو صحت عنایت کی۔"

سرسید کہتے تھے کہ "میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف خاں میں بہت دوستی تھی۔ ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہتے تھے۔ میں بھی حکیم صاحب کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ مگر بھائی کے انتقال کے بعد ایک دفعہ حکیم صاحب

کچھ مجھ سے ناراض ہو گئے اور ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا مگر میں بدستور اُن کے ہاں جاتا رہا اور مدت تک میں نے کچھ خیال نہ کیا۔ لیکن آخر کو میں نے بھی اُن کے ہاں جانا بہت کم دیا۔ جب والدہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا اور مجھ سے کہا کہ جس بات کو تم خود اچھا نہیں سمجھتے وہی بات آپ کرتے ہو۔ اگر وہ نہیں ملتے تو نہ ملیں مگر تم بدستور ملتے رہو۔"

سرسید نے ایک شخص کا ہم سے ذکر کیا کہ "جب میں صدرامین تھا تو اُس کے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور اُس کو ایک سخت مواخذہ سے بچایا تھا مگر ایک ایک مدت کے بعد اُس نے درپردہ میرے ساتھ بُرائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی گمنام عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا۔ آخر تمام وجہ ثبوت جس سے اُسکو کافی سزا مل سکتی تھی، میرے ہاتھ آگئی اور اتفاق سے اُس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اُس کے پھانسنے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہُوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگزر کرو۔ اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اُس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی پوری سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلانا بڑی نادانی کی بات ہے۔" اُن کے اِس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اُس دن سے آج تک مجھ کو کبھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور اُمید ہے کہ کبھی نہ آئے گا۔ بلکہ انھیں کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اُس سے میرا بدلا لے۔"

سرسید کی بہن صفیۃ النساء بیگم بھی جن کا انتقال دسمبر ۱۸۹۲ء میں جب کہ سرسید محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے دلّی میں موجود تھے کچھ کم نوّے برس کی عمر میں ہوا۔ عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں۔ اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث

کی عربی کتابیں بھی مع ترجمہ کے پڑھی تھیں اور اُن کے گھر میں کنبے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور اُن سے پڑھتی تھیں۔

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے صرف معمولی تعلیم پائی تھی مگر بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ اُن کو بھی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھی مگر وضع اُس کے خلاف تھی۔ اکثر اُن کے والد کے ملنے والے اُن سے کہتے کہ بیٹے کو سمجھاؤ کہ اپنی وضع درست کرے اور ڈاڑھی نہ منڈایا کرے۔ وہ یہ جواب دیتے کہ عمر کا تقاضا ہے جو اس کا دل چاہے کر لینے دو کبھی نہ کبھی خود درست ہو جائیگا آخر ایک مدت کے بعد اُن کا طریقہ خود بخود بدل گیا۔ ڈاڑھی رکھ لی اور نماز کے سخت پابند ہو گئے۔ یہانتک کہ تہجد اور اشراق کی نماز بھی ترک نہ ہوتی تھی اور قرآن مجید کی تلاوت بہت کرنے لگے۔

وہ ہنگام ضلع فتحپور میں منصف تھے۔ ۱۸۴۵ء میں سرسید فتحپور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے اور سید محمد خاں تہنگام سے دسہرہ کی تعطیل میں دلی آئے وہاں اُس وقت بخار کی فصل تھی۔ سید محمد خاں کو بخار آنے لگا تعطیل کے بعد جب سرسید جانے لگے تو رخصت کے وقت اُن کے بھائی نے ایسے کلمات کہے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو اپنے زندہ رہنے کی اُمید نہیں ہے۔ اس کے بعد فی الواقع اُن کا مرض بڑھنے لگا۔ وہ اسی حالت میں خواجہ باقی باللہ گئے اور وہاں اپنی قبر کے لیے خود جگہ تجویز کی۔ ہر چند لوگ کہتے تھے کہ ایسی بیماری نہیں ہے تم کیوں ان خیال میں پڑے ہو۔ مگر اُن کو مرنے کا یقین ہو گیا تھا۔ جب قبر تیار ہو گئی تو سوار ہو کر وہاں پہنچے اور قبر میں اُتر کر لیٹے اور قبر کو پسند کیا۔ وہاں سے آکر دوسرے دن کفن کے لیے کپڑا منگوایا اور اُس کو سلوا کر پہنا اور بہت پسند کیا۔ اب مرض اور بھی زیادہ ہو گیا۔ ایک دن شاہ احمد سعید صاحب کہ جو اُس وقت خانقاہ میں سجادہ

نشین مجھے بُلایا اور اُن کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور تیسرے دن انتقال کیا۔ مفتی صدرالدین خاں نے جو سرسید کو اُن کی تعزیت کا خط بھیجا تھا تو اس میں یہ شعر لکھا تھا۔ ؎

"قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند"

سرسید کے خاندان کا حال جس قدر کہ ہم نے لکھا ہے شاید ناظرین کتاب اس کو قدر ضرورت سے زیادہ خیال کریں، لیکن بائیوگرافی کا اصل مقصد جو ہیرو کے اخلاق و عادات و خیالات کا دنیا پر روشن کرنا ہے۔ وہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ ہیرو میں یہ اخلاق و عادات و خیالات کہاں سے آئے، اور اُن کی بنیاد اُس میں کیونکر پڑی؛ انسان میں کچھ خصلتیں جبلی ہوتی ہیں جو آباواجداد سے بطور میراث کے اُس کو پہنچتی ہیں اور زیادہ تر وہ اخلاق و عادات ہوتے ہیں جو بچپن میں نامعلوم طور پر وہ اپنے خاندان کی سوسائٹی سے اکتساب کرتا ہے اور جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ جاتے ہیں جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے لیکن آدمی اپنی جبلت سے نہیں ٹل سکتا۔ پس ہیرو کے خاندان کا حال جس میں وہ پیدا ہوا اور اُس سوسائٹی کا حال جس میں اُس نے نشوونما پائی درحقیقت ہیرو کے اخلاق و عادات پر ایک ایسی روشنی ڈالتا ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کے پیش کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

## سرسیّد کا بچپن

سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے اُن کی بہن صفیۃ النساء بیگم اور اُن کے بھائی

سید محمد خاں پیدا ہو چکے تھے۔ سید محمد خاں کی ولادت کے بعد چھ برس تک اُن کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے سید احمد خاں کے پیدا ہونے کی اُن کو نہایت خوشی ہوئی۔ سرسید سے چند مہینے پہلے اُن کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام حاتم علی خاں تھا سرسید کو اول حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا اور پھر خود سرسید کی والدہ نے۔ وہ اپنے خاندان کے اکثر بچوں کی نسبت زیادہ قوی اور توانا اور ہاتھ پاؤں سے تندرست پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی ماں کی زبانی بیان کرتے تھے کہ جب اُن کے نانا دوسری بار کلکتہ سے دلی میں آئے اور اُن کو پہلے ہی بار دیکھا تو یہ کہا کہ " یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے۔

سرسیّد کے بیان سے مفہوم ہوتا تھا کہ اُن کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت جس سے اُن کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف فوقیت دی جا سکے، نہیں پائی جاتی تھی۔ یعنی جیسے کہ بعضے بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طباع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں، سرسید میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اسی لیے اُن کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا لیکن جس قدر آگے بڑھتے جایئے اُسی قدر اُس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہیرو کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کر دیتی ہے۔ اسی لیے بعض حکما کی یہ رائے ہے کہ محنت سے آدمی جو چاہے سو ہو سکتا ہے۔

الغرض جب سرسید پیدا ہوئے تو اُن کے والد نے شاہ غلام علی صاحب

سے نام رکھنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا
تھا اُن کا نام احمد رکھا۔ سرسیّد کے دادا اُن کے والد کی شادی ہونے سے پہلے
قضا کر چکے تھے اور یہ اور ان کے بہن بھائی شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت
کہا کرتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی
ہی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے
تاہّل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالےٰ نے مجھے اولاد
کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن متنفی کی اولاد کی محبت ایسی دیدی ہے کہ اس
کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔

سرسید کو مسماۃ مان بی بی نے جو ایک قدیم خیرخواہ خادمہ اُن کے گھرانے
کی تھی پالا تھا۔ اس لیے اُن کو مان بی بی سے نہایت محبت تھی۔ وہ پانچ برس
کے تھے جب مان بی بی کا انتقال ہوا۔ اُن کا بیان ہے کہ "مجھے خوب یاد ہے
مان بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ
مر گئی تو مجھے اُس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ
وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے نوکر چاکر
اُس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بہت آرام سے گذرتی ہے۔ تم کچھ رنج مت
کرو۔ مجھ کو اُن کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک
ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین
تھا کہ یہ سب کھانا مان بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے وقت کہا
تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے۔ مگر میری والدہ اُس کو خیرات میں دینا چاہتی
تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر کہو تو یہ گہنا مان بی بی کے
پاس بھیج دوں۔ میں نے کہا ہاں بھیجدو۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف

طرح سے خیرات میں دیدیا۔"

بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ اُن کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود اُن کے ماموں اُن کی خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے اُن کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لیے کافی تھے اس لیے اُن کو نوکروں اور اجلافوں کے بچّوں اور اشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے جُلنے اور اُن کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ان کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمہارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ اس لیے سب لڑکے جو کھیل کھیلتے تھے اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے۔ اُن کے کھیلوں میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کر سکیں۔ خواجہ فرید کی حویلی جس میں وہ اور اُن کے ہم عمر لڑکے رہتے تھے اُس کا چوک اور اُس کی چھتیں ہر قسم کی بھاگ دوڑ کے کھیلوں کے لیے کافی تھیں ابتدا میں وہ اکثر گیند بلا، کبڈی، گیڑیاں، آنکھ مچول، چیل چلو وغیرہ کھیلتے تھے۔ اگرچہ گیڑیاں کھیلنے کو اشراف معیوب جانتے تھے۔ مگر اُن کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیڑیاں بھی کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

سرسید کہتے تھے کہ "کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آکر تصفیہ کر دیتا اور جس کی طرف سے چیند معلوم ہوتی اُس کو بُرا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا کہ چیند کرنا بے ایمانی کی بات ہے، کبھی چیند مت کرو اور جو چیند کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔"

ان کا بیان تھا کہ " باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر

جانے کی اجازت نہ تھی جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جُدا حویلی بنائی اور وہاں آ رہیں تو باوجودیکہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی جب کبھی میں ان کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اسی لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہُوا۔"

سرسید اپنے کھیل کود کے زمانے میں بہت مستعد اور چالاک اور کسی قدر شوخ بھی تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر شوخی کیا کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ "ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جو استنجا کر رہا تھا چپکے چپکے اس کے پیچھے جاکر جپت کر دیا۔ اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ پتھر لیکر مجھے مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر میں بچ بچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔ اسی طرح ایک بار میں شطرنج کھیلنے میں ایک اپنے رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا میرے مُکّے سے اُس کے ہاتھ کی اُنگلی اتر گئی، اور کئی دن بعد اچھی ہوئی ہمیشہ یوں ہی لڑائی بھڑائی مارکٹائی ہوتی تھی مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔"

سرسید لکھتے ہیں کہ "میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانے میں کھاتے تھے۔ ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں۔ پوتے پوتیاں۔ نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لیکر اپنے ہاتھ سے اُس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے۔ ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالا چبانے کی آواز مُنہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوانخانے میں کھاتے

تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا۔ میری والدہ اور میری چھوٹی خالا کھانا کھلانے آتی تھیں۔
ہم سب لڑکے اُن کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ کسی کے
پانو کا دھبّا سفید چاندنی پہ لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی
وغیرہ کا دھبّا کسی کے کپڑے پہ ہوتا تھا اُس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام
کو چراغ جلنے کے بعد اُن کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں
سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سنانے جاتے تھے۔ جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اُس
کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور
گھرک دیتے۔"

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلّی کے اکثر باشندے سہ پہر کو
جمنا پر جاکر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں۔ مگر پچاس برس
پہلے وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے۔ سرسیّد
کہتے تھے کہ "میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔
ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلّی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا
تھا۔ جن میں مرزا مغل اور مرزا طغل بہت سر برآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف
ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا
میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی باﺅلی تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا
تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اُس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی
والد کے ساتھ ہوتے تھے انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے
بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینۃ المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے
جمنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک
زینۃ المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے

اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔ تیر اندازی کی صحبتیں بھی سرسید
کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ "مجھے
اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیر اندازی
ہوتی تھی، یاد نہیں، مگر جب دوبارہ تیر اندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اُس زمانے
میں دریا کا جانا موقوف ہوگیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیر اندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب
فتح اللہ بیگ خاں، نواب سید عظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے
اور رئیس اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس
فیروز پور جھرکہ جب دلّی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اس زمانے
میں تیر اندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہوگئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ
میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جاکر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے
اور کہا "مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے" یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہوگیا۔"

اہل اللہ اور مقدس لوگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے سرسید کے دل میں بٹھایا
گیا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں جاتے
تھے اور شاہ صاحب سے اُن کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ وہ
کہتے تھے کہ "مرزا صاحب کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ اُن کے مزار
پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپیہ کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ
تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت
لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہوگئی۔ جب
شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت!
میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے
ہیں! شاہ صاحب نے فرمایا نہیں نہیں تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ بس اس

وقت صغیر سن تھا جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اٹھالو، میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھا لیا۔

دلّی سے سات کوس مغلپور ایک جاٹوں کا گانو ہے۔ وہاں سر سید کے والد کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر اُن کے والد مغلپور جاتے تو اُن کو بھی اکثر اپنے ساتھ لیجاتے اور ایک ایک ہفتہ گانو میں رہتے۔ سر سیّد کہتے تھے کہ "اُس عمر میں گانو میں جا کر رہنا، جنگل میں پھرنا، عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ گھی اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکّی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت ہی مزہ دیتا تھا۔"

سر سیّد کے والد کو اکبر شاہ کے زمانے میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا مگر اخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سر سید کو باوجودیکہ اُن کی عمر کم تھی، دلوانا شروع کر دیا تھا۔

سر سیّد کہتے تھے کہ "ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اُٹھ کر قلعہ چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہو گئی۔ جب لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اوّل دربار میں جا کر آداب بجا لانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہنکر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا جب خلعت پہنکر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا اور بادشاہ تخت پر سے اٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اُس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے، پوچھا کہ "تمھارا بیٹا ہے"! انھوں نے کہا "حضور کا خانہ زاد" بادشاہ چپکے ہو رہے لوگوں نے جانا کہ بس اب محل

میں چلے جائیں گے۔ مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے۔ تسبیح خانہ میں بھی ایک چبوترا بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اُس چبوترے پر بیٹھ گئے اور جواہر خانے کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم ہُوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بُلایا اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟ حاضرین نے کہا۔ عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مُسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دیئے لوگوں نے کہا آداب بجا لاؤ۔ میں آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں۔ میں نے نذر دی اور بادشاہ اُٹھ کر خاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔ سرسیّد کہتے تھے کہ " اس زمانہ میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی۔ تقریباً انھیں دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برھمو سماج کے بانی تھے۔ اُن کو اکبر شاہ نے کلکتہ سے بلایا تھا تاکہ اضافۂ پنشن بادشاہی کے لیے اُن کو لندن بھیجا جائے چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے " سرسیّد نے لندن جانے سے پہلے اُن کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا تھا۔

# سرسیّد کی تعلیم

سرسیّد کہتے تھے کہ " مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکّا بکّا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے

فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور بسم اللہ پڑھ کر اقرأ کی اول کی آیتیں ما لم یعلم تک پڑھیں میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا" سر سید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کبھی کہا تھا پڑھا۔

ے " بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
ز فیض نقشبند وقت و جان جان جانانی "

سر سید کہتے تھے کہ " شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے اِلّا ماشاء اللہ۔ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے "۔

بسم اللہ ہونے کے بعد سر سید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ اُن کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی، سر سید نے استانی ہی سے جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشین بی بی تھی، سارا قرآن ناظرہ پڑھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "میرا قرآن ختم ہونے پر مدیہ کی مجلس جو زنانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی " قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمید الدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی اُن کے نانا کے ہاں نوکر تھے۔ جنھوں نے اُن کے ماموؤں کو پڑھایا تھا۔ اُن سے معمولی کتابیں کریما خالق باری آمدنامہ وغیرہ پڑھیں، جب مولوی حمید الدین کا انتقال ہوگیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے۔ انھوں نے فارسی میں گلستان، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی، عربی میں شرح مُلّا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطول مَا اَنَا قُلتُ

تک پڑھی مگر طالبعلموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔ اس کے بعد اُن کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں اُن کی ننھیال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے ہیأت میں شرح چغمنی تک اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا جو مجسطی سے پہلے پڑھائے جاتے ہیں، پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجسطی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی کیونکہ آلات رصد کا زیادہ شوق ہوگیا تھا۔ چنانچہ آلات رصد برجندی اور چند رسالے مثل اعمال کرہ، اعمال اصطرلاب، رسالہ صنعت اصطرلاب، ربع مجیب، ربع مقنطر، ہلزدن، جیب الساعۃ، پرکار تقسیم، پرکار متناسبہ اپنے ماموں سے پڑھے۔ اُسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہوگیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے، طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک اُن کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب اُنھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اُس وقت اُن کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اِس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا اور دلی میں جو اہلِ علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب اور آزردہ وغیرہ اُن سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ ۱۸۴۶ء میں جب کہ وہ فتح پور سیکری سے بدل کر دلی کی منصفی پر آئے اُس وقت جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا، انھوں نے کسی قدر تحصیل علم میں ترقی کی۔

# عنفوان شباب

سرسید کا عنفوان شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گذرا تھا وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے جلسوں اور تماشوں میں جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلّی میں بسنت کے میلے جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے وہاں جاتے تھے۔ خود اُن کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر چونسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلا ہوتا تھا اس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے۔

اُس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلّی میں تھے۔ اُن کے گھر پہ بسنت کا جلسہ ہوتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں موجود ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائف زرد لباس پہنکر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اُس حوض میں زرد ہی پانی کے فوارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا اُس میں جھڑاں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے اور طوائف باری باری بیٹھ کر گاتی تھیں۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اُس جلسے میں شریک ہوتا تھا"۔

خود سرسید کے ماموں نواب زین العابدین کے مکان پہ بڑے بڑے نامی گویئے دھرپت اور خیال گانے والے جمع ہوتے تھے۔ میر ناصر احمد جو دلّی میں مشہور بین بجانے والے تھے وہ آتے تھے۔ گانا ہوتا تھا اور بین بجتی تھی اسی طرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک

درویشانہ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اُس میں بھی بڑے بڑے نامی گویئے آتے تھے۔ دھرپت اور خیال گاتے تھے۔ اور میر ناصر احمد جو اسی خاندان میں بیعت تھے بین بجانے میں اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ان سب جلسوں میں سرسید اکثر شریک ہوتے تھے۔

ایک اور جلسہ رائے پران کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک معزز رئیس اور نہایت وضعدار تھے جتا نامی ایک طوائف نہایت خوش آواز دھرپت اور خیال گانے اور بین بجانے میں مشہور تھی۔ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر رائے پران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی، اُس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس جن سے اُن کی دوستی تھی، بلائے جاتے تھے، بڑے بڑے گویئے، بہادر خاں ستارن اور میر ناصر احمد سب جمع ہوتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "میرے ماموں نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے۔ میں بھی بارہا اُن کے ہمراہ گیا ہوں"

جب وہ نوکر ہو کر آگرہ گئے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ صدر دیوانی عدالت آگرہ میں موجود ہے اور وہاں منشی امیر علی خاں، مولوی غلام امام شہید، مولوی غلام جیلانی مولوی محمد شفیع اور اور بہت سے اشراف خاندانوں کے نامی وکیلوں اور عہدہ داروں کا مجمع ہے۔ یہ سب لوگ نہایت زندہ دل مرنج و مرنجان اور زندگی بے فکری و فارغ البالی کے ساتھ ہنسی اور خوشی میں گذارنے والے تھے: تاج گنج، اعتماد الدولہ اور نور افشاں میں وہ آئے دن عیش و نشاط کے جلسے کرتے تھے۔ سرسید نے بھی ان جلسوں کی کیفیتیں دیکھی تھیں اور اُن میں شریک ہوئے تھے۔

سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے جوانی میں اُس سے بھی زیادہ

ظرافت اور حاضر جوابی اُن کی طبیعت میں تھی۔ دلّی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامی نہایت حسین تھی مگر سنا ہے کہ اُس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لیے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے اور وہیں اُن کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اُس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش لبسیار تلخ ست" سرسید نے یہ مصرع پڑھا، "گرچہ تلخ ست ولیکن برشیریں وارد"

سرسیّد کا مذکورۂ بالا جلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اگرچہ اُس وقت تک دلّی کے مسلمانوں میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیاں باقی تھیں لیکن چونکہ اُن کے اقبال کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لیے اُن کی سوسائٹی میں اُن خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھی جن کو تنزل اور ادبار کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔ طبیعتیں عموماً عیش و نشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں بے فکر امیر زادے عیاشی اور لہو ولعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے تھے اور خربوزوں کو دیکھ کر خربوزے رنگ پکڑتے جاتے تھے۔ اگرچہ سرسیّد ستّرہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہو گئے تھے پھر بھی وہ اس متعدی مرض کے اثر سے اپنے تئیں نہ بچا سکے۔ لیکن جیسا کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے، باوجود غایت دلبستگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھی سرسیّد نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ گویا یہ شعر اُس وقت اُن کے حسب حال تھا۔

ع ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

مولانا جلال الدین رومی کے سامنے ایک زاہد کی اس طرح تعریف کی گئی کہ اُس نے تمام عمر میں کسی بُرے کام کا ارتکاب نہیں کیا۔ مولانا نے یہ سنکر فرمایا "کاش کردے وگزشتے" یعنی بہ نسبت اس کے کہ آدمی عمر بھر کوئی بُرا کام نہ کرے اور ایک حالت پہ ٹھیرا رہے۔ یہ بہت بہتر ہے کہ وہ بُرے کام کا ارتکاب کرکے حالت موجودہ سے ترقی کر جائے۔ مولانا کا یہ ارشاد جیسا سرسید کے حال پر منطبق ہوتا ہے اُس سے بہتر شاید ہی کوئی اُس کا مصداق ہو سکے۔

منجملہ دیگر اسباب کے جو اس تبدیلی حالت کے باعث ہوئے سب سے بڑا سبب سرسیّد کے بڑے بھائی کا قبل از وقت انتقال کرنا تھا۔ دونوں بھائیوں میں محبت اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ شہر میں اُس کی نظیر دی جاتی تھی سرسیّد کے بھائی کا یہ قول تھا کہ "کیسی ہی عیش و نشاط کی مجلس ہو اگر سید وہاں نہ ہو تو مجھ کو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے" ایسا ہی حال سرسیّد کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بھائی کے مرتے ہی ان کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ لباس اور وضع جو اُس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوا لیا۔ ڈاڑھی چھوڑ دی۔ پائنچے متشرع کر لیے۔ کُرتا پہن لیا۔ رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اُس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقی انسانی کا سمجھا جاتا تھا اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اصلی ترقی تک پہنچنے کے لیے اس مرحلے کا طے کرنا نہایت ضرور ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد کند در راہِ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

سرسیّد نے بھی اپنی ایک تحریر میں اُس نوجوانی کی لغزش کی طرف اشارہ کیا

ہے وہ قوم کی غفلت و بدمستی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں " ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے، ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے بڑھ کر تھے اور اپنی قوم کے غمخوار۔"

مگر سرسیّد کے بعض نہایت ثقہ رشتہ داروں سے سُنا گیا ہے کہ انھوں نے جو کچھ اس غفلت کے زمانے میں کیا اُس سے معدودے چند کے سوا کوئی متنفس واقف نہیں ہوا۔ وہ خود اسی معاملہ کے متعلق اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں: " وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے کے اشراف خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اُس سے واقف نہ ہوتا تھا اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرکت عام طور پر برملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اُس زمانے کے اشراف نوجوانوں کا عملدرآمد اس مقولہ پر تھا کہ " اپنے جسم کے زخم کو ڈھانکے رکھو تاکہ لوگ اسے دیکھ کر نفرت نہ کریں " یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ گو انسان سے کوئی بُرائی ہو مگر اُس برائی کا بُرا ہونا دل سے نہیں جاتا اور انسان کے لیے یہی رستہ بُرائی سے نکلنے کا ہے۔

## دوسرا باب

# ۱۸۳۸ء سے ۱۸۵۷ء تک

### ملازمت، تالیف رسائل مذہبی تاریخی و علمی، خطاب بادشاہی ترتیب آثار الصنادید، ترتیب تاریخ ضلع بجنور، تصحیح و تکمیل آئین اکبری

# ملازمت

۱۸۳۸ء میں جب کہ سرسید کے والد کا انتقال ہوا ان کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی قلعہ سے اُن کے والد کو کئی جگہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ چونکہ اُن کے والد اور راجہ سوہن لال میں ان بن تھی اور اُن کی زندگی ہی میں اُن کی تنخواہ میں کاٹ پھانس ہونے لگی تھی اب انتقال کے بعد قلعہ کی آمدنی میں سے صرف کچھ قدر قلیل تو سرسید کی والدہ کے نام جاری رہا باقی سب تنخواہیں بند ہوگئیں اور چند ملکیں جو معافی کی تھیں وہ بھی بہ سبب حین حیات ہونے کے ضبط ہوگئیں۔ اس لئے سرسید کو گورنمنٹ کی نوکری کا خیال پیدا ہُوا۔ ہرچند اُن کے رشتہ دار قلعہ سے قطع تعلق کرنے پر راضی نہ تھے مگر انھوں نے قلعہ کا سہارا یک قلم چھوڑ کر گورنمنٹ انگریزی کی نوکری اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اُس وقت وہ عدالت کی کارروائیوں سے اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے عدالت کی کارروائی سے اطلاع حاصل کرنی چاہی۔ اُن کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اس وقت دلی میں صدر امین تھے۔ اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں اُن کو کام سیکھنے

کی اجازت دیں انھوں نے خوشی سے اجازت دیدی اور سرسید نے وہاں کام سیکھنا شروع کیا ۔چند مہینے اُن کو کام سیکھتے گذرے تھے کہ مولوی خلیل اللہ نے اُن کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا جو کہ فیصلہ کے لیے صدرامینی میں آتے تھے اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا ۔سرسید کو اس کام پر کچھ بہت دن نہ گذرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو آخر کو سر رابرٹ ہملٹن ہوئے ) دلی میں جج ہو کر آئے ۔سرسید کو وہ پہلے سے جانتے تھے اسلیے یہ اُن سے ملنے کو گئے اور نوکری کی درخواست کی انھوں نے اُن کو عدالت سشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن انھوں نے اُس کام کو مشکل جان کر انکار کیا ۔ہرچند صاحب جج نے بہت اصرار اور دلدہی کی کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے ہم تم سے یہ سہولیت کام لیں گے اور ہر ایک بات بناتے رہیں گے مگر سرسید نے کہا کہ جس کام کی میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول کر سکتا ہوں ۔غرض کہ بدستور صدرامینی میں کام کرتے رہے ۔اتفاق سے انھیں دونوں میں مسٹر ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہو گئے اور چلتے وقت سرسید کو ایک چھٹی کے ذریعہ سے اپنے جانشین مسٹر لینڈزی کے سپرد کر گئے ۔لیکن ابھی مسٹر لینڈزی سرسید کو کوئی عہدہ دینے نہیں پائے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن نے اُن کو آگرہ میں بُلا لیا اور فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا خالی ہُوا اُس پر مقرر کر دیا۔

یہاں سرسید نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی اُس وقت کمشنری آگرہ کے ماتحت چند ضلعوں میں بندوبست کا کام جاری تھا اور بندوبست ہی کے متعلق بہت سا کام کمشنری میں تھا سرسید نے ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے موافق تمام دفتر کمشنری کا مرتب کیا گیا۔

انھیں دنوں میں انھوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے

مرتب کی تھی جس کا نام جام جم رکھا تھا اور جو ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں امیر تیمور صاحبقران سے لے کر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں قلمبند کیا ہے

اسی زمانہ میں انھوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدۂ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ ہو، جب وہ خلاصہ تیار ہو چکا تو صاحب کمشنر نے اس کو گورنمنٹ میں پیش کیا اور سرسیّد کے لیے عہدۂ منصفی کی سفارش کی. گورنمنٹ نے اس پر یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی ہو سید احمد خاں کو اس پر مقرر کیا جائے. لیکن ابھی ان کو یہ عہدہ ملنے نہ پایا تھا کہ عہدۂ منصفی کے لیے قواعد امتحان جاری ہو گئے. صاحب کمشنر نے اُن کو امتحان دینے کی ہدایت کی. انھوں نے خود بھی امتحان کی تیاری کی اور اپنے بڑے بھائی سید محمد خاں اور ماموں زاد بھائی حاتم علی خاں کو بھی امتحان دینے پر آمادہ کیا سید محمد خاں نے پہلی دفعہ قانون کی طرف کم توجہ کی تھی اس لیے وہ دوسرے سال امتحان میں پاس ہوئے مگر سرسیّد اور حاتم علی خاں نے پہلی ہی بار امتحان دے کر ڈپلوما حاصل کر لیا۔

امتحان کے بعد سرسیّد نے وہ خلاصہ چھاپ دیا اور اپنے بھائی کا نام بھی اُس میں شامل کر کے اُس کا نام انتخاب الاخوین رکھا جس کو اُس زمانے کے بعض ظریف دونوں بھائیوں کے اتحاد کی وجہ سے دم الاخوین کہتے تھے. خان بہادر منشی غلام نبی خاں اور میرے بھائی مرحوم کہتے تھے کہ "یہ انتخاب منصفی کے امید داروں کے لیے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبہ میں شائع ہو گیا. لوگوں کو اُس سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے اُمیدوار اسی کی بدولت منصف ہو گئے. ۱۸۸۴ء میں انجمن اسلامیہ لاہور نے جو سرسید کو ایڈریس دی تھی

اس میں بھی سرسید کے اس احسان کا ذکر کیا تھا۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور ۲۴ دسمبر کو وہ مین پوری کے منصف مقرر ہو گئے مگر ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو مین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور سیکری میں آگئے یہ آگرہ کے قریب ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ہے جلال الدین کے مرشد شاہ سلیم چشتی اسی شہر میں رہتے تھے اور اسی وجہ سے مدت تک یہ شہر اکبر کا دارالسلطنت رہا ہے اور یہاں کی قدیم شاہی عمارتیں ابتک اُس زمانے کی یادگار ہیں۔ سرسید اس شہر میں چار برس تک منصف رہے فتحپور میں جہاں اکبر کی خوابگاہ تھی حسن اتفاق سے وہی عالیشان مکان سرسید کو رہنے کے لیے ملا تھا۔ یہ چاروں برس اُسی مکان میں گذرے۔

# رسائل مذہبی وغیرہ

اس زمانہ میں سرسید نے تین رسالے تالیف یا طبع کرائے ہیں:

۱- جلاء القلوب بذکر المحبوب مؤلفہ ۱۲۵۸ھ یہ مختصر رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کے بیان میں اس لیے لکھا تھا کہ مولود کی مجلسوں میں جتنے رسالے شائع تھے اُن میں صحیح روایتیں بہت کم تھیں۔ سرسید نے اس رسالہ میں اُس زمانہ کے خیالات کے موافق محض صحیح روایتوں پر اکتفا کیا تھا۔

۲- تحفۂ حسن[1] مؤلفہ ۱۲۶۰ھ یہ ترجمہ ہے تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم اور باب دوازدہم کا۔ باب دہم میں وہ مطاعن جو شیعہ صدیق اکبرؓ پر کرتے ہیں مع

---

[1] اس ترجمہ کے سوا کبھی سرسید نے کوئی کتاب یا رسالہ یا آرٹیکل ایسا نہیں لکھا جس سے شیعوں پر اعتراض کرنا یا اُنکے اعتراض کا جواب دینا مقصود ہو۔ ۱۲

اُن کے جوابات کے مذکور ہیں، اور باب دوازدہم ہیں تولا اور تترا کا بیان ہے۔

۴۔ تسہیل فی جرِّ الثقیل مطبوعہ ۱۸۴۴ء یہ اردو ترجمہ ہے بوعلی نام ایک عالم کے ترجمۂ فارسی موسوم بہ معیار العقول کا جو ابو ذر یمنی کے عربی رسالہ سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس رسالہ میں مصنف نے جرِّ ثقیل کے پانچ اصول بیان کیے ہیں۔ یعنی بھاری چیزوں کے اٹھانے، سخت چیزوں کے چیرنے اور جن چیزوں کا دبانا یا نچوڑنا دشوار ہو اُن کے دبانے یا نچوڑنے کے لیے پانچ کلیں بتائی ہیں۔ اور اُن کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں۔

## خطاب بادشاہی

اسی زمانے میں بہادر شاہ نے سرسید کو اُن کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ ۱۸۴۲ء میں جب وہ مین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور میں آئے تو چند روز کے لیے بتقریب رخصت بالتعطیل دلّی آئے تھے۔ اُس زمانہ میں حکیم احسن اللہ خاں بادشاہ کے ہاں نیابت کا کام کرتے تھے انھوں نے بادشاہ سے سرسید کی تقریب کی کہ اُن کے دادا کا خطاب اُن کو ملنا چاہیے۔ بادشاہ نے منظور کر لیا۔ اگرچہ سرسید کے دادا کا خطاب صرف جواد الدولہ تھا اور یہی خطاب لکھ کر حکیم احسن اللہ خاں نے پیش کیا تھا۔ مگر بادشاہ نے اُس میں عارف جنگ کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے جواد الدولہ سیّد احمد خاں عارف جنگ کا خطاب سرسید کو عنایت کیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں

۱۸ فروری ۱۸۴۶ء کو سرسید فتحپور سیکری سے دلّی تبدیل ہو گئے۔ انھیں دنوں میں اُن کے بڑے بھائی کا عین عالم شباب میں انتقال ہوا تھا اور اُن کی والدہ پر یہ صدمہ نہایت سخت گذرا تھا۔ اس لیے انھوں نے خود درخواست

کر کے اپنی بدلی کرائی تھی۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک جب تک کہ وہ مستقل صدر امین مقرر نہیں ہوئے دلی ہی میں رہے۔ اس عرصہ میں صرف دو دفعہ یعنی ایک بار ۱۸۵۰ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۳ء میں قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے کا اتفاق ہوا۔

جس وقت وہ فتحپور سے بدلکر دلی میں آئے تھے اس وقت ان کی عمر انتیس برس کی تھی۔ یہاں آکر ان کو یہ خیال ہوا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیاً ہوگئی تھیں ان کو از سر نو غور اور توجہ سے پڑھیے۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے ان سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل قدوری، و شرح وقایہ اور اصول فقہ میں شاشی، نور الانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی۔ مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقامات حریری کے چند مقامے اور سبعۂ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبد العزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے حدیث پڑھنی شروع کی۔ مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ بس اس سے زیادہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے استاد سے انھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔

## آثار الصنادید

اُسی زمانے میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے اُن کو عمارات شہر اور نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ "میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا" وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینا اوپر کے خرچ کے لیے مجھ

دیدیتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات اُن کے ذمہ تھے۔ جو کپڑا وہ بنا دیتی تھی پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں کھا لیتا تھا۔" اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی آمدنی گھر کے اخراجات کو مشکل سے مکتفی ہوتی تھی۔ اُن کے بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا جس سے سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کم ہو گئی تھی قلعہ کی تنخواہیں تقریباً کل بند ہو گئی تھیں۔ باپ کی ملک بھی بسبب جین حیات ہونے کے ضبط ہو گئی تھی۔ کرایہ کی آمدنی بہت قلیل تھی۔ صرف سرسید کی تنخواہ کے سو روپے ماہوار تھے اور سارے کنبے کا خرچ تھا۔ سرسید ابتدا سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے۔ لہٰذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سیدالاخبار جو اُن کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

سیدالاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد کر رکھا تھا مگر زیادہ تر سرسید خود اُس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ اخبار ایک مدت جاری رہ کر بند ہو گیا۔ مگر عمارتوں کی تحقیقات نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ برابر جاری رہی۔ سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے۔ اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر اُن کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے۔

باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہو گئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے

خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصّے معدوم ہو گئے تھے اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے اُن سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اُس سے کیا مقصود تھا کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے اُن کا مفصل حال دریافت کرنے کے لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہوگئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طول وارتفاع کی پیمائش کرنی۔ ہر ایک عمارت کی صورت حال قلمبند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے اور ہر ایک کتبے کو بعینہٖ اُس کے اصلی خط میں دکھانا ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھچوانا اور اس طرح کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ براہ ہونا، فی الحقیقۃ نہایت دشوار کام تھا۔ سر سیّد کہتے تھے کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے اُن کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے اُن کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا"۔ سر سیّد کی آیندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور اُن کی یہ حالت بالکل ابو تمام کے اس شعر کی مصداق تھی۔

وَيَصْعَدُ حَتّٰى يَظُنَّ الْوَرٰى ... بِاَنَّ لَهٗ حَاجَةً فِي السَّمَاءِ

(یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اُس کو آسمان پر کچھ کام ہے)

باوجود اس قدر مشکلات کے آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپکر تیار ہوگیا۔ اس اڈیشن میں چار باب تھے۔ پہلا باب عمارات

بیرون شہر کے بیان میں دوسرا باب لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کے بیان میں۔ تیسرا باب خاص شہر شاہجہان آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں چوتھا باب دلی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں جو سر سید سے کچھ پہلے یا اُن کے زمانہ میں موجود تھے۔ پہلے باب میں تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں کی عمارتیں شامل ہیں اور چند کے سوا باقی ہر عمارت کا کتبہ اور نقشہ اُس کے ساتھ دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ۳۲ عمارتوں کا بیان اور اُس کے نقشے اور کتبے مندرج ہیں۔ تیسرے باب میں تقریباً ۷۰ حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باولیوں، اور کنوؤں وغیرہ کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں اوّل کسی قدر اُن شہروں، قلعوں اور محلوں وغیرہ کا بیان ہے جو سمت ۳۰۰ بکرمی سے لے کر آخر تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد یہاں کی آب و ہوا اور زبان اُردو کا ذکر ہے۔ پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے جس میں ایک سو بیس مشائخ، علما، فقرا، مجاذیب، اطبا، قرا، شعرا، خوشنویس، مصوّر، موسیقی دان وغیرہ کا بیان ہے۔ اگرچہ اس اڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ اور تکلفات بارد کے سبب آج کل کے مذاق کے موافق بہت پھیکی اور بے مزہ ہو گئی تھی اور اُس کے سوا اس میں اور بھی بہت سی کسریں اور فرد گذاشتیں رہ گئی تھیں مگر مضمون کے لحاظ سے نہایت عبرت خیز تھی۔ اول کے تین باب دیکھ کر سرزمین دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے اور تھوڑی دیر کو دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے۔ اور پچھلے باب سے دلی کا اخیر جھمکڑا آنکھوں کے روبرو آ جاتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ جس شہر میں پچاس ساٹھ برس پہلے قوم کے اس قدر اہل اللہ، اہل علم اور اہل ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

الغرض یہ اڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپکر شائع ہوا۔ اُسی زمانے میں مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجہاں آباد ولایت جاتے تھے۔ وہ ایک نسخہ آثار الصنادید کا ساتھ لے گئے اور وہاں جاکر اُس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبران سوسائٹی نے اُس کو بہت پسند کیا اور کورٹ اوف ڈائرکٹرز کے بعض ممبروں نے مسٹر رابرٹس سے کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ جب مسٹر رابرٹس ولایت سے واپس آئے تو انھوں نے سرسید کی شرکت سے اُس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا۔ اس وقت سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو کسریں پہلے اڈیشن میں رہ گئی ہیں اُن کی درستی اور اصلاح کیجائے۔ چنانچہ انھوں نے کتاب پر نظر ثانی کر کے اس کو از سر نو مرتب کیا۔ جو کچھ ترمیم یا اصلاح یا اضافہ انھوں نے پہلے اڈیشن میں کیا ہے اُس کا مفصل ذکر طبع ثانی کے دیباچہ میں مندرج ہے۔ بڑی خوبی اس نئے اڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے اڈیشن کے نہایت سادگی ہے اور اس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات بارد سے بالکل پاک ہے۔ اس اڈیشن کے لیے سرسید نے نقشے بھی از سر نو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے۔ مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہو گیا اور وہ سب نقشے تلف ہو گئے۔ کچھ نقشے جو اب ملے ہیں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ البتہ چوتھا باب جس میں دلی کے مشاہیر کا حال لکھا گیا تھا وہ اس اڈیشن میں نہیں ہے۔ اس ترمیم و اصلاح کے باعث دراصل مسٹر اڈورڈ طامس ہوئے تھے جو اُس وقت دلی میں سیشن جج تھے اُن کو پرانی چیزوں کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا انھیں کے کہنے سے سرسید نے آثار الصنادید کو از سر نو مرتب کیا تھا۔

یہ اڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپکر تیار ہو گیا تھا مگر نہ اس اڈیشن سے اور

نہ پہلے اڈیشن سے سرسید کو جیسا کہ خیال تھا کچھ فائدہ ہوا۔ دوسرے اڈیشن کے تقریباً تمام نسخے غدر میں تلف ہو گئے۔ اور پہلے اڈیشن میں بھی ایک شخص کی بدعہدی کے سبب جو اُس کے چھاپنے کا ذمہ دار ہوا تھا، سراسر نقصان رہا۔

مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی نے سرسید کی شرکت سے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا مگر ابھی بہت کچھ ترجمہ کرنا باقی تھا کہ مسٹر رابرٹس کی دلی سے تبدیلی ہو گئی۔ پھر معلوم نہیں کہ وہ ترجمہ پورا ہوا یا نہیں اور کسی نے اُس کا ترجمہ انگریزی میں کیا یا نہیں۔ لیکن فرانس کے مشہور اورینٹلسٹ موسیو گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اُس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کر کے مشتہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی۔ اسی ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں اول مسٹر رین ہولڈ راسٹ سکرٹری سوسائٹی موصوف کی چٹھی مورخہ ۲۰ جون ۱۸۶۴ء سرسید کے نام اس مضمون کی پہنچی کہ "یورپ میں آپ کی کتاب کی بہت قدر کی گئی ہے اور یہ اتفاق رائے چند ممبران سوسائٹی آپ اس سوسائٹی کے آنریری ممبر مقرر ہو گئے ہیں" اس کے بعد جو ڈپلوما سوسائٹی نے سرسید کو بھیجا اس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

لندن ۴ جولائی ۱۸۶۴ء

گریٹ برٹن اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے زیر سرپرستی ہز موسٹ اکسلنٹ مجسٹی وکٹوریا آج کی تاریخ سید احمد خاں کو اس سوسائٹی کی آنریری ممبری کے ساتھ نامزد کیا جس کی سند میں یہ ڈپلومہ اُن کو ارسال کیا جاتا ہے۔

دستخط اڈورڈ کول بروک پریسیڈنٹ

دستخط ایچ رالنسن ڈائرکٹر۔

دستخط رین ہولڈ راسٹ سکرٹری۔

# رسائل مذہبی وغیرہ

اسی زمانے میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے آثار الصنادید کے علاوہ اُنھوں نے اور بھی کئی رسالے لکھے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے ۔

۱- فوائد الافکار فی اعمال الفرجار مترجمہ ۱۸۴۶ء یہ رسالہ ترجمہ ہے اُن فارسی مسودات کا جو سر سید کے نانا نواب دبیر الدولہ نے پر کار متناسبہ کے اعمال پر (جو انھوں نے خود سوچ سوچ کر نکالے تھے) فارسی میں قلمبند کیے تھے. یہ مسودات سر سید کے ہاتھ آ گئے تھے، انھوں نے دو انگریز عالموں کے کہنے سے ان مسودات کا ترجمہ اُردو میں کیا اور اُس میں مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کیں ۔

۲- قول متین در ابطال حرکت زمین مورخہ ۱۸۴۸ء اس رسالہ میں قدیم خیالات کے موافق سر سید نے زمین کی حرکت کو جس کا اب تمام یورپ قائل ہے غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن اب مدت سے حرکت زمین کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اُس کو یقینی جانتے تھے۔

۳- کلمۃ الحق مؤلفہ ۱۸۴۹ء یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقۂ مروجہ کے برخلاف لکھا ہے ۔

۴- راہِ سنت در رد بدعت مؤلفہ ۱۸۵۰ء یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانہ میں اہل بدعت کے برخلاف متبعین سنت کی تائید میں لکھا ہے۔

۵- تمیقہ در بیان مسئلۂ تصور شیخ مرقومہ ۱۸۵۲ء - یہ رسالہ فارسی زبان میں، بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا ہے جس میں تصور شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلۂ محبت خدا و محبت رسولؐ و انبوب رحمت الٰہی بنایا ہے۔

۶- سلسلۃ الملوک مرتبہ ۱۸۵۲ء یہ ایک مختصر مگر مفید اور صحیح فہرست اُن

راجاؤں اور بادشاہوں کی ہے جو دہلی میں پانچہزار برس سے نوبت بہ نوبت فرمانروا ہوتے چلے آئے اُس میں راجہ یُدھشٹر سے لیکر ملکہ معظمہ قیصر ہند تک ۲۰۲ فرما نرواؤں کا نام، باپ کا نام، سنہ جلوس، دارالسلطنت اور یہ کہ اُس کا عہد کس زمانے میں تھا، نہایت تحقیق اور جانفشانی سے لکھا ہے۔ اصل میں یہ وہی فہرست ہے۔ جو آثار الصنادید کے دوسرے اڈیشن میں پہلے باب کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے اسی کو کسی قدر اصلاح کے بعد علیحدہ چھاپ کر اس کا نام سلسلۃ الملوک رکھدیا ہے۔

۷- آغاز کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ مرقومہ ۱۸۵۳ء بس اس کے سوا دلّی کی ملازمت کے زمانہ میں سرسید نے اور کوئی کتاب یا رسالہ نہیں لکھا۔

# دلّی سے بجنور کو تبدیل ہونا

سرسید دلی میں جب کہ آثار الصنادید کو ترتیب دے رہے تھے۔ درجہ اوّل کے منصف ہو گئے تھے اور اب اُن کا نمبر صدر امینی کا تھا لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ اُس وقت دلّی میں ہر قسم کے اہل کمال اور اہل علم موجود تھے اور مسلمانوں کی اس سوسائٹی میں کسی قدر جان باقی تھی اور کچھ عمارتوں کی تحقیقات کے ذوق وشوق میں، وہ دلّی سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے ایک آدھ بار جو اُن کو قائم مقام صدر امین مقرر کر کے کہیں باہر بھیجنا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ رہتک میں جو وہ قائم مقام صدر امین ہو کر گئے اس کا سبب یہ تھا کہ وہ چند روز کے لیے ایک خاص کام پر بھیجے گئے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں جب کہ آثار الصنادید کا دوسرا اڈیشن بھی نکال چکے تھے، اتفاق سے مسٹر اڈورڈ طامس جو دلّی میں جج رہ چکے تھے اور جن کے ایما سے آثار الصنادید کی دوبارہ اصلاح کی گئی تھی کہیں سے آگرہ میں وارد ہوئے اور صدر بورڈ کے حکام سے ملنے کو بورڈ میں چلے گئے اُس وقت بجنور کی صدرامینی

خالی تھی اور صدر امینی کے اُمیدواروں کی فہرست بورڈ میں پیش تھی۔ طامس صاحب نے سرسید کا نام یاد دلایا۔ بورڈ کے ممبروں نے کہا کہ وہ دلی سے باہر جانا نہیں چاہتے اس لیے اُن کا نام امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ طامس صاحب نے کہا کہ وہ قدیم عمارات دہلی کی تحقیقات میں مصروف تھے سو وہ کام ختم ہو گیا ہے، اب اُن کو دلی سے باہر جانے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ اور ایک چٹھی سرسید کو لکھی کہ تم کو بجنور میں صدر امینی پر بھیجنے کی تجویز ہو گئی ہے اب تم ہرگز انکار نہ کرنا۔ اس لیے سرسید کو لاچار دلی چھوڑنی پڑی۔ چنانچہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ مستقل صدر امین مقرر ہو کر دلی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس اُن کو گذرے تھے کہ غدر ہو گیا۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں انھوں نے اپنے فرائض منصبی کے علاوہ فرصت کے وقتوں میں دو کام نہایت سخت محنت کے کیے جو ذکر کے قابل ہیں۔ ایک ضلع بجنور کی تاریخ کا مرتب کرنا، دوسرے آئین اکبری کی تصحیح اور تکمیل

## ضلع بجنور کی تاریخ

جس زمانے میں سرسید بجنور کو تبدیل ہو کر گئے انھیں دنوں میں ایک سرکلر محکمۂ صدر بورڈ سے تمام صاحبان ضلع کے نام اس مضمون کا جاری ہوا تھا کہ جس ضلع کا بندوبست ختم ہو جائے اُس ضلع کی ایک مفصل تاریخ لکھوائی جائے۔ یہ سرکلر پہلے سے صاحب کلکٹر کے دفتر میں آیا ہوا تھا مگر ابھی تک اُس پر کچھ عملدرآمد نہ ہوا تھا۔ ایک روز صاحب کلکٹر نے سرسید سے اُس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اس ضلع کی تاریخ میں لکھوں گا۔ صاحب کلکٹر نہایت خوش ہوئے اور محکمۂ بندوبست میں حکم بھیج دیا کہ جس پرگنہ یا گانو کے کاغذات صدر امین صاحب طلب کریں فوراً ان کے پاس بھیج دیے جائیں۔ اسی طرح تمام تحصیلداروں کو ہدایت کی گئی کہ

بجس قانون گو یا پٹواری کو وہ بلائیں یا جو کاغذات وہ منگوائیں اُن کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ سر سید نے یہ تاریخ بھی اپنی جبلی عادت کے موافق نہایت تحقیق اور کاوش اور محنت کے ساتھ لکھی۔ اُن کا بیان ہے کہ "گو اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانون گویوں کے پاس اکبر اور عالمگیر کے زمانہ کے ایسے کاغذات ملے جن سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے۔" اُن سب کاغذات کی نقلیں اپنے اپنے موقع پر اس تاریخ میں درج تھیں۔ جب یہ تاریخ لکھی جا چکی تو صاحب کلکٹر نے اُس کو ملاحظہ کے لیے صدر بورڈ میں بھیج دیا۔ ابھی وہ بورڈ سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہو گیا اور آگرہ میں تمام دفتر سرکاری کے ساتھ وہ بھی ضائع ہو گئی۔ مسٹر شکسپیر کلکٹر ضلع بجنور اسی تاریخ کی نسبت اپنی چٹھی مورخہ ۵ رجون ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں اُن باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں جو اُن کے خاص کام سے علاقہ نہیں رکھتیں چنانچہ انھوں نے اس ضلع کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی تھی کہ غدر سے چند روز پہلے ہم نے یہ کتاب گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ اگر وہ اس وقت یہاں میرے پاس موجود ہوتی تو بہت بکار آمد ہوتی۔ مگر غالب ہے کہ آگرہ میں بباعث غدر کے تلف ہو گئی ہو گی۔"

اسی تاریخ میں سر سید نے ایک لمبی بحث سنہ فصلی کے متعلق لکھی تھی اور جو غلطی سنہ فصلی اور سنہ عملی میں فرق نہ کرنے اور دونوں کو ایک سمجھنے سے سرکاری دفتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اُس کو نہایت وضاحت کے ساتھ گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا اور جو مشکلات کہ اُس غلطی سے لازم آتی تھیں اُن کو جتایا تھا۔ گو یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ گورنمنٹ نے سر سید کی اسی تحریر پر لحاظ کر کے اس غلطی کی اصلاح کی کیونکہ وہ تاریخ ۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گئی تھی۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ صدر بورڈ کا ایک سرکلر ۱۸۶۰ء میں اور دوسرا ۱۸۷۱ء میں بہ منظوری گورنمنٹ جاری ہوا جن کی رو سے علاوہ سنہ فصلی اور سنہ حسابی کے ایک اور سنہ سنہ مالی کے نام سے مقرر کیا گیا جو بالکل سنہ عملی کے مطابق ہے اور جس سے وہ تمام مشکلات رفع ہوگئیں جو سرسید نے اپنی تاریخ میں جتائی تھیں۔ کچھ تعجب نہیں ہے۔ کہ جو کچھ سرسید نے تاریخ بجنور میں اس امر کے متعلق لکھا تھا وہ بورڈ کے کسی ممبر کے ذہن میں محفوظ رہا ہو اور غدر کے دو تین برس بعد اُسی بنا پر سنہ مالی مقرر کیا گیا ہو۔ سرسید نے اسی سنہ فصلی کے مضمون پر ۱۸۶۹ء میں ایک نہایت مفید اور مفصل لکچر سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ میں دیا تھا جو ۸۔ جون ۱۸۶۹ء کے اخبار میں درج ہے۔ اس لکچر میں انھوں نے تقریباً وہ تمام خیالات ظاہر کیے ہیں جو سنہ فصلی کے متعلق تاریخ بجنور میں تحریر کیے تھے۔

# آئین اکبری کی تصحیح

جب سرسید دلی میں منصف تھے تو حاجی قطب الدین مرحوم نے جو دلی کے ایک مشہور تاجر تھے اُن سے درخواست کی تھی کہ اگر آپ آئین اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈالکر اس کی تصحیح اور درستی کر دیں تو میں اُس کو چھپوا دوں اور اُس کے معاوضہ میں آئین اکبری کے چھپے ہوئے نسخے قیمتی سولہ سو روپے کے آپ کی نذر کروں گا۔ سرسید نے منصفی دہلی کی حالت میں وہیں کے ایک تاجر سے ایسا معاہدہ کرنا جائز نہ سمجھا۔ مگر چونکہ ایسے مفید اور دشوار کاموں میں اُن کا جی بہت لگتا تھا، بجنور پہنچکر اُنھوں نے یہ کام شروع کیا۔

آئین اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی دوسرے جس قسم کے مضامین اُس میں بیان کیے گئے ہیں۔ فارسی لٹریچر

میں کبھی اُس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے اس لیے اُس کے پڑھنے سے جی الجھتا تھا۔ پھر آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو و خطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے اس لیے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔ سرسید نے اول جہاں تک مل سکے اُس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے۔ اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی، اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی، جو اصطلاحیں اکبر کے زمانہ میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں اُن کی جابجا تشریح کی۔ اُس زمانے کے اوزان اور نقود کی اس زمانہ کے اوزان و نقود سے مطابقت کی، جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیتے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے۔ اُن کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا۔ کہیں کہیں جدولوں میں جو خود مصنف نے غلطی کی تھی اُس کو بہت کوشش سے تحقیق کر کے صحیح کیا۔ بعض جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حرف لکھے ہوئے تھے اُن کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں۔ وہ آئین کے انگریزی ترجمہ کے مطابق جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی کتاب میں داخل کیں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے آخر میں اس لیے اضافہ کیا کہ اُس سے پہلے خانے کا مفہوم ہر شخص بآسانی سمجھ جائے۔ جہاں آئین میں سکّوں کا بیان ہے وہاں چند اوراق بطور حاشیہ کے اپنی طرف سے بڑھائے اور اکبر کے زمانے کے جس قدر سکّے ابوالفضل نے بیان کیے تھے اُن میں سے ہر ایک سکّے کی دو دو تصویریں دے کر دونوں طرف جو عبارت یا الفاظ کندہ تھے اُن کو دکھایا اور اکبر ہی کے زمانہ کے آٹھ سکّے سونے اور

چاندی کے اُن کے علاوہ اور نشان دیئے اس کے سوا اور بہت سی باتیں مفید اضافہ کیں۔

پھر اصل آئین میں خال خال تصویریں تھیں۔ سر سیّد نے نہایت محنت و جانفشانی اور حسنِ اہتمام سے بے شمار تصویریں دلّی کے لائق مصوروں سے کھچوا کر کتاب میں اپنے اپنے موقع پر داخل کیں۔ مثلاً ٹکسال کے متعلق تقریباً پچاس پچپن تصویروں کے دو بڑے بڑے مرقعے کھچوائے جن میں مختلف کاریگر اپنے اپنے آلات اور ظروف اور اوزار لیے ہوئے جُدا جُدا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح فلزات کے متعلق ترازو کے ہوائی ترازو کے آبی کی تصویر، شکار اور یورش کے موقع پر خیمہ گاہِ بادشاہی کی تصویر، آئین چراغ خانہ کے متعلق اکبر کی آتش پرستی اور اُس کے تمام لوازمات کی تصویر، آئین شکوہ سلطنت کے متعلق تمام سامان تزک و احتشام کی تصویریں، فیلخانہ اور ہاتھیوں کی پوشش اور ہاتھیوں کی کُشتی کی تصویریں، علیٰ ہذا القیاس تمام پھلدار اور پھولدار درختوں کی اور ہر ایک درخت کے ساتھ اُس کی شاخ اور برگ و ثمر یا پھول اور پتّے کی تصویریں اوراق گنجفۂ قدیم اور گنجفۂ مخترعۂ اکبر کی تصویریں اور تمام ہتھیاروں اور زیوروں کی تصویریں اور اُن کے سوا اور بہت سی تصویریں کھچوا کر کتاب میں شامل کیں چنانچہ مسٹر ایچ بلاک مین پرنسپل کلکتہ کالج نے جو ۱۸۷۳ء میں آئین کا از سر نو ترجمہ کر کے چھاپا ہے اس میں انھیں تصویروں کی نقل لی ہے جو سر سید نے فارسی آئین اکبری میں داخل کی تھیں۔

پہلی اور تیسری دو جلدیں اس طرح صحیح اور درست کر کے مطبع میں چھپنے کو بھیجدی گئیں مگر دوسری جلد کی تصحیح میں یہ مشکل پیش آئی کہ ابو الفضل نے آئین خراج کے متعلق جو تمام ہندوستان کا محاصل لکھا تھا وہ حصہ تمام نسخوں میں مختلف پایا گیا اور کوئی ذریعہ اُس کی تصحیح کا نہ تھا۔ اتفاق سے دلّی میں سر سیّد

کے نانا نواب دبیرالدولہ کے وقت کی ایک کتاب تشکیل دی جس میں سلطنت مغلیہ کے کل بادشاہوں کے عہد کا محاصل نہایت مفصل اور صحیح طور پر واضح کیا اِس کتاب سے تمام محاصل جو اکبر کے زمانہ کا تھا نقل کر کے دوسری جلد بھی مکمل کی گئی اور ایک مبادیباچہ جو گویا آئینِ اکبری پر ایک مفصل ریویو تھا، تحریر کر کے دوسری جلد کے ساتھ دلّی میں چھپنے کو بھیجا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہوگیا اور اُس کے جس قدر فرمے چھپ چکے تھے وہ اور تمام مسودہ اور دیباچہ سب تلف ہو گئے۔ اب اُس آئینِ اکبری کی جو سرسیّد نے صحیح کی تھی صرف پہلی اور تیسری دو جلدیں مطبوعہ ۱۲۷۲ھ ہجری کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

دہلی کے جن نامور لوگوں کی تقریظیں آثار الصنادید کے آخر میں درج ہیں انھوں نے آئینِ اکبری پر بھی نظم یا نثر میں تقریظیں لکھی تھیں مگر آئین کے آخر میں صرف مولانا صہبائی کی تقریظ چھپی ہے۔ مرزا غالب کی تقریظ جو ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہے وہ کلیاتِ غالب میں موجود ہے مگر آئینِ اکبری میں سرسیّد نے اُس کو قصداً نہیں چھپوایا۔ اس تقریظ میں مرزا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ابوالفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی کہ اُسکی تصحیح میں اسقدر کوشش کیجائے چنانچہ کہتے ہیں۔

مژدہ یاراں راکہ ایں دیریں کتاب  یافت از اقبال سید فتح باب
دیدہ بینا آمد بازو قوی  کہنگی پوشید تشریفِ نوی
دیں کہ در تصحیح آئیں رائے اوست  ننگ و عارِ ہمتِ والائے اوست

اس کے بعد بہت سے اشعار اس مضمون کے لکھے ہیں کہ تعریف کے قابل انگریزوں کے آئین و ایجاد و اختراع میں نہ کہ اکبر اور ابوالفضل کے۔ اور تمثیلاً انگریزوں کے بہت سے ایجادات بیان کیے ہیں۔ جب یہ تقریظ مرزا نے سرسید کو بھیجی انھوں نے اس کو مرزا کے پاس واپس بھیج دیا اور لکھا کہ ایسی تقریظ مجھے درکار[1] نہیں۔ ایک عربی تقریظ نواب مصطفٰے خاں مرحوم کی بھی ہے مگر وہ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بھی شاید دیر میں پہنچنے کے سبب چھپنے نہیں پائی۔ انھوں نے بھی اپنی تقریظ کے آخر میں ایک فارسی شعر ایسا لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں بھی آئین اکبری کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی۔

مگر اہل یورپ اس کتاب کو ہندوستان کی تاریخوں میں ایک بے نظیر کتاب سمجھتے ہیں۔ ۱۷۸۳ء سے اہل فرانس اور انگریز اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اُس وقت سے ۱۸۷۳ء تک اس کے متعدد ترجمے اور خلاصے فرنچ اور انگلش میں ہو چکے ہیں۔ مسٹر ایچ بلاک مین جنھوں نے ۱۸۷۳ء میں انگریزی میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس کا ترجمہ کر کے شائع کیا تھا اُس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ کتاب مسلمانوں کی تاریخوں میں جو ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتی یہ فی الواقع اُس سلطنت کی جو ۱۵۹۰ء کے قریب تھی۔ ایک ایڈمنسٹریشن رپورٹ اور نقشجات ہیں جن میں اکبر کے عہد کے وہ تمام حالات اور واقعات درج ہیں جن کے لیے ہم اس زمانے میں ایڈمنسٹریشن رپورٹوں نقشوں اور گزیٹیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

پس سرسید کا ایک ایسی نادر الوجود کتاب کی تصحیح و تہذیب میں کوشش

---

۱؎ سرسید کہتے تھے کہ "جب میں مرادآباد میں تھا اُس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علیخاں مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے اُن کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی مگر جب دلّی کو واپس جاتے تھے میں نے سنا کہ وہ مرادآباد میں سرائے میں آکر ٹھہرے ہیں میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آیا" ظاہراً جب سے کہ سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا اور اسی لیے مرزا نے مرادآباد میں آنے کی اُن کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سرسید کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اترے تو ایک بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی انھوں نے اُس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی سرسید نے کسی وقت اُس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔

بلیغ کر کے اس کو از سر نو زندہ کرنا صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی فضول کام نہ تھا بلکہ فی الحقیقۃ پبلک پر ایک بہت بڑا احسان تھا اور مسلمانوں کے ایک نامور مصنف اور نامور بادشاہ کے کارنامہ کو دنیا کے سامنے ایک دلنشین صورت میں پیش کرنا تھا۔

غدر سے پہلے صرف سوا دو برس سر سید کا بجنور میں رہنا ہوا اسی قلیل عرصہ میں مذکورۂ بالا کاموں کے سوا اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مفید کام کرتے رہے۔ چونکہ اُن کی طبیعت کو تعمیر کے کام سے ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا اس لیے صاحب کلکٹر نے کمیٹی رفاہ عام کا تمام کام اُن کے سپرد کر دیا تھا۔ وہی اُس کی رپورٹ لکھتے تھے اور وہی ضروری کاموں کے لیے روپیہ منگواتے تھے اور ہر ایک کام کی نگرانی کرتے تھے منجملہ اور کاموں کے ایک مفید کام اُنھوں نے یہ کیا کہ بجنور کی آبادی کے متصل شارع عام کے بیچوں بیچ مدت سے ایک نہایت چوڑا چکلا گڑھا پڑا ہُوا تھا، اسی رستے سے تمام گاڑیاں، گھوڑے پیدل اور سوار گذرتے تھے۔ بعض اوقات گاڑیاں الٹ جاتی تھیں۔ بیلوں کو نقصان پہنچتے تھے۔ برسات میں پانی بھر جاتا تھا جس سے طرح طرح کی تکلیفیں لوگوں کو ہوتی تھیں۔ مدت سے یہ گڑھا چلا آتا تھا مگر کسی کو کچھ خیال نہ تھا۔ سر سید نے خاص اپنے اہتمام سے وہاں ایک پُل بندھوایا اور بجنور سے دارانگر تک ایک سڑک بنوادی جس سے مسافروں کو بہت آسانی ہوگئی۔

## تیسرا باب

# ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۸ء تک

"ایام غدر کی خدمات اور واقعات، مراد آباد کی تبدیلی اور تاریخ سرکشی بجنور کی اشاعت، مراد آباد میں مدرسہ قائم کرنا، رسالۂ اسباب بغاوت لکھ کر اور چھپوا کر ولایت بھیجنا۔ ملکہ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ، ایک میگزین موسوم بہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" اردو اور انگریزی، میں نکالنا، تحقیق لفظ نصاریٰ پر ایک مختصر رسالہ لکھنا۔ انتظام قحط ضلع مراد آباد، تصحیح تاریخ فیروز شاہی تفسیر توریت و انجیل، بی بی کا انتقال، غازیپور کی تبدیلی، غازیپور ہی میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا۔ غازیپور میں مدرسہ قائم کرنا، علیگڑھ کی تبدیلی، برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کرنا، اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر کرانا۔ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کا علیگڑھ سے نکلنا، ورنیکلر یونیورسٹی کے لیے تحریک، بنارس کی تبدیلی، اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت۔ رسالۂ طعام اہل کتاب، رسالۂ علاج ہیضہ بموجب اصول ہومیوپیتھک۔"

# ایّام غدر کا بیان

جس واقعہ نے ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے نام پہ ایک سیاہ

دھبہ چھوڑا ہے اور جو ہندوستان کی قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا اور سرسید کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے والا تھا، وہ سرسید کو بجنور میں دیکھنا پڑا، اُن کو اس ضلع میں دو برس اور چار مہینے گذرے تھے کہ ۱۰ مئی ۵۷ء کو دلی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲ کو یہ خبر بجنور میں پہنچ گئی۔ وہاں اُس وقت بیس یورپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ سرسید نے اس موقع پر اپنا پہلا فرض یہ قرار دے لیا تھا کہ جب تک دم میں دم باقی ہے ان بیس جانوں کے بچانے میں جہاں تک ممکن ہو کوشش کیجائے۔ جو واقعات اور مصائب وہاں پیش آئے وہ نہایت درد انگیز ہیں اور سرسید کی تاریخ سرکشی بجنور میں مفصل مذکور ہیں۔ اُن کی تفصیل دوبارہ لکھنی گویا اُن مصیبتوں کا پھر یاد دلانا اور رنج کو دوبالا کرنا ہے۔ ع مَصَائِبُ اُخْرٰی ذِکْرُہَا لَکَ اَلْمَصَائِبُ

خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے اُس خطرناک موقع پر نہایت دلیری اور جوانمردی سے تمام مصیبت کے زمانے میں یورپین حاکموں کا جو وہاں موجود تھے ساتھ دیا۔ ہر ایک نازک وقت میں اُن کے ساتھ شریک اور گورنمنٹ کی وفاداری اور خیرخواہی میں شب و روز مستعد اور سرگرم رہے۔ جو لوگ گورنمنٹ کے خیرخواہ تھے اپنی مستعدی اور سرگرمی سے اُن کے دل بڑھائے اور جن کی نیتوں میں تزلزل اور تذبذب پایا اُن کو نیک صلاحیں دیں اور جہاں تک ممکن تھا اُن کے خیالات کی اصلاح کی۔ اور جیسا کہ اُس زمانے کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں اور جیسا کہ خود یورپین افسروں نے اقرار کیا ہے صرف سرسید ہی کی حسن تدبیر دانائی، اور نیک دلی سے تمام یورپین اور عیسائی مرد اور عورتیں اور بچے صحیح وسالم وہاں سے نکل کر رڑکی میں پہنچ گئے۔

مسٹر شکسپیر جو اُس زمانے میں بجنور کے کلکٹر و مجسٹریٹ تھے۔ گو کہ سرسید

کو باعتبار عہدے کے اُن سے کچھ تعلق نہ تھا مگر مسٹر شکسپیئر سے اُن کی بہت راہ ورسم تھی جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسٹر شکسپیر بہت گھبرائیں۔ سرسید کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اُس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔" مسٹر شکسپیر ہمیشہ سرسید کی اس شریفانہ تقریر کے شکر گذار رہے۔

سرسید کا یہ کہنا صرف زبانی نہ تھا بلکہ انھوں نے اپنے افعال سے اس قول کو سچ کر دکھایا تھا۔ وہ تمام رات مسلح مع اور ہندوستانی افسروں کے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے اور ہر طرح عورتوں اور بچوں کی ڈھارس بندھواتے تھے ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گذر جاتی تھی۔ پلٹن نمبر ۲۹ تلنگوں کی ایک کمپنی سہارنپور سے بطور بدلی کے مراد آباد کو جاتی تھی جب وہ بجنور میں پہنچی تو صوبہ دار اور کچھ تلنگے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر گئے سرسید سے کسی نے یہ کہدیا کہ یہ کمپنی بگڑ کر آئی ہے اور کچھ تلنگے اور صوبہ دار بارادۂ فساد کلکٹر کی کوٹھی پر گئے ہیں۔ سرسید کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں کی خیر نہیں۔ وہ اسی وقت مسلح ہو کر کوٹھی کو روانہ ہو گئے۔ اور اپنے صغیرسن بھتیجے[1] کو جو تنہا چچا کے پاس تھا۔ چلتے وقت اپنے آدمی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں مارا جاؤں تو لڑکے کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیجیو۔ مگر کوٹھی پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ کمپنی مذکور بدلی پر مراد آباد جاتی تھی

---

[1] یعنی سید احمد خاں سب جج سیتاپور حال پنشنر ۱۲

وہ رات جبکہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یورپین اور یوریشین مرد عورتیں اور بچے جمع تھے اور ایک جماعت کثیر جو بظاہر اُن کی حفاظت کے لیے فراہم ہوئی تھی اُن کی نیتیں بگڑ گئی تھیں اور کچھ فوج اور توپخانہ باغیوں کا اُن کی کمک کے لیے مرادآباد سے عنقریب آنے والا تھا نہایت سختی تھی، اُس روز سب کے مارے جانے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ ایسے نازک وقت میں سرسید تنہا اُس خودسر جماعت کے مجمع میں گئے اور نواب محمود خاں سے جو اُن کا سرغنہ تھا گفتگو کی اور کہا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا! بہتر یہ ہے کہ اُن کو صحیح وسالم یہاں سے جانے دو، اور تم ملک کے مالک ہو جاؤ۔ ایسے ٹیڑھے وقت میں سرسید کے ہوش وحواس بالکل بجا اور درست رہے اور محمود خاں سے ایسی عمدہ گفتگو کی اور اس معاملہ کے متعلق تمام نشیب وفراز ایسی خوبی سے سمجھائے کہ اس نے فوراً منظور کرلیا اور سب انگریزوں کو اُسی رات اُس خونخوار مجمع سے نکال کر رڑکی روانہ کردیا اس موقع پر کلکٹر کی طرف سے جو تحریر سرسید نے لکھ کر نواب محمود خاں کو دی تھی اگر وہ اُس کے موافق عملدرآمد کرتا تو اُس کو کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا بلکہ انگریزی تسلط ہو جانے کے بعد ضرور اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو اور خیرخواہوں کے ساتھ ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اُس نے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اس پر کچھ لحاظ نہ کیا

انگریزوں کے رڑکی روانہ ہو جانے کے بعد سرسید اور اُن کے دوست میر تراب علی خاں جو اُس زمانے میں بجنور میں تحصیلدار تھے اُسی رات کو بستی کوٹلہ جو بجنور سے چھ سات کوس ہے چلے گئے مگر نواب نے سوار بھیجکر اُن کو وہاں سے بلایا مجبوراً اُن کو پھر بجنور میں آنا اور نواب سے ملنا پڑا اور ڈپٹی رحمت خاں بھی ہلدور سے آپہنچے۔ نواب کی خواہش تھی کہ یہ لوگ جب مجھ سے ملنے آئیں تو نذریں پیش کریں۔ مگر انھوں نے نذریں پیش نہیں کیں۔ نواب نے مکدر ہو کر اُن کو رخصت

کر دیا اور کہا کہ بدستور بجنور میں اپنا اپنا کام کرو۔ سرسید نے دیوانی کا کام اسی طرح
جس طرح کہ انگریزوں کے سامنے کرتے تھے کرنا شروع کیا جو روبکاریاں اور رپورٹیں
صاحب جج کے ہاں بھیجنے کے قابل ہوتی تھیں اُن کی نسبت علی الاعلان کچہری میں
یہ حکم تحریر کرتے رہے کہ بحضور صاحب جج بہادر بھیجی جائیں مطلب اس سے یہ
تھا کہ عوام کو یہ خیال ہو کہ سرکار انگریزی کا تسلط اور عملداری بدستور قائم ہے۔ مگر
محمود خاں کو یہ امر ناگوار گذرتا تھا۔ محمود خاں نے پھر ایک روز رات کے وقت سرسید
کو بلایا۔ اُس وقت نواب اور اس کا بھانجا جو اس کے مزاج پر بہت حاوی تھا دونوں
موجود تھے۔ انھوں نے سرسید سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں تم ہمارے ساتھ شریک
ہو جاؤ اور ہم سے اس بات پر حلف کر لو۔ جو جاگیر چاہو نسلاً بعد نسلٍ ہم سے ٹھہرا لو
اور ہم سے حلف لے لو کہ ہم ہمیشہ وہ جاگیر بحال رکھیں گے۔ سرسید کو اول تو جواب
دینے میں تامل ہوا، مگر آخر کار اُن سے صاف کہہ دیا کہ " میں اس بات پر بلاشبہ حلف
کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی
نہ کروں گا۔ لیکن اگر تمہارا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے لڑنے کا ہے
تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں " ۔ سرسید نے قسم یاد کر کے نواب سے
کہا کہ " میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں آپ اس ارادہ کو دل سے
نکال ڈالیں ۔ انگریزوں کی عملداری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام
ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں
کوئی عملداری نہ کر سکے گا۔ آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اگر بالفرض
انگریز جاتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں آپ کی نوابی کوئی نہیں چھینتا
اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو آپ خیر خواہ سرکار بنے رہیں گے اور سرکار آپ کی
نہایت قدر کرے گی۔ اگر آپ مجھ کو انتظام میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو صاحب

کلکٹر سے اجازت منگا لیجیے اور یہ اقرار کر لیجیے کہ کوئی کام جب تک کہ اُس کی منظوری صاحب کلکٹر سے نہ منگا لیں ہرگز نہ کریں گے۔" مگر نواب نے اُس کو منظور نہیں کیا۔ بلکہ وہ ناراض ہوا اور چیں بہ جبیں ہو کر سر سید کو رخصت کیا اور ہر طرح ان کی اور اُن کے ساتھیوں کی بُرائی کے درپے ہو گیا۔ جس مکان میں سر سید رہتے تھے اس کو بہ جبر چھین لیا اور اپنی فوج کے افسروں کو دے دیا۔ جو اسباب سر سید کا اس میں بند تھا وہ سب فوج کے افسروں نے لے لیا۔ اسی طرح میر تراب علی کا گھوڑا بہ جبر چھین لیا۔

انھیں دنوں میں ایک شخص میر خاں نامی مع جمعیت چار سو آدمی کے نگینے سے بجنور میں آیا اور سر سید میر تراب علی، ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے درپے ہوا اُن کو بہ جبر و تحکم طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر نہ ہوگے تو بہتر نہ ہوگا۔ سر سید اور میر تراب علی اُس کے پاس گئے۔ منیر خاں نے سر سید سے مسئلہ جہاد کے بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے نہایت سنجیدگی سے اُس کو سمجھایا کہ شرع کے بموجب ہرگز جہاد نہیں ہے۔ اُس نے اُن کو تو رخصت کیا اور مولوی علیم اللہ رئیس بجنور کے پاس خود جا کر یہی مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے بڑی دلیری سے اُس کے ساتھ گفتگو کی اور بہت سی دلیلوں سے اُس کو قائل کیا کہ مذہب کی رو سے جہاد نہیں ہے۔ اُس روز مولوی علیم اللہ قتل ہوتے ہوتے بچے۔ دوسرے دن منیر خاں وہاں سے دلی چلا گیا اور وہاں جا کر لڑائی میں مارا گیا۔

سر سید برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بجنور سے نکل کر میرٹھ پہنچ جائیں مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا اسی عرصہ میں ہلدور کے چودھریوں نے ایک انبوہ کثیر جمع کر کے محمود خاں کی فوج پر حملہ کیا اور نواب شکست کھا کر بجنور سے نجیب آباد چلا گیا۔ سر سید نے اُس کی مفصل کیفیت اسپیشل کمشنر میرٹھ کو لکھ بھیجی وہاں

سے حکم آ گیا کہ تم سرکار کی طرف سے ضلع کا انتظام کرو اور ڈپٹی رحمت خاں اور میر نواب علی کو اپنے ساتھ شریک کر لو۔ انھوں نے ایک مہینے تک بہت اچھا انتظام رکھا۔ مگر باوجود سخت ممانعت اور روک تھام کے ہلدور کے چودھری نے نگینے پر حملہ کر کے کچھ آدمی مار ڈالے اور کچھ محلے لوٹ لیے۔ اب نواب محمود خاں کے گرد پھر ایک جمعیت کثیر جمع ہو گئی۔ نواب نے بجنور پر حملہ کیا اور چودھری شکست کھا کر بھاگے۔ چونکہ سرسید کو نواب کی طرف سے خدشہ تھا وہ بھی ہلدور چلے گئے مگر نواب نے ہلدور پر بھی حملہ کیا اور چودھریوں کو شکست دے کر ہلدور کے بہت سے مکانات جلا دیے۔ سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں رات کو ہلدور سے پیادہ پا اس ارادہ سے نکلے کہ میرٹھ چلے جائیں۔ رستے میں موضع پلانہ کی سرحد پر دو ہزار گنوار مسلح ان کے لوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادے سے دوڑے۔ مگر بخشی نامی ایک پٹھان نے اُن کو بچایا۔ جب وہاں سے چاند پور پہنچے تو کئی ہزار آدمیوں نے بندوقوں اور ہتھیاروں سے اُن کو گھیر لیا۔ یہاں تک کہ میر صادق علی خاں رئیس چاند پور وہاں پہنچے اور سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں کو اس انبوہ سے نکال کر اپنے مکان پر لے گئے۔ دوسرے روز میر صادق علی نے خود ساتھ ہو کر ان کو موضع بجولنہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے سرسید نے بچھراؤں پہنچ کر بسبب علالت اور رستے کی کوفت کے چند روز مولوی محمود عالم کے مکان پر جو اُن کے دوست تھے، مقام کیا اور اپنی مفصل سرگذشت حکام انگریزی کو لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔ جس وقت وہ میرٹھ میں پہنچے ہیں اُن کے پاس چھ پیسے اور اُس پھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے۔ اور کچھ نہ تھا۔

میرٹھ میں اُن کے پہنچنے اور بیمار ہونے کا حال سُن کر مسٹر کری کرافٹ ولسن

جوکہ وہاں جج اور اسپیشل کمشنر تھے اُن کے دیکھنے کو آئے اور سر سید سے کہا کہ
"تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا
باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی، مگر جب تم کو احمد ڈپٹی
رحمت خاں کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور سرکار
کی نہایت طرفداری کے سبب تمام ہندوؤں نے جو ضلع میں نامی چودھری اور بڑے
رئیس تھے کمال خوشی اور آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے اوپر حاکم بننا قبول کیا
بلکہ خود درخواست کی کہ تمہیں سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنا کر جاؤ۔ سرکار
نے بھی تم کو اپنا خیرخواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع کی حکومت
تم کو سپرد کی اور تم اُسی طرح نمک حلال اور وفادار سرکار کے رہے۔ اس کے صلے
میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشتہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت
اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم ہے۔"

کچھ اوپر پانچ مہینے سر سید کو میرٹھ میں ٹھیرنا پڑا۔ میرٹھ میں اُن کو معلوم ہوا
کہ دلّی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے اُن کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا ہے۔
جب دلی میں سرکاری فوج پھیلنی شروع ہوئی اور کشمیری دروازہ فتح ہوچکا تو شہر
کے تمام زن و مرد شہر چھوڑ چھوڑ کر چل دیئے تھے اور سر سید کا کنبا بھی جب کہ
اُن کے ماموں وحید الدین خاں اور اُن کے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں سپاہیوں
کے ہاتھ سے مارے گئے۔ سلطان نظام الدین چلا گیا تھا۔ مگر اُن کی والدہ اور خالہ
دلی ہی میں رہیں۔ لیکن جب اُن کا گھر سارا لٹ گیا تو وہ حویلی کو چھوڑ کر جلو خانہ کی
ایک کوٹھری میں جہاں زین نامی ایک لاوارث بڑھیا رہتی تھی، چلی آئیں اور آٹھ دن
نہایت تکلیف سے اُس کوٹھری میں بسر کیے۔ اس عرصہ میں سر سید بھی وہاں
پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ تین اُن سے اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ کسی

قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اسی کو کھاتی رہیں۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور
پیاس کی نہایت تکلیف تھی۔ سر سید کہتے تھے کہ "جب میں نے کوٹھری کا دروازہ
کھٹکھٹایا اور آواز دی تو انھوں نے کواڑ کھولے اور پہلا لفظ جو ان کی زبان سے
نکلا وہ یہ تھا کہ "وہ ہے! تم یہاں کیوں چلے آئے! یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے
ہیں تم چلے جاؤ، ہم پر جو گذرے گی گذر جائے گی" میں نے کہا آپ خاطر جمع
رکھیے میرے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں سے اور
دلّی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ تب ان کی خاطر جمع ہوئی جب مجھے معلوم ہُوا
کہ دو دن سے پانی نہیں پیا تو پانی کی تلاش کو نکلا۔ کنوؤں پر کوئی ایسی چیز نہ ملی جس
سے پانی نکالا جا سکے اور چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا میں سیدھا پھر قلعہ میں
گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے پاس پہنچا
تو دیکھا کہ وہی زمین بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور
آبخورہ ہے اور کسی قدر بد حواس ہے۔ وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی تھوڑی
دور چل کر بیٹھ گئی۔ پھر اُٹھا نہ گیا میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا کہ پانی
پی لے۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی اپنی صراحی میں ڈالا اور کچھ
گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مطلب یہ تھا کہ بیوی پیاسی ہیں ان
کے لیے پانی لیجاؤں گی اور اسی لیے صراحی میں پانی ڈالا تھا۔ میں نے کہا میرے
پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے۔ پھر آبخورہ میں پانی دیا وہ پانی پی کر لیٹ گئی
میں دوڑا ہوا گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انھوں نے
خدا کا شکر کیا۔ میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ
کو میرٹھ لیجاؤں باہر آ کر کیا دیکھتا ہوں کہ زمین مری پڑی ہے۔ پھر سارے شہر
میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے کہیں سواری نہ ملی۔ آخر قلعہ کے حکام

نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لیجاتی ہے وہ ان کو ملجاتے ہیں وہ شکرم لے کر گھر آیا اور والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر میرٹھ لے گیا۔"

میرٹھ میں منشی الطاف حسین مرحوم سررشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو سرسید کے قدیم دوست تھے اُن کے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ سرسید کی والدہ کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے صفرا کا بہت غلبہ ہوگیا تھا۔ کوئی دوا یا غذا پچتی نہ تھی۔ آخر کچھ دن بیمار رہ کر یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ کو میرٹھ ہی میں انتقال کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "اُن کے انتقال سے چند روز پہلے تمام کنبے کی عورتیں اور مرد اور بچے جو مختلف مقامات میں تھے سب اُن کے پاس میرٹھ میں جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ مرتے وقت بہت خوش تھیں۔"

الغرض ۱۶۔ فروری ۱۸۵۸ء کو سکرٹری گورنمنٹ کی چٹھی مسٹر شکسپیر کے نام پہنچی کہ تم مع عملۂ ضلع بجنور رڑکی کو روانہ ہوجاؤ اور رڑکی میں انتظام روہیلکھنڈ کے لیے فوج کے لام باندھنے کا حکم بھیجا گیا۔ چنانچہ مسٹر شکسپیر اس فوج کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ سرسید اور تمام عملہ جو وہاں موجود تھا اور چند رئیسان ضلع بجنور سب اُن کے ہمراہ گئے۔

بجنور سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جیسا کہ اوپر مذکور ہوا بہت لڑائیاں اور خانہ جنگیاں ہوئی تھیں۔ کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیے اور کبھی مسلمانوں نے ہندوؤں پر اور آخر کو محمود خاں سب پر غالب آگیا تھا۔ اس لیے کچھ ہندو رئیس نواب سے شکست کھا کر میرٹھ چلے آئے تھے اور کچھ نواب نے قید کر لیے تھے۔ پس جب انگریزی فوج رڑکی میں پہنچ لی اور روہیلکھنڈ پر چڑھائی کرنے کو تیار ہوئی تو وہاں یہ بحث پیش آئی کہ ضلع بجنور میں جو کہ روہیلکھنڈ کا سب سے پہلا ضلع ہے اور جہاں سب سے پہلے فوج جانے والی ہے۔

کون لوگ باغی تصور کیے جائیں مسلمانوں کی نسبت اس وقت نہ تو حکام ضلع کا خیال اچھا تھا اور نہ افسرانِ فوج کا اور ہندو رئیس جنھوں نے مسلمانوں سے شکست پائی تھی اور جو اپنی باہمی خانہ جنگیوں کو سرکار کی خیر خواہی کے لباس میں ظاہر کرنا چاہتے تھے اور اُن میں سے کسی قدر وہاں موجود بھی تھے، وہ چاہتے تھے کہ جو لوگ مسلمانوں کے اُن حملوں میں شریک تھے جو اُنھوں نے ہندو رئیسوں پر کیے وہ سب باغی قرار دیئے جائیں۔ اگر اس وقت یہی فیصلہ ہو جاتا تو ضلع بجنور خاک سیاہ اور مسلمانوں سے خالی ہو جاتا۔

سرسید نے مسٹر شکسپیر اور بعض افسرانِ فوج سے اس باب میں گفتگو کی اور کہا کہ سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہییں جو آپ سرکار سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کیے قانون کی رو سے اُن کی نسبت جو کچھ ہو سو ہو مگر اُن کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلہ میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک بر وقت داخل ہونے سرکاری فوج کے اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار دینا نہیں چاہیے۔ اس پر بہت بحث ہوئی اور آخر یہ بات قرار پا گئی کہ جو لوگ سرکاری فوج کے مقابلہ میں آئیں وہی باغی قرار دیے جائیں۔ لیکن بد نصیبی سے آم سوت نجیب آباد اور نگینے پر احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں وغیرہ نے خفیف خفیف مقابلے کر کے ہزاروں کو لڑائی میں قتل کرایا اور تمام ضلع کی طرف سے سرکاری افسروں کو بدظن کر دیا۔

اگرچہ جو لوگ ضلع بجنور میں اپنی بغاوت کا پورا پورا ثبوت دے چکے تھے اور سرکار سے کھلّم کھلا بے وفائی کر چکے تھے، سرسید نے اُن کی حمایت ہرگز نہیں

کی لیکن جو لوگ کسی مجبوری یا دباؤ کے سبب باغیوں کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لیے مجرم ٹھیر گئے تھے، یا جنھوں نے آپس کی خانہ جنگیوں میں کسی گروہ کا ساتھ دیا تھا مگر وہ کسی گروہ کو سرکار کے برخلاف نہیں سمجھتے تھے، یا جن لوگوں نے سرسید کو ذاتی طور پر تکلیف پہنچائی تھی اور سرکار کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی، جہاں تک ممکن ہوا ان کی برتیت میں کوشش کی اور ان کی صفائی کرائی۔

ایک تحریر[1] میں جو نواب محسن الملک نے لکھوائی اور مولانا نذیر احمد نے جو خاص بجنور کے رئیس ہیں اپنے قلم سے لکھی اور جو کہ گویا ان دونوں نامور اور معزز شخصوں کے خیالات کا مجموعہ ہے اس میں سے ہم ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں۔

"سید احمد خاں کو سرکار انگریزی کی طرف سے ضلع بجنور کا نظم و نسق سپرد تھا اور وہاں کے ہندو مسلمانوں کی خانہ جنگیاں یادگار غدر ہیں۔ اس عموم بے تمیزی میں خود سید احمد خاں کے ساتھ بھی لوگ نہایت درجہ کی گستاخی اور بے توقیری سے پیش آئے اور قریب تھا کہ ہلاک کریں عود تسلط کے بعد اُس ضلع کے تمام باشندوں کی جان سید احمد خاں کی مٹھی میں تھی اگر ان کے سے اختیارات کسی دوسرے کو ہوتے تو بجنور کے حصہ میں قیامت آگئی ہوتی۔ مگر یہ معاملہ فہم منصف مزاج، نرم دل، نیک طینت آدمی اس وقت بھی فرق کرتا تھا بغاوت اور خانہ جنگیوں میں، مخالفت

---

[1] آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں نے ۱۸۹۸ء میں سرسید کی یادگار قائم کرنے کیلیے ایک خط نواب محسن الملک کے نام حیدرآباد بھیجا تھا اُس زمانے میں محسن الملک بیمار تھے انھوں نے شمس العلما مولوی نذیر احمد سے اس کا جواب لکھوا کر بھیجا تھا جو علیگڑھ گزٹ میں چھپ گیا تھا۔ اس تحریر میں سرسید کی نسبت دونوں کے خیالات مندرج ہیں ۱۲۔

اور جہالت میں، حملہ اور حفاظت میں۔ اور سید احمد خاں کی بدولت بجنور ہی ایک ضلع تھا جو عواقب[1] و تبعات غدر سے محفوظ رہا۔"

سرسید کی رائے جو اُس وقت عام رعایائے ضلع بجنور کی نسبت تھی اور جس پر حکام ضلع کو پورا بھروسا تھا وہ تاریخ سرکشی بجنور میں انھوں نے صاف صاف لکھدی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ضلع کے لوگوں کا میری رائے میں یہ حال تھا کہ اُن لڑائیوں میں نواب کے ساتھ ہوکر چودھریوں سے لڑنے کو سرکار سے لڑنا یا برخلاف سرکار کے لڑائی کرنی نہیں سمجھتے تھے۔ سب کے خیال میں چودھریوں کا اور نواب کا مقابلہ تھا جس میں گویا سرکار کا بیچ میں سے علیحدہ تھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ جو لوگ چودھری صاحبوں کے ساتھ ان لڑائیوں میں شریک تھے وہ اپنے تئیں چودھری صاحبوں کا حامی سمجھتے تھے سرکار انگریزی سب کے دلوں سے الگ تھی۔" سرسید ہی کی رائے کا یہ نتیجہ تھا کہ امن ہو جانے کے بعد ضلع کے عام باشندوں سے بہت کم مواخذہ کیا گیا۔

## خدمات غدر کا صلہ

جو شخص سرسید کی طبیعت اور جبلت سے واقف ہوگا وہ اس بات کو بآسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی خیرخواہی اور وفاداری

---

[1] عواقب و تبعات غدر سے وہ بد نتائج مراد ہیں جو اکثر اضلاع ہندوستان میں انگریزی تسلط کے بعد باشندگان اضلاع کو بھگتنے پڑے کیونکہ بجنور میں سوا اُن لوگوں کے جو باہم خانہ جنگیوں میں یا سرکاری فوج کے مقابلہ میں مارے گئے۔ فتح کے بعد فوراً بغاوت کے جرم میں سزایاب ہوئے۔ پھر بہت ہی کم لوگوں سے تعرض کیا گیا ۱۲۔

اُن سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اُس نازک وقت میں اُن سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا مگر گورنمنٹ نے خود انکی خدمات کی قدر کی اور اُن کے صلہ میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولیٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔

میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان چاند پور ضلع بجنور کا تعلقہ اِس جرم میں کہ اُن کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کر لیا تھا۔ اور جس طرح کہ دیگر خیرخواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئی تھیں مسٹر شکسپیئر رپورٹ کرنی چاہتے تھے کہ مجملہ تعلقہ چاند پور کے ایک معقول جائداد سید احمد خاں کو بعوض خدمات ایام غدر کے ملنی چاہیے۔ مگر جب انھوں نے سرسید سے اس بات میں استمزاج لیا تو انھوں نے اُس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ مسٹر شکسپیئر نے اس قاعدے کے موافق کہ کسی کو اُس کی نصف تنخواہ سے زیادہ پنشن نہیں مل سکتی تھی سرسید سے کہا کہ نقد پنشن بہت قلیل مقرر ہوگی انھوں نے کہا جو کچھ سرکار عنایت کرے اس کا احسان ہے۔ مگر مجھ کو یہ جائداد لینی ہرگز منظور نہیں۔ اس واقعہ کو اُسی تحریر میں جو نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد نے حیدرآباد میں لکھی تھی۔ اس طرح بیان کیا ہے کہ "سید احمد خاں کو حسن خدمات غدر کے صلہ میں ضلع بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا تجویز کیا تھا۔ مگر سید احمد خاں نے صرف اسی وجہ سے اُس کے لینے سے انکار کیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی اُن کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔"

خود سرسید نے بھی اپنے ایک لکچر میں جو ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل

کانفرنس کے جلسہ میں مدرسۃ العلوم کے تاریخی حالات پر دیا تھا اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ "غدر میں جو حال انگریزوں اور اُن کے بچوں اور عورتوں پر گذرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ مجھکو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اُس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اُس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے[1] کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اُس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپیگی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اُس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مرادآباد میں آیا جو ایک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اُس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اس

---

[1] غدر کے بعد سرسید کا ارادہ مصمم ہوگیا تھا کہ پنشن لے کر مصر میں جا کر سکونت اختیار کریں ۱۲۔

کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

# مراد آباد کی تبدیلی

اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ بجنور سے صدرالصدوری کے عہدہ پر ترقی پاکر مراد آباد گئے اور ۱۸۵۹ء میں وہیں جب کہ باغیوں کی جائداد مضبطہ کے متعلق غدر داریاں ہونے لگیں اور اُن کی سماعت اور تحقیقات کے لیے ایک اسپیشل کمیشن بیٹھا اُس میں دو یورپین ممبر ایک کمشنر روہیلکھنڈ، دوسرے جج مراد آباد اور ایک ہندوستانی ممبر یعنی سر سید مقرر ہوئے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے۔

گورنمنٹ نے یہ نہایت دانائی کی تھی کہ اکثر اضلاع میں مضبط جائداد کی تحقیقات کے لیے جو اسپیشل کمیشن مقرر کیے گئے تھے اُن میں یورپین افسروں کے ساتھ ایک ایک ہندوستانی ممبر بھی شامل کر دیا تھا کیونکہ جائدادیں اکثر ادنیٰ ادنیٰ شُبہ پر ضبط ہوگئی تھیں اور انگریزی حکام نیچرل طور پر ہندوستانیوں کی طرف سے عموماً بدگمان اور نہایت غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے خصوصاً ضلع مراد آباد پر گورنمنٹ کا سخت عتاب تھا اور انگریزی افسروں کا یہاں اعتدال پر رہنا دشوار تھا۔ اگرچہ سر سید نے اپنی زبان سے کمیشن مذکور کی کارروائی کے متعلق کبھی ہمارے سامنے کچھ بیان نہیں کیا لیکن مراد آباد کے معتبر اشخاص سے سُنا گیا ہے کہ سر سید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے غدر داریوں کی تحقیقات نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی اور صوبہ شمال مغرب میں ضبط شدہ

جائدادیں جس قدر ضلع مراد آباد میں واگذاشت ہوئیں ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں

ایک بہت بڑا فائدہ سرسید کے مراد آباد میں ہونے سے خاصکر مسلمانوں کو یہ پہنچا کہ مولانا عالم علی مرحوم رئیس مراد آباد، جو روہیلکھنڈ کے ایک مشہور عالم اور طبیب اور نامور محدث تھے انھوں نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا. مگر اتفاق سے باغی سپاہیوں کو خبر ہوگئی. اور انھوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس کر ان سب کو قتل کر ڈالا، مولانا موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثۂ عظیم ان کے مکان میں گذرا تھا اور اُن کا کوئی عزیز یا رشتہ دار اُن مظلوموں کے ساتھ نہیں مارا گیا تھا، سرکاری تسلط کے وقت مراد آباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام ضلع کو اُن کی تلاش درپیش تھی. اور اُن کی نسبت یہ گمان تھا کہ باغیوں کے ساتھ اُن کی ضرور سازش تھی ورنہ اُن کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے مگر سرسید کو معلوم ہوگیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بے قصور تھے اور انھوں نے نہایت نیک نیتی سے یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا. وہ یہ بھی جانتے تھے کہ باغیوں کو مولوی صاحب سے کوئی وجہ عداوت کی نہ تھی کہ وہ ان کو یا انکے رشتہ داروں کو بھی مار ڈالتے اور خود اُن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ کا مقابلہ کرتے. چنانچہ سرسید نے مولوی صاحب کی بریت کے لیے صاحب ضلع سے. باوجودیکہ وہ نہایت افروختہ تھے. بڑی دلیری کے ساتھ گفتگو کی اور یہ کہا کہ میں مولوی عالم علی کو آپ کے سامنے حاضر کرسکتا ہوں لیکن جب تک کہ آپ یہ وعدہ نہ کریں کہ اُن سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائے گا اُس وقت تک میں اُن کے بلانے کی جرأت نہیں کرسکتا. آخر صاحب ضلع نے اُن سے یہ وعدہ کر لیا کہ ہم ضابطہ کی تحقیقات تو ضرور کریں گے. لیکن چونکہ تمھارے نزدیک وہ

بے قصور ہیں بعد ضابطہ کی کارروائی کے اُن کو بری کر دیا جائے گا. چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سرسید نے مولوی صاحب کو بُلا کر عدالت میں پیش کر دیا اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بری کر دیئے گئے.

# تاریخ سرکشی بجنور

مراد آباد ہی میں آ کر سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور چھاپ کر شائع کی. اس تاریخ میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات اور واقعات غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بقید تاریخ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں. تمام خط کتابت جو کہ وہ حکام ضلع کے ساتھ رُڑکی میں کرتے تھے اور وہ تمام تحریریں جو انھوں نے نواب محمود خاں اور چودھریوں کے نام یا نواب اور چودھریاں نے اُن کے نام یا آپس میں ایک دوسرے کے نام بھیجیں اور اُس کے سوا اور بہت سی تحریرات جو اس معاملہ سے تعلق رکھتی تھیں، لفظ بہ لفظ اس کتاب میں درج ہیں. اُن میں سے بہت سی تحریریں اور اکثر یادداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ابتدا سے اخیر تک اس کتاب کے لیے میٹریل جمع کرتے رہے تھے. ایسی حالت میں جب کہ جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے. انگریزی عملداری بالکل اُٹھ گئی تھی، لوگوں کے گھر بار لٹ رہے تھے اور خود سرسید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے. وہ ان کاغذات اور یادداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے. اس سے دو باتیں بخوبی ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ انگریزی عملداری کے پھر قائم ہو جانے کا اُن کو کامل یقین تھا. دوسرے یہ کہ ضلع کی اُس خوفناک حالت میں بدحواسی یا خوف و ہراس نے اُن کی طبیعت میں مطلق راہ نہیں پائی۔ اس کتاب میں غدر کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے۔

بلا رو و رعایت اور بے کم وکاست لکھے گئے ہیں جن مسلمانوں نے باوجود متواتر فہمائشوں اور نصیحتوں اور تمام نشیب و فراز سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ کے احسانات کے سرکار سے بیوفائی کی تھی اور اس سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئے تھے ان کے حالات جوں کے توں بیان کر دیئے ہیں اور باوجودیکہ ہندو چودھریوں یا ان کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں، اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے بری تھے اس لیے اس الزام سے ان کی تبریت کی ہے مگر جو کچھ انھوں نے مسلمانوں پر تشدد اور سختیاں کی تھیں، ان کو بھی اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ غرض کہ واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو مطلق دخل نہیں دیا۔

## مدرسۂ مراد آباد

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم کیا جہاں اس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا، کچھ دنوں یہ مدرسہ بدستور اپنی حالت پر رہا مگر جب کہ اسٹریچی صاحب وہاں کلکٹر ہو کر آئے اور انھوں نے ایک تحصیلی مدرسہ قائم کیا اسی تحصیلی مدرسہ میں اس فارسی مدرسہ کے طلبہ بھی داخل ہو گئے

## رائے در باب تعلیم

انھیں دنوں میں انھوں نے ایک رائے تعلیم کے باب میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ کر شائع کی جس میں گورنمنٹ کے ورنیکلر سکولوں پر سخت اعتراض تھا اور ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا سرکار کو مشورہ دیا تھا۔ ہم اس مضمون میں سے دو تین فقرے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"گذشتہ چند سالوں سے گورنمنٹ نے جو انتظام رعایائے ہندوستان کی تعلیم کا کیا ہے سب سے اول اس میں یہ بات قابل لحاظ کے ہے کہ آیا فی نفسہٖ وہ انتظام ایسا ہے نہیں ! کہ رعایا کا اُس سے ناراض ہونا اور خواہ مخواہ بدگمانی کرنا ضرور ہو۔ ہماری رائے یہ ہے۔ کہ بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ جب کسی قوم کی تربیت کا ارادہ کیا جائے۔ تو جو اس قوم کی زبان ہے اُس میں اُس کی تربیت ہو تو بہت آسان ہوگی اور دوسری زبان کے لغت اور محاورے سیکھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بچے گا۔ بظاہر اس کی نظیریں بھی موجود تھیں کیونکہ تمام اہلِ یورپ اور اہل عرب نے اپنی ہی زبانوں میں علم سیکھے ہیں۔ مگر یہ رائے غلط تھی۔ کُل زبانوں پر ایسا خیال کر لینا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ہم کو چاہیے کہ اس بات پر بھی غور کریں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم چاہتے ہیں آیا اُس زبان کی حالت ایسی ہے یا نہیں کہ اُس زبان میں تعلیم کا ہونا ممکن ہو۔"

"ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اُس کی عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو تا کہ جو امور پیش آئیں اُن کے سمجھنے کی، بُرائی بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرت الٰہی پر فکر کرنے کی اُس کو طاقت ہو، اُس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امور معاد پر غور کرے گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ "ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں۔ بلکہ ہم اُسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر"، نہایت بیجا ہے۔"

"سررشتہ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے وہ تربیت کے لیے ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیتِ اہلِ ہند کا ہے اردو زبان جس کے وسیلہ سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے اُس کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو۔ کیونکہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں اُس زبان کی نسبت ہم کو اول یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں؟ کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہٖ اس قابل ہے یا نہیں کہ اُس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں؛ کیونکہ پہلی بات کا تو علاج ہو سکتا ہے مگر دوسری بات لاعلاج ہے۔ تیسرے یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اُس میں علوم پڑھنے سے جودتِ طبع، حدّتِ ذہن، سلامتِ فکر، ملکۂ عالی قوتِ ناطقہ، پختگی تقریر اور ترتیبِ دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؛ ان تینوں باتوں میں سے اُردو زبان میں کوئی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقۂ تعلیم کو جو درحقیقت تربیتِ انسان کو خراب کرنے والا اور خود بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے۔ بالکل بدل دے اور اُس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے وہ حاصل ہو۔"

"میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسہ اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے جاتی رہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی

زبان کے وسیلہ سے تربیت کرتی ہے اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی
ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔"

یہاں ان فقروں کے نقل کرنے سے ہمارا صرف یہ مدعا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انگریزی زبان کی تعلیم کو دیسی زبان کی تعلیم پر ترجیح دینے کی نسبت جو کچھ سرسید کی رائے اس زمانے میں تھی یہی رائے اب سے ۲۶ برس پہلے تھی۔ مگر ۲۶ برس کے تجربے سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔

# رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان

مراد آباد ہی میں سرسید نے گورنمنٹ کی، ملک کی اور خاص کر اپنی قوم کی وہ جلیل القدر خدمت انجام دی جو ان کے اور بڑے بڑے کاموں کی طرح ہمیشہ یادگار رہے گی۔ وہ بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھ کر آئے تھے جب مراد آباد میں پہنچے تو ان کی تباہی و بربادی کا اور بھی زیادہ عبرت انگیز نقشہ ان کی نظر سے گذرا جس سے ایک اور چوٹ ان کے دل پر لگی۔ گورنمنٹ کا غصہ خاصکر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا۔ ہندوستانی خیر خواہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کر بدلے رہے تھے اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے۔ مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت درکار نہ تھا۔ ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ٹھیرانے کے لیے کافی تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ بے قاعدہ رعایت یا ہمدردی کرنا سرکاری عہدیداروں کی قدرت سے باہر تھا۔ اس لیے سرسید اپنے منصب کے لحاظ سے کوئی سلوک ان کے ساتھ نہیں

کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان کے مراد آباد میں آنے سے کسی قدر ان ناگفتہ بہ بے اعتدالیوں کا انسداد ہوا جو خاص مراد آباد میں بعض ناخدا ترس لوگ سرکار کی خیر خواہی کے پردے میں کرتے تھے کیونکہ حسن اتفاق سے اُنھیں دنوں میں اسٹریچی صاحب مراد آباد کے کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو گئے تھے اور اُن کو سرسید کی رائے اور مشورہ پر پورا اعتماد تھا۔ مگر سرسید اسی پر قانع نہ تھے بلکہ وہ اس فکر میں تھے کہ انگریزوں کے دل میں جو غلطی سے ایک عام بدگمانی تمام ہندستان کے مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے وہ کس طرح رفع کی جائے۔

زمانہ نہایت نازک تھا، خیالات ظاہر کرنے کی آزادی مطلق نہ تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی۔ جو شخص گورنمنٹ کا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کر لیا گیا ہو اس کو ایسا کام کرنا جس سے اچھے دل بُرے ہوں اور بھی زیادہ دشوار تھا۔ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو اپنا مخالف خیال کر لیا تھا اور ایسا خیال کرنے کے اسباب پہلے ہی سے موجود تھے۔ انگریز ہندوستانیوں کی عادت، طبیعت اور طرز خیالات سے ناواقف تھے، ملک کی حکومت اُنھوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور انھیں کو وہ اپنا حریف اور سلطنت کا مدعی سمجھتے تھے اور بدقسمتی سے بقول سرسید کے بھس میں بھری ہوئی مردہ کھال دلی میں موجود تھی۔ مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی شہرت تھی اور ان تمام باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ انگریزوں کی غلط فہمی کے شکار ہو جائیں۔

سرسید کو اس بات کا دل سے یقین تھا کہ انگریزوں نے بغاوت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ انگریزوں کا یہ سمجھنا کہ غدر ایک ملکی بغاوت تھی اور اُس کی بنیاد انگلش گورنمنٹ کی حکومت اٹھا دینے کے لیے کسی سازش پر تھی، محض غلط ہے۔ اور اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک کے

ساتھ اس طرح پیش آئے کہ جیسے باغی ملک کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ اُن کے نزدیک نہ یہ ملکی بغاوت تھی نہ کسی قسم کی سازش بلکہ صرف سپاہیوں کی عدول حکمی تھی وہ بھی نہ بہ ارادۂ بغاوت کے بلکہ بسبب جہالت اور مذہبی توہمات کے۔ چنانچہ سر ولیم گئے نے بھی جو غدر کے بعد انڈیا آفس میں انڈر سکرٹری تھے۔ نہایت انصاف سے اس ہنگامہ کو "سیپائے وار" سے تعبیر کیا ہے۔ نہ ملکی بغاوت سے اور لارڈ لارنس نے بھی آخر کو یہی فیصلہ کیا کہ صرف کارتوس کے سبب سے سپاہیوں کا ایک ہنگامہ تھا نہ کوئی عام سازش تھی نہ ملکی بغاوت۔

اسی بنا پر انھوں نے مراد آباد میں آکر اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایائے ہندوستان کو اور خاصکر مسلمانوں کو جن پر سارا نچوڑا انگریزوں کی بدگمانی کا تھا بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے۔ اور اس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ پوست کندہ بیان کیے ہیں۔ اور جو اسباب کو عموماً انگریزوں کے ذہن میں جاگزیں تھے اُن کی تردید کی ہے اور اُن کو غلط بتایا ہے۔

یہ رسالہ غالباً انھوں نے مراد آباد میں پہنچتے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے ختم ہونے کے بعد بغیر اس کے کہ اُس کا انگریزی میں ترجمہ کرائیں اُردو ہی میں اس کو مطبع مفصلیٹ گزٹ آگرہ میں چھپنے کو بھیجدیا اور ۱۸۵۹ء میں اُس کی پانسو جلدیں چھپ کر اُن کے پاس پہنچ گئیں جب سرسید نے ان کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو اُن کے دوست مانع آئے اور ماسٹر رامچندر کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اُس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید کے نہایت دوست تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرض خطر میں نہ ڈالو۔ سرسید نے کہا "میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیرخواہی سمجھتا ہوں

پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے. رائے شنکر داس نے جب سر سید کی آمادگی بدرجۂ غایت دیکھی اور اُن کے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش رہے. سر سید نے اول تو دو رکعتیں بطور نفل کے ادا کیں اور دعا مانگی اور اُسی وقت کچھ کم پانسو جلدوں کا ایک پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیجدی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں.

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹر فریر نے جو کونسل میں ممبر تھے اس کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا. مگر مسٹر سسل بیڈن نے جو اُس وقت فارن سکرٹری تھے اُس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ " اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے " لیکن چونکہ اور کوئی ممبر اُن کا ہم رائے نہ تھا اس لیے اُن کی اسپیچ سے کوئی مضر نتیجہ پیدا نہیں ہوا.

مگر ۱۸۶۰ء میں جب کہ لارڈ کیننگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سر سید بھی اُس دربار میں بلائے گئے تو وہاں ایک موقع پر مسٹر سسل بیڈن فارن سکرٹری گورنمنٹ انڈیا سے مڈ بھیڑ ہو گئی جب اُن کو معلوم ہوا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے اور اسی نے اسباب بغاوت پر وہ مضمون لکھا ہے تو سر سید دوسرے روز علیحدہ مل کر اپنی نہایت رنجش ظاہر کی اور بہت دیر تک تلخ گفتگو ہوتی رہی. انھوں نے کہا کہ " اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے. سر سید نے کہا " میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں

اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو جلدیں ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے۔ میں جانتا تھا کہ آج کل بسبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اس لیے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں۔ اس لیے جس طرح میں نے اُس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا، صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے۔ اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں ملجائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔" مسٹر بیڈن کو اس بات کا یقین نہ آیا اور اُنھوں نے کئی بار سرسید سے پوچھا کہ کیا فی الواقع اُس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں شائع نہیں ہوا۔ جب اُن کا اطمینان ہوگیا پھر اُنھوں نے اُس کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ اور اُس کے بعد ہمیشہ سرسید کے دوست اور حامی و مددگار رہے۔

اس کتاب کے سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے۔ انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہوا اور اُس پر متعدد دفعہ بحثیں ہوئیں۔ گورنمنٹ انڈیا میں بھی اُس کا ترجمہ کرایا گیا پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا، مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شائع نہیں کیا گیا۔ لیکن اُسی زمانے میں ایک مدبر حاکم نے اشاعت کی نظر سے اُس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا جس کو کرنل گراہم نے جو سرسید کے بڑے دوست ہیں، پورا کیا اور ۱۸۷۳ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس کتاب کی نسبت مدبران سلطنت وغیرہ کی رائیں اور جو نتائج اُس سے پیدا ہوئے وہ دوسرے حصہ میں لکھے جائیں گے۔ چونکہ یہ رسالہ آج تک عام طور پر شائع نہیں ہوا اور نہ اُمید ہے کہ آیندہ شائع ہو اس لیے ہم نے رسالہ کو بجنسہ بطور ضمیمہ کے کتاب کے آخر میں ملحق کر دیا ہے کیونکہ جس قدر اس تحریر سے سرسید کا ایک عمدہ مدبر سلطنت اور ملک اور گورنمنٹ کا خیر خواہ ہونا ثابت ہوتا ہے اُس سے زیادہ گورنمنٹ کی حق پسندی، انصاف اور فراخ حوصلگی کا ثبوت ملتا ہے جس سے اُس غیظ و غضب اور ناراضی کے زمانے میں نہایت ٹھنڈے دل

سے شکایتوں کو سُنا، اُن پر غور کیا اور جو شکایتیں اور اعتراض صحیح معلوم ہوئے اُن کا فوراً تدارک کیا۔

# ملکۂ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ ادا کرنا

سرسید ابھی اپنی کتاب اسباب بغاوت ختم کرنے نہیں پائے تھے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار معافی اور امن وامان کا مشتہر ہوا۔ اس اشتہار کے مشتہر ہونے پر سرسید نے مراد آباد کے مسلمانوں کو مطلع کیا کہ ملکۂ معظمہ کی اس عنایت و مہربانی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ تمام مسلمانوں نے بہت خوشی سے قبول کیا اور اس غرض کے لیے سب کا ایک جگہ جمع ہونا قرار پایا۔ شہر کے متصل ایک مشہور درگاہ شاہ بلاقی صاحب کی ہے اس کام کے لیے وہ جگہ تجویز ہوئی۔ شہر کے مسلمانوں نے آپس میں چندہ کیا اور ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء کو قریب پندرہ ہزار مسلمانوں کے وہاں جمع ہوئے۔ غریبوں اور مسکینوں کو عمدہ کھانا تقسیم کیا گیا۔ عصر کے وقت سب لوگوں نے شاہ بلاقی صاحب کی مسجد میں نماز پڑھی۔ نمازیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ مسجد کے باہر میدان تک صفیں کھڑی ہوئی تھیں۔

نماز کے بعد سرسید نے صحن مسجد میں ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر اُردو زبان میں ایک مناجات پڑھی جس میں نہ شاندار الفاظ ہیں نہ رنگینی ہے نہ تصنع ہے۔ محض سیدھے سادے الفاظ اور بے ساختہ جملے ہیں، مگر اُس کے ہر جملے اور ہر فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے اس شخص کے دل میں ایک عجیب بے چینی پیدا کر رکھی تھی جو کسی طرح کم نہ ہوتی تھی بلکہ روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی اور گویا اس بات کی خبر دیتی تھی کہ وہ سرسید کو اخیر دم تک اس چینک سے خالی نہ رہنے دے گی۔ ہم کو مناسب معلوم ہوتا

ہے کہ اُس مناجات کو بجنسہ اس مقام پر نقل کر دیا کیونکہ اُس کے الفاظ سے سرسید کے دل کی اصلی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

# مناجات

"اے خدا تو ہمارا حقیقی پروردگار ہے۔ اے خدا اصلی بادشاہت اور حقیقی سلطنت تجھی کو سزاوار ہے۔ اے خدا مالک الملک تو ہی ہے جس کو تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو تو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے اے خدا سارا عالم اور تمام مخلوقات کی جانیں اور سب آدمیوں کے دل تیرے ہاتھ میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے اُن کو پھیرتا ہے اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ تیرا کوئی کام حکمت اور رحمت سے خالی نہیں تیرے کام میں کسی کو چون و چرا کی قدرت نہیں۔ اے خدا ہم تیرے عاجز بندے سراسر تیرے گنہگار ہیں۔ اے خدا ہماری شامت اعمال نے ہم کو گناہ کے دریا میں سر تک ڈبو دیا ہے اے خدا ہم تیرے ہر وقت تقصیروار ہیں۔ جب تک تیری مدد نہ ہو ایک دم گناہ سے پاک نہیں رہ سکتے۔ اے خدا تیرے سوا کوئی ہمارے گناہ بخشنے والا نہیں اے خدا تیرے سوا ہم گناہ کے دریا میں ڈوبے ہوؤں کا کوئی تِرانے والا نہیں۔ ہم نہایت عاجزی اور کمال انکسار سے اپنے گناہوں کی معافی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے تجھ سے چاہتے ہیں۔ اے خدا تیرے غضب سے تیری رحمت سبقت لے گئی ہے اپنی رحمت کاملہ سے ہمارے گناہ معاف کر اے خدا جس طرح تیری حکمت سے میلا کپڑا میل سے پاک ہوتا ہے اسی طرح ہم کو ہمارے گناہوں کی

ناپاکی سے پاک کر اے خدا اپنی بے انتہا رحمت سے ہمارے دل کو تمام برائیوں اور تمام ناپاک چیزوں سے جو دل کو ناپاک کرتی ہیں صاف کر۔ اے خدا ہمارے دل کے گناہوں کو مٹا اور ہماری روح کو روح القدس کی تائید سے قوی کر تیرے سوا ہمارا حقیقی ماوا اور اصلی ملجا اور کوئی نہیں آمین !

الٰہی ہمارے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تھے۔ الٰہی ہماری شامت اعمال کی کچھ انتہا نہیں رہی تھی۔ اگرچہ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہر ایک کے اعمال کی سزا اور جزا کا ایک دن بیشک آنے والا ہے۔ جس کا تو نے اپنے سچے نبیوں کی کتابوں میں وعدہ کیا ہے اور اس دن تیری رحمت اور تیرے فضل کے سوا کسی کا چھٹکارا نہیں کیونکہ تیرے آگے سب گنہگار ہیں، مگر ان پچھلے دو تین برسوں میں جو تیری نگاہ قہر آلود تیرے عاجز بندوں کی طرف ہوئی وہ بیشک ہماری شامت اعمال کا ظاہری نتیجہ تھا۔ الٰہی ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ الٰہی اپنے گناہوں کی تجھ سے معافی چاہتے ہیں۔ الٰہی تو ہمارے گناہ سب معاف کر آمین !

الٰہی یہ پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسا گذرا کہ انسان اور حیوان تمام چرند و پرند بلکہ شجر و حجر کسی کو چین اور آرام نہ تھا۔ کوئی شخص اپنی جان و مال و آبرو پر مطمئن نہ تھا ان پچھلے فسادوں نے زمین و آسمان کو گویا الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ الٰہی تو نے اپنے فضل و کرم سے ان تمام فسادوں اور آفتوں کو دور کیا۔ الٰہی تو نے پھر اپنے عاجز بندوں پر رحم کیا اور جو امن و آسایش ان بدبخت برسوں سے پہلے تو نے اپنے بندوں کو دی تھی پھر وہی امن و آسائش تو نے اپنے

بندوں کو نصیب کی. آلٰہی تیرے اس رحم کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں، آلٰہی تو ہمارے اس شکرانہ کو جو تیری درگاہ کے لائق نہیں ہے اپنے فضل و کرم سے قبول کر. آمین !

آلٰہی تیرا ایک بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے. سو برس تک تو نے اپنے اِن بندوں کو جن کو تو نے خطۂ ہندوستان میں جگہ دی ہے اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا. پچھلے کم بخت برسوں میں جو بسبب نہ ہونے ان حاکموں کے ہماری شامت اعمال ہمارے پیش آئی اب تو نے اس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصب حاکم ہم پر مسلط کیے. تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں. تو اپنے فضل و کرم سے اُس کو قبول کر آمین !

آلٰہی جو بھلائی کہ تیرے بندے کو کسی تیرے بندے سے پہنچتی ہے وہ درحقیقت تیری ہی طرف سے ہے اور اُس تیرے بندے کا شکر ادا کرنا درحقیقت تیرا ہی شکر ادا کرنا ہے. سب کے دلوں کا حال تجھ پر روشن ہے کیونکہ تو دانائے نہاں و آشکارا ہے. اہل ہند جو اس اتفاقیہ آفت میں گرفتار ہو گئے تھے اُن پر رحم کرنا تو نے ہی ہمارے حکام کے دل میں ڈالا. تیرے ہی القا سے کوئن وکٹوریہ دام سلطنتہا نے پُر رحم اشتہار معافی جاری کیا. ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی جان سے ملکہ کو دعا دیتے ہیں. آلٰہی تو ہماری اس دعا کو قبول کر آمین ! آلٰہی ہماری ملکہ وکٹوریہ ہوا. اور جہان ہو. تمام اہل ہند ناظم کشور ہند والسرائے لارڈ کیننگ دام اقبالہ کا یہ رحم اور احسان

کبھی دل سے نہ بھولیں گے جس نے تمام اصل حالات فساد پر غور کر کے اس پُر رحم اشتہار کے جاری ہونے کی صلاح دی۔ اس کی مستحکم رائے کسی طرح اس معاملے میں نہیں ڈگمگائی جس سے تمام رعایا نے امن پایا۔ تمام اہلِ ہند اُس کے اِس احسان کے بندے اور دل و جان سے اُس کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری دُعا قبول کر۔ آمین! الٰہی دنیا ہو اور ہمارا وائسرائے لارڈ کیننگ ہو۔

الٰہی اہل ہند رحم کے اُس سے بہت زیادہ خواہشمند ہیں جتنا ایک پیاسا نہایت گرمی کی شدت اور آفتاب کی تیزی اور دھوپ کی تپش اور ریتے کے جنگل میں پانی کی آرزو رکھتا ہے۔ جس حاکم کو دیکھتے ہیں کہ اُس کی رحم کی نظر ہے اُس کو دل سے پیار کرتے ہیں اور اُس کا دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ تمام اہلِ ہند جانتے ہیں کہ اصل حالات فساد پر غور کر کے نہایت رحم کی نگاہ سے اہل ہند کو مسٹر ریڈ صاحب صدر بورڈ نے دیکھا ہے۔ اس لیے اُن کا شکر ادا کرتے ہیں اور دل سے اُن کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ ہمارا مسٹر ریڈ ہمیشہ سلامت رہے۔

اب ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہمیشہ اپنے فضل و کرم سے امن و امان اور چین چان اور تمام رعایائے ہند کو اطاعت گورنمنٹ سے سرخروئی دے اور ہمارے حکّام اپنی رعایا اور خدا کے بندوں پر مہربان رہیں۔ آمین :

صلی اللہ تعالےٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمد و آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین
و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین ؛

# رسائل موسوم بہ لائل محمڈنز آف انڈیا

مراد آباد ہی میں سرسید نے خاصکر مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ایک اور مفید کام کی بنیاد ڈالی۔ رسالۂ اسباب بغاوت جیسا کہ اوپر مذکور ہوا انھوں نے محض گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے لکھا تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک اس کے مضامین سے ہندوستان کے حکام اور افسر اور خود ہندوستان کے باشندے کیا ہندو اور کیا مسلمان مطلع نہیں ہوئے اور جو نتائج اس پر مرتب ہوئے وہ پارلیمنٹ کے مباحثوں کے بعد آہستہ آہستہ بتدریج ظاہر ہوتے رہے اس لیے سرسید کے دل کی بے چینی اور درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بغاوت پر جتنے آرٹیکل، رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے اُن میں سے اکثر میں مسلمانوں کے برخلاف رائیں ظاہر کی جاتی تھیں اُن کی بے چینی اور زیادہ ہوئی تھی۔ مسلمانوں پر کہیں یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ اُن کو بالذات اپنے مذہب کے موجب عیسائیوں سے عداوت ہے۔ کوئی یہ لکھتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عملداری نہیں رہنے کی۔ اور سب سے بڑا اور عام الزام جو اُن پر عائد کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی رو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اسی لیے مسلمان سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے۔

برخلاف اس کے سرسید نے نہایت تحقیقات اور چھان بین سے بے شمار شہادتیں اس بات کی بہم پہنچائی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیرخواہی میں جانبازی اور جاں نثاری کے کام مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظہور میں نہیں آئے۔ اور مذکورۂ بالا تینوں الزام جو مسلمانوں پر لگائے جاتے تھے وہ

فی الواقع انگریزوں کی غلط فہمی پر مبنی تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جو پارہ پارہ کر کے وقتاً فوقتاً اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپوائی جائے اور ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں شائع کی جائے۔

اس کتاب کا موضوع یہ قرار دیا تھا کہ اطراف ہندوستان میں جس قدر مسلمانوں نے گورنمنٹ کی خیر خواہیاں اور انگریزوں کی حمایت کے لیے جانبازیاں کی ہیں اُن میں سے ہر شخص کا حال مفصل اور مشرح نہایت صحت کے ساتھ قلمبند کیا جائے اور ہر شخص کے متعلق گورنمنٹ حکام اور افسروں کی تمام چٹھیاں اور سرٹیفکٹ بہم پہنچا کر اُس کی سرگذشت کی ذیل میں نقل کیجائیں اور جو کچھ اُن کی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے جاگیر یا پنشن یا انعام یا خلعت وغیرہ عنایت کیا ہو وہ سب بیان کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کتاب لکھنے کے لیے بے انتہا سامان اور میٹریل درکار تھا جس کا جمع کرنا وقت سے خالی نہ تھا۔ پھر اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجرت بھی اس زمانے میں نہایت گراں تھی اور ٹائپ کے چھاپہ کا خرچ بھی بہ نسبت پتھر کے چھاپہ کے بہت زیادہ تھا۔ اس لیے سرسید نے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ جس خیر خواہ مسلمان کا حال جتنے صفحوں پر چھپے اُس قدر صفحوں کے چھاپہ وغیرہ کی لاگت وہی شخص ادا کرے۔ مگر افسوس ہے کہ معدودے چند کے سوا کسی نے اس تدبیر کے پورا کرنے کی طرف توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تین نمبر بقدر ۲۷۳ صفحہ کے چھپ کر رہ گئے ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ جاری ہوا اور ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

پہلے نمبر کو انھوں نے اس طرح شروع کیا ہے۔ "سچ ہے انقلاب زمانہ ایک ایسا بڑا حادثہ ہے کہ آدمی کو نہایت زبوں و صاماندہ کر دیتا ہے۔ ایسے وقت

میں انسان کا فضل و کمال، عقل و ہنر علم و عمل کچھ کام نہیں آتا۔ یہی وہ حادثہ ہے جس سے انسان کا پاپلٹ ہو جاتا ہے۔ کوئی کام اُس کا اعتبار کے لائق نہیں رہتا کسی شخص کو اس کی قدر و منزلت کا خیال نہیں رہتا جو کام انسان سے بُرا سرزد ہوتا ہے وہ تو بُرا ہی ہے مگر اس کمبخت وقت کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ اُس کا اچھا کام بھی بُرائی اور ظاہر داری پر محمول ہوتا ہے۔ ہر ایک قوم میں اچھے بُرے سب قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ یہ ایک مثل مشہور ہے کہ "ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرے" یہ مثل ایسے ہی بُرے وقت کے لیے کہی گئی ہے۔ اس کم بخت وقت کا یہ خاصہ ہے کہ اگر ایک آدمی بھی بُرا کام کرے تو ساری قوم کی قوم رسوا اور بدنام ہو جاتی ہے۔ گو اُس قوم میں صدہا آدمیوں نے اچھے کام کیے ہوں مگر اُن خوبیوں پر کسی کو خیال نہیں ہوتا۔"

"برخلاف اس کے جن لوگوں پر یہ بدبختی کے دن نہیں ہوتے اُن کا بُرا کام بھی آنکھوں میں نہیں کھٹکتا۔ اُن میں سے ہزاروں نے کیسے ہی بُرے کام کیے ہوں مگر اُن کی بُرائی پر کسی کو دھیان نہیں ہوتا۔ یہ بدبختی کا زمانہ وہ ہے جو ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گذرا۔ کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اُس زمانے میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ گو وہ رام دین اور ماتا دین ہی نے کی ہو۔ کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے، مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔

ہر بلائے کز آسماں آید گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمین نارسیدہ می پُرسد خانۂ مسلماں کجا باشد

"اس گذشتہ زمانے کے حالات پر میں نے بھی بہت غور کیا اور جو اصلی حالات مجھ کو معلوم ہوئے ہیں اُن پر میں یقین رکھتا ہوں اور اسی سبب سے میرا دل خوش ہے کہ بالفعل جو ایک غوغا مسلمانوں کی بُرائی اور مفسدہ اور بد ذاتی

کا چاروں طرف پھیل رہا ہے یہ بالکل مٹ جائے گا۔ اگرچہ کچھ کچھ حالات فساد کے کھلتے چلے ہیں مگر روز بروز اور زیادہ کھلتے جائیں گے اور جب اصلی حال بالکل روشن ہو جاتے گا تو جن لوگوں کی زبانیں مسلمانوں کی نسبت دراز ہو رہی ہیں سب بند ہو جائیں گی اور تحقیق ہو جائے گا کہ ہندوستان میں اگر کوئی قوم مذہب کی رو سے عیسائیوں سے محبت اور اخلاص اور ارتباط اور یگانگت کر سکتی ہے تو مسلمان ہی کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔ مگر ان دنوں میں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گذرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اُگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اُس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔ مگر میں اُس کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ میں نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا ایسا اور کوئی ہو جس نے خالص سرکار کی خیر خواہی میں اپنی جان، مال، عزت، آبرو، کھوئی ہو۔ زبانی بات چیت کی خیر خواہیاں ملا دینے اور چھوٹے بچے ایک دو پرچے لکھ بھیجنے بہت آسان ہیں مگر مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہے جس نے صرف سرکار کی خیر خواہی میں اپنی اور اپنے کنبے کی جان دی ہو اور ہر وقت ہاتھ پاؤں اور دل وجان سے جاں نثاری کو حاضر رہا ہو۔"

وہ جن مسلمانوں نے سرکار کی نمک حرامی اور بدخواہی کی ہیں اُن کا طرفدار نہیں ہوں میں اُن سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور اُن کو حد سے زیادہ بُرا جانتا ہوں کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہیے تھا جو اہل کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں، نبیوں پہ

ایمان لائے ہیں، خدا کے دیئے ہوئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور جس پر ایمان لانا ہمارا عین ایمان ہے۔ پس اس ہنگامے میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرنا چاہیے۔ تھا۔ پھر جس نے ایسا نہیں کیا اُس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی، اپنے مذہب کے بھی برخلاف کیا۔ اس لیے بلاشبہ وہ اس لائق ہیں کہ زیادہ اُن سے ناراض ہوا جائے مگر عموماً اخباروں اور بغاوت کی کتابوں میں جو رائے اُن کی نسبت چھاپی جاتی ہے اُس میں اور میری رائے میں اتنا فرق ہے کہ جو تمہید اور جو بنا اور جو منشا کہ وہ لوگ اُن کی نسبت لگاتے ہیں میں اُن کو قبول نہیں کرتا اور کچھ شک نہیں کہ میں اپنی رائے کو بہت درستی اور انصاف سے کام میں لایا ہوں۔"

"اگرچہ چاروں طرف سے مسلمانوں پر یہ شور و غل ہو رہا ہے مگر مسلمانوں کو کسی طرح رنجیدہ خاطر ہونا نہیں چاہیے کیونکہ ہماری نہایت منصف اعلیٰ گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف ہے۔ ہماری گورنمنٹ نے اصلی حالاتِ فساد پر بخوبی غور کیا ہے اور یقین ہے کہ ہماری گورنمنٹ کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے جو تم اخباروں یا بغاوت کی کتابوں میں دیکھتے ہو۔ پس جب کہ مسلمانوں کی طرف خود گورنمنٹ ہے تو پھر اس شور و غوغا کا اُن کو کیا غم ہے۔

ع
نمیگویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من

دوم جو یہ بات لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے اس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدر دان گورنمنٹ نے خیرخواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت و آبرو کی۔ انعام و اکرام اور جاگیر

اور پنشن سے نہال کر دیا ہے، ترقی عہدہ اور افزونی مراتب سے سرفراز کیا ہے
پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور دل و جان سے اپنی گورنمنٹ
کے شکرگزار و ثناخواں رہیں "

" مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے جو خیر خواہیاں کیں اُن کا ذکر اخباروں
میں بہت کم چھپتا ہے اور بغاوت کی جو کتابیں چھپی ہیں اُن میں تو اس کا ذکر ہی نہیں
اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ مسلمان خیر خواہوں کا تذکرہ اس رسالہ میں لکھنا
شروع کروں اور جن مسلمانوں نے علی الخصوص مسلمان ملازمان گورنمنٹ نے
جو جو خیر خواہیاں گورنمنٹ کی کی ہیں اُن کا بیان جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لکھوں
اور جو انعام و اکرام ہماری منصف و قدردان گورنمنٹ نے بعوض اس کے مسلمانوں
کو دیے وہ سب بیان کروں، تاکہ گورنمنٹ کی سخاوت اور منصفی اور قدردانی
زیادہ تر مشہور ہو اور تمام رعایا اپنے ہم قوموں کے ساتھ گورنمنٹ کی مروت اور
سلوک اور رعایت اور قدردانی دیکھ کر اُس کی دل سے شکرگذار ہو، اور ہر ایک
کو یہ حوصلہ پیدا ہو کہ جس طرح ہمارے ہم قوموں نے گورنمنٹ کی رفاقت سے
عزت اور نیک نامی حاصل کی اُسی طرح ہم بھی حاصل کریں اور یہ بھی جان لیں کہ ہماری
گورنمنٹ ہمیشہ اپنی مطیع رعایا پر دل سے مہربان اور اُن کی قدر و منزلت کرنے
کو تیار ہے "

" مگر چونکہ مسلمان خیر خواہ بہت کثرت سے ہیں اور اُن کی رپورٹیں بھی بہت
لمبی لمبی ہیں اس لیے اُن سب کا ایک کتاب میں جمع کرنا اور چھاپنا خالی از وقت
نہ تھا اس واسطے یہ تجویز کی ہے کہ مناسب مناسب وقت پر چند لوگوں کا
حال مختصر مختصر رسالوں میں چھاپا جائے "

" جو لوگ بسبب تعصب یا عدم واقفیت کے حالاتِ ملکی سے - یا جو

اصولِ سیاستِ مُدن کے ہیں اُن پر صحیح رائے نہ پہنچنے کے سبب میری رائے کے برخلاف ہیں وہ لوگ میری اس رائے کو دیکھ کر حبُ الوطنی کا الزام مجھ پر لگائیں گے۔ ہاں یہ بات تو مجبوری کی ہے کہ میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی اور میں بلاشبہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں ہی کا ذکر خیر اس کتاب میں لکھتا ہوں پھر ناانصفی سے جو کوئی چاہے یہ الزام مجھ پر لگائے۔ مگر جو لوگ انصاف دوست ہیں وہ خیال کریںگے کہ ان حالات و واقعات کی تحریر میں میں نے کسی جگہ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا جس مسلمان کی خیر خواہی کا ذکر لکھا ہے اس کے ساتھ بجنسہ حکام متعہد کی رپورٹیں جو ان کے حق میں ہوئیں اور سارٹیفکٹ جو اُن کو دیئے گئے اور گورنمنٹ سے جو انعام واکرام اُن کو ملے۔ وہ سب لفظ بہ لفظ اس میں مندرج ہیں جو میری اس تحریر پر گواہِ عادل ہیں اور تمام متعصبوں کو الزام لگانے سے بند کرتے ہیں۔

اس کے بعد سر سیّد نے اوّل اس بات کا اقرار کیا ہے کہ میری خدمات بمقابلہ بڑے بڑے خیر خواہ مسلمانوں کے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور اس لیے وہ ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر صرف اس اُمید پر کہ جو انگریز مسلمانوں سے بدگمان ہیں۔ وہ مؤلف کو گورنمنٹ کا خیر خواہ سمجھ کر ان تحریرات کو توجہ کے قابل سمجھیں سب سے پہلے اپنا اور میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کا حال لکھا ہے اور تینوں رسالوں میں تقریباً سترہ یا اٹھارہ شخصوں کا نہایت مفصل حال درج کیا ہے جن میں سے بعضے خود بھی مارے گئے اور اُن کے ساتھ دس دس بارہ بارہ آدمی اُن کے کنبے کے بھی باغیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے دوسرے رسالہ میں خیر خواہان سرکار کے ذکر کے علاوہ ایک لمبی بحث اُن تینوں الزاموں کے متعلق بھی کی ہے جو عموماً مسلمانوں اور اُن کے مذہب پر لگائے جاتے تھے اور قرآن حدیث اور فقہ کے حوالوں سے نہایت صفائی کے ساتھ ان کو غلط اور محض بے اصل و بے بنیاد ثابت کیا ہے۔

تیسرے رسالہ میں لانس لٹ اڈیسن نام ایک قدیم عیسائی مصنف کی کتاب سے جو اُس نے ۱۶۷۹ء میں اسلام کے ابتدائی حالات پر لکھی تھی، ایک عہد نامہ نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا تھا اُس میں اُن کی قوم کو تقریباً مسلمانوں ہی کی برابر حقوق دیئے تھے اور مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ اُس پر ہمیشہ کاربند رہیں ورنہ وہ خدا سے منحرف سمجھے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ یہ رسالہ مسلمانوں کی معمولی بے پروائی اور کم ہمتی سے صرف تین نمبروں سے آگے نہ چل سکے۔ اگر یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا تو مسلمانوں کے حق میں ایک نہایت مفید اور بکار آمد چیز ہوتی اور اُن دعووں کا ایک عملی اور قطعی ثبوت ہوتا جن کے ثابت کرنے کے لیے اصول اسلام کے موافق دلیلیں اور شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی۔

# تحقیق لفظ نصاریٰ

سرسید مراد آباد ہی میں تھے کہ اُن کو معلوم ہوا کہ بعض اضلاع میں مسلمانوں کی بعض تحریریں ایامِ غدر کی ایسی پیش ہوئیں جن میں انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا۔ حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت کا لفظ سمجھا اور اُن کے لکھنے والوں کو وہ سزائیں دی گئیں جو اُن کی قسمت میں لکھی تھیں۔ اس وقت جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے، مسلمانوں کی ہر ایک بات بُرے پہلو پر ڈھالی جاتی تھی۔ انگریزوں

---

[1] غدر کے چند سال بعد دلی میں بھی ایک اسی قسم کا اشتباہ پیدا ہوا تھا۔ دلی کالج کے ایک مسلمان پروفیسر کے ایک ایڈریس کے مسودہ میں عیسائی کی جگہ ترسا کا لفظ لکھ دیا تھا جو فارسی میں راہب یعنی ملنگ کو کہتے ہیں کالج کے ایک یورپین افسر نے اس کو حقارت کا لفظ سمجھا اور نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس لفظ کو مسودہ میں سے کٹوا دیا۔ ۱۲

نے جو بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی نسبت نصاریٰ کا لفظ دیکھا تو انھوں نے
یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسیٰ کو حقارت سے ناصری (یعنی قریۂ ناصرہ کا
رہنے والا) کہتے تھے اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو نصاریٰ کے لفظ سے
یاد کیا ہے۔

سرسید نے اس غلطی کے رفع کرنے کو فوراً ایک مختصر رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ
میں لکھا اور اُس کو اُردو اور انگریزی میں چھپوا کر حکام اور گورنمنٹ کو اُس کے مضمون سے
مطلع کیا۔ ہم کو اس کتاب کے لکھنے وقت وہ رسالہ دستیاب نہیں ہوا مگر جو کچھ سرسید
نے زبانی بیان کیا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا لفظ ناصرہ سے مشتق نہیں بلکہ
نصر سے مشتق ہے اور مسلمان اس وجہ سے کہ قرآن سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔
اُس کو نصر سے مشتق سمجھتے ہیں نہ ناصرہ سے کیونکہ قرآن میں صاف آیا ہے کہ جب
حضرت عیسیٰ نے کہا "من انصاری الی اللہ" تو حواریوں نے کہا "نحن انصار اللہ"
اور اسی لیے حواریوں کی پیروی کرنے والوں اور عیسیٰ پر ایمان لانے والوں کو اُسی صفت
کے ساتھ جس کو حواریوں نے اپنی مجری تھی، موصوف کیا گیا ہے اور ان پر نصاریٰ
کا اطلاق کیا گیا ہے۔ قرآن میں کہیں قریۂ ناصرہ کا ذکر نہیں آیا اور نہ کہیں حضرت عیسیٰ
کو ناصری کہا گیا ہے اس کے سوا قرآن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی آنحضرتؐ
کے زمانے میں خود اپنے تئیں نصاریٰ کہتے تھے جیسا کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت
میں بیان ہوا ہے۔ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ (یعنی اے محمد صلی اللہ
علیہ وسلم تو پائے گا اہل کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کو دوست اُن کو جن کا قول ہے کہ ہم نصاریٰ ہیں)

جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے اس رسالہ کی اشاعت کے بعد پھر کسی سے اس لفظ
پر مواخذہ نہیں ہوا۔ ہم نے سنا ہے کہ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار
میں یہ لکھا گیا تھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ لکھنے

پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یورپین افسر نے اُس کا جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی۔

# انتظام قحط ضلع مراد آباد

۱۸۶۰ء میں جب کہ اضلاع شمال مغرب میں ایک عام قحط پڑا تھا اُس وقت سرسید مراد آباد ہی میں صدر الصدور تھے۔ مسٹر جان اسٹریچی نے جو اُس وقت وہاں کلکٹر تھے، اپنے ضلع کے قحط کا انتظام سرسید کے سپرد کر دیا تھا۔ اس موقع پر قطع نظر دیانت اور سلیقۂ انتظام کے جو انسانی ہمدردی سرسید سے ظہور میں آئی وہ ہندوستانیوں کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ سرسید کے ایک قدیم دوست خود مراد آباد کے رہنے والے جو اُس وقت وہاں ملازم تھے اُن کا خیال ہے کہ سید احمد خاں کو جو اس قدر عزت اور نیکنامی تمام ہندوستان میں حاصل ہوئی، یہ اسی بھلائی اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط کے انتظام میں اُن سے ظاہر ہوئی۔

محتاج خانہ کے حسن انتظام کا یہ حال تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا۔ بیماروں کے لیے شفاخانہ اور ڈاکٹر موجود تھا۔ بیماروں کو مرپر سبزی کھانا ملتا تھا زچاؤں اور شیر خوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان اور ہندوؤں کے لیے ہندو کھانا پکاتے تھے۔ جو ہندو اپنے سوا کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے تھے اُن کے لیے علیحدہ چوکے بنے ہوئے تھے۔ شہر کی پردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانہ میں نہیں آسکتی تھیں اُن کے پاس سوت کاتنے کے لیے آٹھ آٹھ آنہ فی اسم اور ایک ایک پٹاری روئی کے گاؤں کی میر محلوں کی معرفت بھیجدی جاتی تھی جب سوت کتکر آجاتا تھا اور روئی اور کاتنے کی اجرت بھیجدیتے تھے۔ سرسید کے مراد آبادی دوست بیان کرتے ہیں کہ اُس زمانے کی عورتیں

جو ابتک جیتی ہیں وہ سید احمد خاں کو اب تک دعائیں دیتی ہیں۔

سرسید صبح شام دونوں وقت بلاناغہ محتاج خانہ میں خود جاتے تھے، ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جاسکتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے تھے اور کپڑے بول و براز میں لتھڑے ہوئے ہوتے تھے، اُن کو سرسید خود اپنی گود میں اٹھاکر دوسری صاف جگہ احتیاط سے جا کر لٹا دیتے تھے، اُن کے کپڑے بدلواتے تھے سر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دھلواتے تھے۔ دوا پلواتے تھے اور نہایت شفقت سے اُن کے ساتھ پیش آتے تھے۔ راجہ جیکشن داس صاحب سی۔ ایس۔ آئی جو آخر کو سرسید کے نہایت گہرے دوست ہو گئے، اُس وقت تک اُن سے ملاقات نہ تھی، اُنکا بیان ہے کہ

"جب سرسید نے رسالہ "لائل محمدنز آف انڈیا" نکالنا شروع کیا تو اُس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہُوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے اُن کو کچھ ہمدردی نہیں ہے، اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہوگیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیرخواہوں کے تذکرہ میں نکالا جائے۔ انھیں دنوں میں میرا مراد آباد جانا ہوا۔ محتاج خانہ راہ میں پڑتا تھا۔ وہاں سرسید سے مُڈبھیڑ ہوگئی۔ میں نے اُن فقروں کا ذکر کیا جن سے اُن کے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے معذرت کی اور اپنی قلم کی لغزش کا اقرار کیا۔ خیر یہ تو ایک اخلاقی جواب تھا، مگر جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اُس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آ رہے تھے اُس کو دیکھ کر میرا دل بالکل صاف ہوگیا اور مجھے حیرت ہوگئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے! وہ دن ہے اور آج

کا دن اُن کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی گئی اور اب جو کچھ
میرا اور اُن کا معاملہ ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔"

محتاج خانہ میں شام کا کھانا سب محتاجوں کو دن چھپنے سے پہلے بٹ جاتا تھا مگر جو بھلے مانس علانیہ محتاج خانہ میں آنے سے شرماتے تھے اُن کو عام اجازت تھی کہ رات کو اندھیرے میں آکر کھانا کھا جایا کریں۔ محتاجوں کے کھانے کے لیے ہر ایک جنس عمدہ اول درجہ کی منگوائی جاتی تھی کھانے کے سوا ان کے لیے ضروری کپڑا بھی تیار کرایا جاتا تھا۔

باوجود ایسے اچھے انتظام کے جس قدر کم روپیہ ضلع مرادآباد میں خرچ ہوا ایسا کسی ضلع میں نہیں ہوا۔ سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی عورت اور مرد محتاج خانہ میں کام کے لائق تھے سب سے کام لیا جاتا تھا۔ بان اور رسّیاں بٹتے تھے، سوت کاتتے تھے سڑکوں پر کام کرتے تھے اور طرح طرح کے کام جو اُن سے ہو سکتے تھے کرتے تھے اور اس طرح اُن کے کام کی اُجرت سے ہر روز ایک رقم کثیر جمع ہو جاتی تھی جو محتاج خانہ میں صرف ہوتی تھی۔

محتاج خانہ کے علاوہ خود سرسید اپنی ذات سے اور نیز اُن کی نیک بی بی جو اُن سے بھی زیادہ خدا ترس تھیں۔ غریبوں اور محتاجوں کی خبرگیری کرتے تھے۔ اُن کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں۔

جب اس محتاج خانہ کی رپورٹ اسٹریچی صاحب نے گورنمنٹ میں بھیجی تو یہ انتظام ایسا پسند آیا کہ اور اضلاع کے حکام کو بھی ایسا ہی انتظام کرنے کی ہدایت ہوئی۔ اور اسٹریچی صاحب کا نہایت شکریہ اور تعریف کی گئی مگر اسٹریچی صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ یہ تمام کارروائی سید احمد خاں صدر الصدور سب جج نے کی ہے۔ اگر

شکریہ اور تعریف کا مستحق ہے تو سیّد احمد خاں ہے۔

سرسیّد کو جب اسٹریچی صاحب نے قحط کا انتظام سپرد کیا تھا تو سرسیّد نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس شرط پر انتظام کرتا ہوں کہ جتنے لاوارث بچے آئیں اُن میں جتنے مسلمان ہوں گے وہ مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہوں گے وہ ہندوؤں کو سپرد کیے جائیں گے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جتنے لاوارث بچے آئے وہ ہندو و مسلمانوں کے سوا کسی مشنری کو نہیں لینے دیئے۔ مگر حسب ہدایت اسٹریچی صاحب کے جو بچہ جس کے سپرد کرتے تھے اُس سے ایک اقرار نامہ لکھوا لیتے تھے کہ ہم اس کو لونڈی یا غلام نہیں بنانے کے، ہوشیار ہونے کے بعد جہاں اس کا جی چاہے رہے اور جہاں چاہے چلا جائے۔

لیکن ہنوز قحط کا انتظام ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ جان اسٹریچی مرادآباد سے بدل گئے اور مسٹر پاور ان کی جگہ آئے مشنریوں نے اسٹریچی صاحب کے سامنے تو دم نہیں مارا مگر اُن کے جاتے ہی مسٹر پاور سے سرسیّد کی شکایت کی اور یہ چاہا کہ تمام لاوارث بچے جو ہندو مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں وہ واپس لیے جائیں اُس زمانے میں مسٹر الگزنڈر شکسپیر جو سرسید کے نہایت دوست تھے مرادآباد میں جج تھے انھوں نے سرسیّد کو ہر چند سمجھایا کہ جتنے لڑکے اور لڑکیاں خاص تمھارے سپرد کی گئی ہیں وہ تم سے نہیں لیجائیں گی مگر اور لوگوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ اُن کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ مگر سرسیّد نے ہرگز نہ مانا اور یہ کہا کہ "میں نے اسی شرط پر قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا تھا کہ لاوارث بچے مشنریوں کو نہیں دیئے جائیں گے اور اسٹریچی صاحب گورنمنٹ میں رپورٹ کر چکے ہیں کہ لاوارث بچوں کا اس طرح بندوبست کیا گیا ہے۔ پس اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ مجھے جس طرح یہ گوارا نہیں کہ ایک سیّد کا بچہ مشنریوں کو دیا

جائے اسی طرح یہ بھی گوارا نہیں کہ ایک چمار کا بچہ اُن کو دیا جائے۔

مسٹر پاور کو جب سرسید کی ناراضی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی چونکہ اُس زمانہ میں ہندوستانی حد سے زیادہ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے تھے اور انگریزوں کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سرسید اور ایک دو اور ممبروں کے سوا تمام کمیٹی کا اتفاق ہو گیا کہ جتنے بچے ہندو مسلمانوں کے سپرد کیے گئے ہیں۔ وہ واپس لیے جائیں کیونکہ اُن پر ہرگز اعتماد نہیں کہ وہ اُن کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ آخرکار کمیٹی کی یہ رپورٹ منظور ہو گئی اور تمام لاوارث بچے ہندو مسلمانوں سے واپس لیکر مشنریوں کو دلوا دیئے گئے۔ سرسید کے ہاں بھی پانچ چار لڑکے اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ اور اُن کی بی بی ان کو کمال شفقت سے رکھتی تھیں جو سرسید نے پہلے اسکے کہ کوئی ان سے مانگنے آئے فوراً اُن کو کلکٹر کے پاس بھیجدیا۔ جاتے ہوئے وہ بچے زار و قطار روتے تھے اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے مگر مجبور اُن کو بھیجنا پڑا۔

سرسید کہتے تھے کہ اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ جب کبھی موقع ملے تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ کر کے صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو اور اُن کو تعلیم دیجائے۔ لیکن آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہوگی ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

# تصحیح تاریخ فیروز شاہی

مراد آباد ہی میں انھوں نے تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی کی تصحیح کی۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو اس نایاب کتاب کا چھاپنا منظور تھا۔ اس نے سرسید سے تاریخ مذکور کا ایک صحیح نسخہ نقل کے واسطے طلب کیا تھا۔ انھوں نے بہت جستجو سے اس کا ایک نسخہ اسی غرض کے لیے خریدا اور سوسائٹی سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنا نسخہ صحیح کر کے بھیجوں گا۔ چنانچہ اس کی تصحیح کے لیے ایک نسخہ کتب خانہ شاہ دہلی، دوسرا وہ نسخہ جو مسٹر الیٹ نے تاریخ ہندوستان لکھتے وقت بہم پہنچایا تھا، تیسرا نسخہ مسٹر اڈورڈ ٹامس سے اور چوتھا بنارس سے بڑی تلاش اور تجسس سے بہم پہنچا کر اپنی کتاب صحیح کی جس سے یہ تاریخ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے چھاپ کر شائع کی۔

یہ ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے جس کا مصنف ضیاء الدین برنی (یعنی بلند شہر) کا رہنے والا بہت بڑا فاضل اور راست بیانی میں ضرب المثل ہے۔ سرسید نے اس کی تصحیح کے وقت اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جس میں، اُن تمام تاریخوں کا جو شاہان ہند کے حال میں اس تاریخ سے پہلے اور خاص فیروز شاہ کے حال میں اس کے بعد لکھی گئی ہیں اور نیز ضیاء الدین برنی کا حال درج ہے۔ یہ دیباچہ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کی پہلی جلد میں چھپا ہوا موجود ہے۔

# تبیین الکلام

۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ دہلی و آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جابجا مباحثے ہونے لگے، اُس وقت سرسید کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں۔ چنانچہ غدر سے پہلے بجنور میں انھوں نے کچھ کچھ بطور یادداشت کے لکھا بھی تھا اور اپنے بھتیجے سید احمد خاں کو جو اُس وقت صغیر سن

تھے، جو کچھ لکھتے تھے بطور سبق کے پڑھاتے جاتے تھے۔

دفعتاً غدر ہوگیا اور وہ تمام یادداشتیں جاتی رہیں۔ غدر کے بعد جب اطمینان ہوا تو اس خیال نے دوسری صورت میں ظہور کیا جس کا ذکر دوسرے حصے میں کیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ ذہن میں آیا کہ اس کام کے لیے اول عیسائی مذہب اور بائبل کی حقیقت اور اس کی تاریخ سے اور جو کچھ بائبل پر موافق یا مخالف لکھا گیا ہے اُس سے واقفیت حاصل کرنی ضرور ہے۔ اُن کو یہ بھی خیال تھا کہ اب تک جس قدر مباحثے یا مناظرے ہندوستان میں پادریوں کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بغیر ان تمام باتوں کی واقفیت کے ہوئے ہیں۔ اعجاز عیسوی وغیرہ میں جو تحریف لفظی ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا اس سے سرسید کو اختلاف تھا۔ نسخ کے متعلق جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں نزاع تھا اُس کو وہ محض نزاع لفظی سمجھتے تھے۔ بہت سی باتیں جو عیسائی لوگ بائبل سے اصول اسلام کے خلاف نکالتے تھے اُن کو سرسید عیسائیوں کی غلط فہمی سے منسوب کرتے تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کی تحقیقات اور تصفیہ کے لیے بہت کچھ سامان درکار تھا۔ اتفاق سے انھیں دنوں میں غدر کے زمانہ کی چڑھی ہوئی تنخواہوں کا اور جو اسباب بجنور میں لٹ گیا تھا اُس کے معاوضہ کا، بہت سا روپیہ سرسید کو سرکار سے ملا۔ اوّل انھوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں، بائبل کی تفسیریں اور یونی ٹیرین مذہب کی کتابیں خریدیں، اور نیز لامذہبوں کی کتابیں جو بائبل کے خلاف لکھی گئی تھیں وہ بھی بہم پہنچائیں۔ ایک انگریزی خواں کو جو ان کتابوں کے ضروری مقالات ترجمہ کر کے سناتا تھا اور کتب احادیث و تفسیر وغیرہ سے سندیں بہم پہنچانے کے لیے ایک عربی داں عالم کو نوکر رکھا اور بائبل کے متعلق جو عام واقفیت اور اطلاع مذکورۂ بالا ذریعوں سے حاصل ہوئی

اُس کو اول دس مقدموں اور دو ضمیموں میں بیان کیا۔ اس کے بعد بائیل کی تفسیر لکھنے اور قرآن وحدیث سے اُس کی تطبیق کرنے کا ارادہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہانتک ممکن ہو مطابقت ثابت کیجائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کیجائے۔ اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کیجائیں اور مسلمان جو موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اُس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے۔ اُن کو بائبل اور اُس کی تفسیروں وغیرہ کے مطالعہ سے اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ بائبل کی تفسیر بالکل حدیث اور قرآن کے مطابق ہوسکتی ہے۔

یہ کام نہایت مشکل تھا اور سلف میں کسی نے کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ نہ کسی کو پہلے اس زمانے کبھی ضرورتیں پیش آئی تھیں اور نہ اگلے زمانے میں آج کل کا سا سامان اور میٹریل میسر آسکتا تھا تاہم یہ کام دشواریوں سے خالی نہ تھا۔ اُنھوں نے صرف اس تفسیر کے چھاپنے کو کئی ہزار روپیہ کا پریس رڑکی سے منگوایا اور اُردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے۔ ابھی کام شروع ہونے نہیں پایا تھا کہ اُن کی بدلی غازی پور کی گئی۔ وہ تمام سامان اپنے ساتھ غازی پور لے گئے اور وہاں اس کام میں نہایت سرگرمی اور توجہ کے ساتھ مصروف ہوئے۔

غازی پور میں اُنھوں نے سالم نام ایک یہودی کو نوکر رکھا اور اُس سے عبرانی پڑھنی شروع کی۔ غازی پور کے ضلع میں جو مولوی عنایت رسول صاحب چیریاکوٹی ایک بہت بڑے عالم عربی اور عبرانی کے ہیں اُن کی اعانت سے سرسید کے ارادے کو اور بھی زیادہ تقویت ہوئی۔ الغرض عہد عتیق میں سے

کتاب پیدائش کے گیارھویں باب تک اور عہد جدید میں سے انجیل متی کے پانچویں باب تک تفسیر اسی التزام کے ساتھ جس کا انھوں نے ارادہ کیا تھا، لکھی گئی اور ساتھ کے ساتھ چھپتی بھی گئی جو کچھ سرسید لکھتے تھے اس کا ترجمہ انگریزی میں ایک یورپین جس کو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیتے تھے، ہر روز دو گھنٹے کرتا تھا۔ وہ ترجمہ بھی اردو کے ساتھ چھپتا تھا۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری خط میں اور اس کا ترجمہ اُردو اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا دوسرے کالم میں اسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اور اس کا ترجمہ اردو اور انگریزی اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔

اس کتاب میں تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں، بڑی محنت اور تحقیق اور تلاش سے لکھے ہیں جن میں مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے نہایت عمدہ اور قیمتی اطلاعیں مندرج ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت تمہید ہیں اس مذہبی تنافر کے دور کرنے کی جو دونوں قوموں کے تعصب لاعلمی اور ایک دوسرے کے مذہب سے ناواقفیت کے سبب طرفین کے دلوں میں روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور بمنزلہ بنیاد کے ہیں ایک ایسی تفسیر کے لیے جو بائبل پر اصول اسلام کے موافق لکھی جائے۔

ان مقدموں میں دکھایا گیا ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک بھی انبیا کا مبعوث ہونا ویسا ہی ضروری ہے جیسا اہل کتاب کے نزدیک ضروری ہے اور اہل اسلام بھی تمام اگلے نبیوں اور ان کی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانا ویسا ہی ضروریات دین سے سمجھتے ہیں جیسے اہل کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جن اگلی کتابوں اور صحیفوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے یہی کتابیں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھیں، اور آج اُن کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا عقلی معیار مسلمانوں کے نزدیک بھی وہی امر قرار پاسکتا ہے جو عیسائیوں کے ہاں قرار پایا ہے۔ نیز محققین و اکابر اہلِ اسلام مثل امام اسمٰعیل بخاری امام فخر الدین رازی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ کے اقوال سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح عیسائی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کے قائل نہیں ہیں اسی طرح محققین اہل اسلام بھی اس کے قائل نہیں ہیں اور جس قسم کی تحریف کو عیسائی محققوں نے تسلیم کیا ہے صرف اسی قسم کی تحریف آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے کتب مقدسہ میں پائی جاتی ہے پھر جس قدر کوششیں یہودی اور عیسائی عالموں اور بزرگوں نے عہد عتیق اور عہد جدید کی حفاظت، تنقید اور تصحیح میں ابتدا سے آج تک کی ہیں اُن کی تمام ہسٹری اور جو نتائج اُن کوششوں پر مرتب ہوئے وہ مفصل بیان کیے ہیں۔ پھر ترجموں کا حال اور یہ کہ اختلاف تراجم سے اصل بائبل کا محرف ہونا لازم نہیں آتا نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔ پھر نسخ کی بابت جو نزاع مسلمانوں اور عیسائیوں میں تھا اس کو محض نزاع لفظی پر محمول کیا ہے اور اس طرح اُس بونِ بعید کو جو علمائے فریقین کے تعصب یا لاعلمی و ناواقفیت سے اسلام اور اصلی عیسائیت کے اصول میں پایا جاتا تھا اُس کو بہت کچھ رفع کیا ہے۔ اس کے بعد ایک دیباچہ عہد عتیق پر اور دوسرا کتاب پیدائش پر لکھا ہے پھر تفسیر شروع کی ہے۔

یہ تفسیر اس لحاظ سے کہ اُس میں تحریف لفظی کا انکار کیا گیا تھا اور نیز اس لیے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان نے اُس کے لکھنے پر توجہ نہیں کی، موجودہ علمائے اسلام کے خلاف تھی اور اس وجہ سے کہ وہ اسلام اور خالص عیسائیت میں اتحاد ثابت کرتی تھی اور موجودہ عیسائیت کو جس

کی بنیاد تثلیث، کفارہ اور تکذیب خاتم النبیینؐ پر ہے غلط ٹھیراتی ہے۔ عیسائیوں کے برخلاف تھی، نیز اس کے لکھنے، ترتیب دینے اور چھپوانے میں بے انتہا محنت اور روپیہ صرف ہوتا تھا اور کتاب کے بکنے کی بالکل امید نہ تھی۔ ان وجوہات سے وہ آگے نہ چل سکی۔ اگرچہ اس بات کا افسوس ہے کہ یہ تفسیر پوری نہ ہو سکی اور سر سید کا ایک نہایت مفید اور ضروری کام ادھورا رہ گیا مگر جو مقاصد اس تفسیر کے ذریعے سے بیان کرنے منظور تھے اُن میں سے بعض اہم اور ضروری مقصد خطبات احمدیہ میں کمال شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو گئے ہیں، جیسے انبیائے سابقین کی پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یا مسئلہ وازدواج یا مسئلہ طلاق وغیرہ۔

عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنے کا مخاصمانہ طریقہ جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا، اُس کا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ مسلمان اور قوموں کی طرح مشنریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے۔ مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہ ہوا۔ وہ اسلام کو بدستور ظلم، خونریزی، تعصب اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم کی حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لیے مناظرہ کا طریقہ جاری رکھنا ضروری تھا اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ مناظرہ کے مخاصمانہ طریقہ کو چھوڑ کر آشتی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل ہونے کے لیے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ

توریت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے ہاتھ سے لکھی جائے اور جو امور فی الواقع دونوں مذہبوں میں مابہ الاجتماع یا مابہ الافتراق ہیں اُن کو اپنی اپنی جگہ صاف طور پر بیان کیا جائے اور اس طرح اُس بیگانگی اور وحشت کو جو دونوں قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہو گئی ہے رفع کیا جائے۔ سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا مگر چونکہ اُس کا پورا کرنا بغیر قوم کی تائید کے اُن کی طاقت اور بوتے سے باہر تھا۔ اس لیے وہ اپنے منصوبے کو پورا نہ کر سکے۔ مگر جو نمونہ اُن کے زبردست ہاتھوں سے تیار ہو گیا ہے اُس کے موافق اُس تفسیر کا پورا کرنا اب ویسا مشکل نہیں رہا جیسا ابتدا میں نظر آتا تھا

جان میولس آرنلڈ نے اپنی کتاب قرآن اینڈ بائبل مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں سرسید کی ایک چٹھی چھاپی ہے۔ جو انھوں نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد کے متعلق مصنف موصوف کی چٹھی کے جواب میں اُن کے پاس بھیجی تھی۔ چونکہ اس چٹھی سے تفسیر مذکور کے لکھنے کا اصل منشا اور اُس کی نسبت مسلمانوں اور عیسائیوں کے خیالات جو اُس وقت تھے اور خود سرسید کا اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا اور لوگوں کی مخالفت کا کچھ خیال نہ کرنا، بخوبی واضح ہوتا ہے اس لیے یہاں اُس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وہ جان میولس آرنلڈ کو لکھتے ہیں کہ "بے شک آپ کا خیال صحیح ہے کہ کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی۔ خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آبا و اجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو امر کہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں اور اُن کے

اِس مضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو اور دونوں کے دل بُرے ہوں، اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

"جب کہ فریقین کی یہ حالت ہو تو آپ بآسانی خیال کر سکتے ہیں اور نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی تصنیف کرے جس کا مقصد انجیل مقدس کی تفسیر لکھنا، اُس کی تائید کرنا اور اس کو آسمانی کتاب ماننا ہو تو اس کی حالت اور منزلت اُس کے ہم مذہب لوگوں میں کیا ہوگی، بلاشبہ اُس سے سب لوگ متنفر ہوں گے اور اُس کو بُرا کہیں گے یہی حالت میری ہوئی۔ اس کام کے شروع میں میرے ساتھ بھی یہ برتاؤ ہوا۔ مگر میں نے اُن کی بے جا تضحیک، بے بنیاد دھمکیوں اور اسی قسم کی زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اور اس بات کے کہنے میں جس کو میں حق سمجھتا تھا، کسی چیز سے اندیشہ نہیں کیا۔ جو انعام کہ مجھ کو عیسائیوں سے میرے کام کے آغاز میں ملا وہ بھی اس سے کم نہ تھا جو میرے ہم مذہبوں نے مجھ کو دیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری تفسیر کا اوّل حصّہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ میں انجیل کی تائید میں لکھتا تھا وہ خود قرآن پاک اور دیگر مستند کتابوں کی بنا پر تھا، بہت سے میری تعریف کرنے لگے اور انجیل مقدس پر اعتقاد رکھنے اور اُس کا ادب کرنے میں میرے ہم خیال ہو گئے۔ اور بہت سے توہمات اور خیالاتِ فاسدہ جو اُن کو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے کم ہو گئے جیسا کہ آپ کو ذیل کے فقرات سے معلوم ہو گا جن کو میں ایک بڑے مولوی[1]

---

[1] غالباً یہ خط مولانا محمد فصیح مرحوم غازی پوری یا مولوی تراب علی صاحب مرحوم کا تھا ۱۲۔

کے خط سے جو میرے نام تھا، نقل کرتا ہوں" میں نے آپ کی تفسیر کو پڑھا اور میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ بلاشک وہ بے مثل کتاب ہے اور مذہب اسلام کی تائید اور حمایت کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے اور بے حد شکر ہے کہ اس زمانے میں آپ ایک ایسے شخص ہیں جو راہِ راست کی رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ کی تصنیف ہر سہ شنبہ کو پڑھی جاتی ہے اور اس کے قابل تعریف فقروں کو پڑھنے سے خدا کا شکر اور آپ کے واسطے دعا دل سے نکلتی ہے۔"

" بائبل مقدس میں بعض مقامات ایسے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اُس سے بہت بد اعتقاد ہو گئے ہیں۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کی طرف مصر میں جھوٹ بولنے کی نسبت کرنا۔ عیسائی مفسروں نے ان مقامات کی پوری تفسیر نہیں لکھی لیکن میں برخلاف اُن کے کہتا ہوں کہ خود بائبل سے ان فقروں کے یہ معنی نہیں نکلتے جو عموماً مانے جاتے ہیں اس بنا پر مجھ کو امید ہے کہ میری تفسیر کا دوسرا حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کا تعصب بائبل کے ساتھ بہت کم ہو جائے گا۔"

" با اینہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام[1] مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھے نجات نہ ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں اس لیے کہ میں انجیل میں اس مسئلہ کی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ مذہب اسلام صحیح ہے اور اُس کی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لیے مجھے کچھ پروا نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں۔ میں حق پر ہوں

---

[1] اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کام سرسید نے اس تفسیر لکھنے کے بعد عام مسلمانوں کے خیالات کے برخلاف کیے۔ وہ سب نے پہلے ہی سے اُن کے ممنون خاطر تھے ۱۲-

اور اُس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جانا ہے۔ البتہ میری یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔ میری یہ خواہش اُن چند رسالوں کے پڑھنے سے آپ پر بخوبی ظاہر ہو جائے گی جو میں نے اس باب میں لکھے ہیں اور جن کو اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نے آپ کے نام اپنی تفسیر کا پہلا حصہ بھی روانہ کیا ہے۔ جس کا قبول کرنا میری عزت افزائی کا باعث ہوگا۔ دوسرا حصہ جب تیار ہو جائے گا آپ کی خدمت میں ارسال ہوگا۔"

"یقیناً میں بھی بائبل کا اتنا ہی طرفدار اور مؤید ہوں جس قدر کہ آپ ہیں۔ میرا قصد ہے کہ میں ڈاکٹر کلنزو کے اعتراضات کا یعنی تفسیر کے مناسب حصوں میں جب اُن کا موقع آئے جواب دوں۔"

جان میولس آرنلڈ سرسید کی یہ چٹھی اپنی کتاب میں نقل کر کے اُس پر یہ ریمارک کرتے ہیں کہ "اگر یہ خیالات عام ہو جائیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلتے جاتے ہیں تو اُن کی وجہ سے وہ نہ صرف وفادار ہو جائیں گے بلکہ رفتہ رفتہ وہ دشمنی جو اسلام کے پھیلنے سے قوموں میں ہو گئی ہے، دور ہو جائے گی۔ یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے، جیسا کہ اب تک خیال تھا واجب التعظیم بیان کرتی ہے۔ اور اُس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے۔ اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اُسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں جس نگاہ سے کہ وہ قرآن پاک کو دیکھتے ہیں۔"

اس کے بعد جان میولس آرنلڈ نے ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس پر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ " اگر یہ کام مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے ہو جائے تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو (نعوذ باللہ) قرآن ضرور جھوٹ ہے۔" معلوم نہیں کہ یہ نتیجہ انھوں نے کہاں سے نکالا ؛ اگر وہ ذرا غور اور امعان نظر کو کام فرماتے تو یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالتے بلکہ یہ کہتے کہ اگر انجیل اور قرآن میں مطابقت ثابت ہوگئی تو مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو موجودہ عیسائی مذہب بالکل غلط اور انجیل کے برخلاف ہے۔ سولہ برس کا عرصہ ہوا کہ مصر میں ایک عیسائی عالم نے جس کا نام کرسٹوفر جبارہ ہے اور جو وہاں کے مشہور عیسائی اخبار شہادۃ الحق کا اڈیٹر ہے، مذاہب ثلاثہ یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی آسمانی کتابوں پر غور کر کے یہ رائے قرار دی تھی کہ فی الحقیقۃ تینوں مذہبوں اور تینوں کتابوں کی توفیق اور تطبیق ہو سکتی ہے اور ان میں کوئی اصلی اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام وحدۃ الادیان و وحدۃ الایمان فی التوراۃ والانجیل والقرآن ہے۔ اس کتاب میں اس نے تینوں فرقوں کے مذہبی عقائد میں توفیق و تطبیق کی ہے اور اس کی رائے ہے کہ عموماً اختلاف غلط فہمی سے ہوا ہے۔ اس نے اس کتاب میں بھی لکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ بائبل میں کہیں نہیں ہے، اس لیے عیسائیوں کی ہٹ دھرمی ہے کہ مسلمانوں کے عمدہ عقیدۂ توحید کو نہ مانیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اور بائبل کی مطابقت کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ عیسائی مذہب کا جس کی بنیاد تثلیث پر ہے بالکل خاتمہ ہو جائے۔

آج کل ایک اور اخبار موسوم بہ اتحاد اسلامی موسیو کلافیل ایک فرنچ

بیرسٹر نے مصر میں جاری کیا ہے جس کا ایک کالم عربی میں اور دوسرا اسی مضمون کا
فرینچ میں ہوتا ہے اور جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں جو
مذہبی اور پولیٹیکل غلط فہمیاں مدت سے چلی آتی ہیں اور جنھوں نے اُن کے سوشل
اور پولیٹیکل تعلقات میں تلخی پیدا کر دی ہے اُن کو رفع کیا جائے اور اسی لیے اُس
نے اخبار مذکور ایسی دو زبانوں میں شائع کیا ہے جو تقریباً دنیا کے تمام حصوں میں
کم و بیش بولی یا سمجھی جاتی ہیں۔ پس جو ضرورت کہ اس فرانسیسی عالم کو اب محسوس
ہوئی ہے اُس کو سرسید نے اب سے ۳۵ برس پہلے بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا، اور
یہ بات ایک ہندوستانی مسلمان نے جس نے ایک قدیم اسلامی دارالخلافۃ
کی سوسائٹی میں نشو و نما اور پرانے اسکول میں تعلیم پائی ہو، کچھ کم تعجب انگیز نہیں۔

فرانس کا مشہور اورنٹیلسٹ گارساں دتاسی جس نے اردو لٹریچر کی تحقیقات
میں عمر صرف کی تھی، وہ ۱۸۸۳ء کے لکچر میں سرسید کی اس تفسیر کی نسبت لکھتا
ہے۔ "ایک نئی کتاب جس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں وہ سید احمد خاں کی
تصنیف ہے جو زمانۂ حال کے ہندوستانی مصنفوں میں سب سے زیادہ
مشہور مصنف ہے۔ یہی وہ مصنف ہے جس کی کتاب آثار الصنادید کا میں نے
پیرس کے ایشیاٹک جرنل میں ترجمہ کیا تھا، میں نے اس کتاب (یعنی تبیین الکلام)
کے عنقریب چھپنے کے پہلے خبر دی تھی اور اب میں خوشی سے اطلاع دیتا
ہوں کہ اس کا پہلا حصہ چھپ گیا ہے جس کا ایک کاپی میرے پاس موجود ہے
جو مصنف نے مہربانی کر کے مجھے ہدیۃً بھیجی ہے۔ اس کتاب سے صرف
یہی نہیں پایا جاتا کہ سید احمد خاں کو قرآن شریف اور ہماری کتب مقدسہ کا
پورا پورا علم ہے بلکہ بہت سی ایشیائی تصنیفات اور طرفہ تر یہ کہ بہت سی
یوروپین تصانیف سے اُن کو پوری پوری واقفیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔

کہ ان سب کو انھوں نے غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کیا ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ اس قدر یورپ کی تصانیف تک اُن کو کس طرح رسائی حاصل ہوئی حقیقت میں یہ کتاب وسیع علم کا نتیجہ ہے اور میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب اس زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقعہ ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اردو میں بلکہ ایشیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی مبسوط اور مکمل بحث کی ہو۔"

# بی بی کا انتقال

۱۲۷۸ھ ہجری مطابق ۱۸۶۱ء میں سرسید کی بی بی کا انتقال مراد آباد ہی میں ہو گیا جنھوں نے سید حامد اور سید محمود دو بیٹے اور ایک بیٹی صغیر سن چھوڑی تھی۔ اس وقت سرسید کی عمر چوالیس برس کی تھی اور قوائے جسمانی نہایت عمدہ تھے۔ اُن کے دوست نہایت اصرار کرتے تھے کہ دوسری شادی کر لو اور نیز تقاضائے سن بھی یہی تھا مگر جو تعلق کہ اُن کو بی بی کے ساتھ اُن کی زندگی میں تھا اُس کے نباہ کا خیال اور صغیر سن اولاد کی پرورش کا خیال اور سب سے زیادہ وہ بڑے بڑے ارادے جن کی دھن اُس زمانے میں اُن کو لگی ہوئی تھی اس امر سے مانع رہے اور اپنی تمام باقی زندگی محض تجرّد میں کمال عفت و پارسائی کے ساتھ گذاری اور اپنے تمام قوائے اور اپنی عمر کا افضل ترین حصہ قومی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔

# غازیپور کی بدلی اور اوّل وہاں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا

۱۲ مئی ۱۸۶۲ء کو سرسید کی تبدیلی مراد آباد سے غازیپور کو ہو گئی ہم اوپر لکھ

---

لہ یہ شخص پیرس کی یونیورسٹی میں اردو لٹریچر کا پروفیسر تھا اور ہمیشہ اس سبجکٹ پر لکچر دیا کرتا تھا۔

آئے ہیں کہ انتظام قحط کے بعد اُن کو ایک بہت بڑا یتیم خانہ کھولنے کا خیال ہوا تھا اور قحط سے پہلے وہ متعدد تدبیریں ملک اور قوم کی بھلائی کی کر چکے تھے۔ مگر بہت جلد یہ سب خیالات اُن کے دل سے محو ہو گئے، ان کو پختہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بیکار اور فضول ہیں۔ باوجودیکہ وہ غازی پور میں سرکاری کاموں کے علاوہ بہت سا وقت تبیین الکلام کی ترتیب اور اس کے چھپوانے کے اہتمام میں جو نہایت سخت کام تھا، صرف کرتے تھے۔

اسی حالت میں انھوں نے ایک اور تدبیر اپنے ہموطنوں کی بھلائی کی سوچی۔ انھوں نے خیال کیا کہ ملک میں علوم جدیدہ کی عام اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔ انھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا، کیونکہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے سوا اور قوموں کے لیے بھی کوئی ایسی ترغیب نہ تھی جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروج تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے لیے جو اس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتے تھے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔ جن اعلیٰ عہدوں کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت تھی اگرچہ ملکۂ معظمہ کے اشتہار میں اُن کے ملنے کی ہندوستانیوں کو امید دلائی گئی تھی مگر ابھی تک عملی طور پر اُن وعدوں کا چنداں ظہور نہ ہوا تھا۔

سر سید کو یہ خیال ہوا کہ مسلمان جو انگریزی تعلیم سے نفرت اور دہشت

کرتے ہیں اور ہندو جو انگریزی تعلیم کو محض نوکری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، دونوں کے دل میں انگریزی تعلیم کا نقش جمانے کے لیے ضروری ہے کہ کچھ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت اُن کے دل میں پیدا ہو۔ اس کے علاوہ اُن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول اور ربط و اتحاد پیدا ہو جس کا نہ ہونا انگریزوں اور ہندوستانیوں کے حق میں نہایت مضر ثابت ہو چکا تھا اور یہ تمام مقصد بغیر اس کے کہ ایک علمی سوسائٹی قائم کی جائے جس کے ممبر انگریز اور ہندوستانی ہوں اور جو سائنس اور انگلش لٹریچر کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا سکے، کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۸۶۳ء میں انھوں نے ایک تحریر اس عنوان سے کہ " التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند " چھاپ کر مشتہر کی جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ اس کے بعد وہ عملی طور پر لوگوں کو ادھر مائل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ غرض کہ اسی سنہ میں سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں قائم ہو گئی، تمام قواعد منضبط کیے گئے۔ ڈیوک اوف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے انھوں نے سوسائٹی کا پیٹرن ہونا منظور کیا اور ڈرمنڈ صاحب لفٹنٹ گورنر شمال مغرب اور مکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر پنجاب وائس پیٹرن قرار پائے، اور دوسرے دراز صوبوں کے بہت سے رئیس اور ذی عزت ہندو اور مسلمانوں نے اس کی ممبری قبول کی اور غازی پور میں ترجمہ کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا۔

سرسید نے جو اس سوسائٹی کے آنریری سکریٹری قرار پائے تھے اور درحقیقت وہی اس کا ہیولیٰ اور وہی اُس کی صورت تھے، سوسائٹی کے اغراض اور مقاصد مشتہر کرنے اور اس کے ساتھ پبلک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۶۔ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مجلس مذاکرۂ علمیہ میں ایک لمبا لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے مقاصد پر دیا جو اُن کی اردو اسپیچوں اور لکچروں کے ساتھ چھپ گیا ہے اور کلکتہ سے آتے جاتے جس شہر میں اُن کا گذر ہوا وہاں سوسائٹی کا چرچا کیا۔

# غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا

اسی سنہ میں اُنھوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی فکر کی۔ اگرچہ ضلع غازی پور کے اکثر ہندو مسلمان رئیسوں کی خود یہ خواہش تھی کہ غازی پور میں ایک مدرسہ قائم ہو، لیکن اوّل تو کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ مدرسہ کے انتظام اور حفاظت زرِ چندہ کی طرف سے لوگوں کو مطمئن کرے دوسرے مسلمانوں عموماً انگریزی کے نام سے بد کتے تھے سرسیّد نے ان دونوں مشکلوں کو حل کیا اور تھوڑا تھوڑا چندہ جمع ہونے لگا۔ اس مدرسہ کی عمارت اور اُس کے قیام کے لیے اسّی ہزار کا تخمینہ ہوا تھا جب چندہ کی مقدار سترہ ہزار تک پہنچ گئی تو اول مدرسہ کے لیے ایک مکان بنانا تجویز ہوا اور ۱۸۶۴ء میں ایک عام مجمع میں جس میں ہندوستانی اور تمام ضلع کے حکام شریک تھے، اس کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا اور تعمیر شروع ہوگئی۔

اس موقع پر سرسید نے ایک لمبی اسپیچ دی تھی جو اُن کی اسپیچوں اور لکچروں کے ساتھ چھپ گئی ہے یہاں ہم صرف وہ جملے جو بنیاد کا پتھر رکھے جانے کے بعد اُن کی زبان سے نکلے تھے، نقل کرتے ہیں۔ " اے خدا کے

بند و خدا کی مناجات کرو۔ خدا کے نام کی مدح کرو۔ خدا کا نام اس دم سے ابد تک مبارک ہوئے۔ آفتاب کے مطلع سے لے کر اس کے مغرب تک خدا کا نام ممدوح ہو۔ ہمارا خدا غریبوں کو خاک سے اٹھا لیتا ہے۔ محتاجوں کو کوڑے پر سے اٹھا کر بلند کرتا ہے۔ ہم کو اپنے خدا سے محبت رکھنی چاہیئے۔ اس نے ہماری آواز سنی۔ اس نے ہماری غریبی اور درماندگی پر نظر کی سو جب تک ہم جیتے ہیں ہمارا بدن اور ہماری جان اور ہمارا دل اور مرنے کے بعد ہماری روح خدا کی ستائش کرے گی۔"

"اے خدا ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی تھی۔ تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے بے شک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے پھیرتا ہے ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دلوں کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا جو صرف ہمارے ہی لیے مفید نہیں بلکہ ہمارے بعد جو بہت سی نسلیں آنے والی ہیں اُن کے لیے ایک روشنی ہے، تیرے سوا کسی کا مقدور نہ تھا کہ ہمارے دلوں کو جو تمام تر گناہوں اور برائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں ایسے نیک کام کی طرف پھیرتا اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے۔ تیری غریب مخلوق کے فائدے کے لیے رکھا ہے۔ تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اس کو قبول کر اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے اسی طرح بخیر اس کا انجام کر۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

یہ مدرسہ بھی مثل مدرستہ العلوم کے محض قومی چندہ سے سیلف ہیلپ کے اصول پر قائم کیا گیا تھا اور اُس کی ابتدائی کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ایک بڑا کالج بنانے کا ارادہ تھا۔ راجہ سر دیو نراین سنگھ اُس کے پیٹرن

اور وزیٹر قرار دیئے گئے تھے۔ متعدد کمیٹیاں اُس کے انتظام کے لیے قرار پائی تھیں۔ انگریزی، اُردو فارسی، عربی اور سنسکرت پانچ زبانوں کی تعلیم کا اس میں انتظام کیا گیا تھا۔ اگر سر سید کا چند سال وہاں اور قیام ہوتا تو کچھ عجب نہیں کہ وہ کالج کے درجہ تک پہنچ جاتا۔ مگر اُسی سال یعنی ۱۸۶۴ء ہی میں اُن کی تبدیلی علیگڑھ کی ہوگئی با اینہمہ اُس کی بنیاد ایسے مستحکم اصول پر رکھی گئی تھی کہ وہ مدرسہ آج تک وکٹوریہ اسکول کے نام سے غازی پور میں جاری ہے اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی اسی میں برابر ہوتی ہے۔

## غازی پور سے علیگڑھ تبدیل ہونا

۱۸۶۴ء میں سر سید غازیپور سے تبدیل ہو کر علیگڑھ میں جس کی عزت اور شہرت خدا تعالےٰ نے ان کی ذات سے وابستہ کی تھی، آ گئے۔ چونکہ غازیپور میں سائنٹفک سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا نا ممکن تھا۔ اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف وہ اپنے ساتھ علیگڑھ میں لے آئے اور مسٹر ولیم جنکس بریملی جو اُس زمانہ میں علیگڑھ کے جج تھے سوسائٹی کے پریسیڈنٹ قرار پائے۔ اُن کی توجہ سے سوسائٹی کے کاروبار کو نہایت ترقی ہوئی، ہندوستانی اور یورپین ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی جو اس وقت تک ایک عالیشان عمارت ولکشا چمن اور وسیع احاطہ کی صورت میں موجود ہے اور تقریباً تیس ہزار کی لاگت سے خاص سر سید کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوا ہے۔ اس کی بنیاد کا پتھر آنریبل ڈرامنڈ لفٹننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کے ہاتھ سے رکھوایا گیا تھا چنانچہ دو کتبے ہز آنر اور مسٹر بریملی جج علیگڑھ کے نام کے اُس کے سب سے بڑے

ہال ہیں اب تک لگے ہوئے ہیں۔

۱۴ فروری ۱۸۶۶ء کو مسٹر ولیمس کمشنر قسمت میرٹھ کے ہاتھ سے اُس کے افتتاح کی رسم ادا ہوئی۔ صاحب ممدوح نے افتتاح کے وقت جو تقریر کی تھی اُس کے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں انھوں نے کہا کہ "سید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے۔ تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ انھیں کا کام ہے اور وہی اس جلسہ کے بڑی ترقی دینے والے ہیں اور اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لیے ہم سب جمع ہوئے ہیں' وہی بانی ہیں ..... اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد خاں نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سب کے دلوں پر اُس کا اثر ضرور ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ انسٹیٹیوٹ اس بات کا سبب ہو کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب اُن کی مدد کریں اور اُن کا شکر بھی ادا کریں اے خدا! اس انسٹیٹیوٹ کو سرسبز کر"

اس مکان میں ہر مہینے متعدد جلسے ہوتے تھے اور مختلف مضامین پر جن سے لوگوں کو نئی نئی اطلاعیں حاصل ہوتی تھیں، لکچر دیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر کالکلی ہر مہینے ایک لکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو کہ سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔ مترجم، محرر، پریسمین چپراسی اور مالی وغیرہ تقریباً پانسو روپیہ[1] ماہوار کے تنخواہ دار سوسائٹی میں ملازم تھے۔ چند برس کے عرصہ میں بہت مفید کتابیں سوسائٹی نے انگریزی سے ترجمہ کرا کے چھاپیں شلاً الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، رولن کی تاریخ مصر قدیم، تاریخ

---

[1] عملۂ ترجمہ ۲۲۵ روپیہ ماہوار اور عملۂ مطبع ۲۴۳ روپیہ ماہوار پاتا تھا اور درستی و انتظام مکان سوسائٹی کیلیے ۱۰ روپیہ ماہوار مقرر تھا۔ سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۸۶۷ء جلد ۲) ۱۲

یونان قدیم، اسکاٹ برن کا رسالۂ علم فلاحت، سلینیر کا رسالہ سیاست مدن، سرجان میلکم کی تاریخ ایران، ریورنڈ ایکسوس کی تاریخ چین کا فارسی ترجمہ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے سوا اخبار بھی مدت تک بہت کثرت سے اس سوسائٹی میں آتے رہے چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ۱۸ اخبار اور میگزین انگریزی اور ۲۶ اخبار اردو، فارسی، عربی، اور سنسکرت کے ہندوستان اور ممالک غیر سے یہاں آتے تھے۔

سرسید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت کے جس پر فی الحقیقت سوسائٹی کا دارو مدار تھا اور علاوہ ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے اور طرح طرح سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پریس جو انھوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے تبیین الکلام کے چھاپنے کو خریدا تھا اور سوسائٹی کی تمام روئدادیں اور تمام انگریزی اور اردو کاغذات ابتدا سے اسی پریس میں چھپتے تھے، جب تبیین الکلام کی چھپائی موقوف ہوگئی تو کل سامان پریس کا ایک عام جلسہ میں سوسائٹی کو مفت دیدیا چنانچہ جارج ہنری لارنس نے جو اُس جلسہ میں چیئرمین تھے سرسید کی نسبت یہ الفاظ کہے کہ ,, اگرچہ سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے ہی سے مقروض ہے مگر اب اُس احسان کو اس عالیشان عطیہ نے اور زیادہ کر دیا ہے۔

نواب سکندر بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بھوپال نے جب یہ سُنا کہ سید احمد خاں کی کوشش سے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے تو جون ۱۸۶۶ء میں انھوں نے بطور اظہار خوشنودی کے ایک الماس کی انگوٹھی قیمت ایک ہزار روپیہ خاص سرسیّد کے واسطے بھیجی، سرسید نے جلسۂ عام میں وہ انگوٹھی سوسائٹی کے اخراجات کے لیے سوسائٹی کو دیدی۔ اس کے سوا انھوں نے محض سوسائٹی کی امداد کے لیے فوجداری اور کلکٹری کے مختاروں کو قانون پر لکچر دینا اختیار کیا اور جو فیس ان سے وصول ہوتی رہی وہ سوسائٹی

کی نذر کرتے رہے۔

۳۰۔ دسمبر ۱۸۶۵ء کو انھوں نے سوسائٹی کی طرف سے گورنمنٹ شمال مغرب میں یہ درخواست بھیجی کہ سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ اضلاع شمال مغرب کے طریقۂ کاشتکاری پر کتابیں تالیف کرے۔ اگر گورنمنٹ کچھ سالانہ امداد کرتی رہے تو سوسائٹی اس کے معاوضہ میں کتابیں دیا کرے گی اور کتابوں کا تالیف کرنا سرسید نے خود اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اگست ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی سے پانسو روپیہ سالانہ کی کتابیں خریدنی منظور کرلیں۔ مگر یہ کتابیں لکھی نہیں گئیں۔ صرف مضامین کی طولانی فہرست جو سرسید نے سوسائٹی میں پیش کی تھی وہ سوسائٹی اخبار کے پرچہ نمبر ۳۲ جلد اول میں درج ہے۔ اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا اور اگر سرسید اس کے سرانجام دینے میں مصروف ہو جاتے تو ان کو مدت تک کسی اور کام کی فرصت نہ ملتی۔

## برٹش انڈین ایسوسی ایشن

۱۰۔ مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کی تحریک سے بہت سے رئیس ضلع علیگڑھ اور اس کے نواح کے اور چند یوروپین افسر سوسائٹی کے مکان میں جمع ہوئے اور سرسید نے ایک لمبی اسپیچ کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں بڑی وقعت ہندوستان کو یہ تھی کہ اس کے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ اوف ڈائرکٹرز تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت ہی کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان

کی ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے اور اب ہندوستان کے امورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا. پس اس غرض کے لیے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں ۔ ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے ان کو مطلع کرسکیں اور جس طرح اُن انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایسوسی ایشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے اسی طرح ہم بھی تمام اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اُس کے ذریعے سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں "

اس تجویز کو تمام حاضرین نے پسند کیا اور اسی وقت نو معزز ہندو اور مسلمان اس کے ممبر مقرر ہوئے اور اس جماعت کا نام " علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا گیا "

اس ایسوسی ایشن نے چند مفید کام جب تک کہ سرسید علیگڑھ میں رہے انجام دیے ۔ مدت تک اس کی خط وکتابت انگلستان کی ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ساتھ رہی ۔ اس نے گورنمنٹ ہند کو ایک نہایت مفصل عرضداشت بھیج کر مسافرانِ ریل کی اُن تکلیفوں کے تدارک کی طرف متوجہ کیا جو ابتدا میں اُن کو حد سے زیادہ اٹھانی پڑتی تھیں، چنانچہ اس عرضداشت پر بہت سی شکایتیں رفع کی گئیں. نیز اس نے گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلائی کہ جس قانون کی رو سے کتابوں کی روانگی کا محصول دوچند کیا گیا ہے اس سے ہندوستان کی علمی ترقی کو صدمہ پہنچتا ہے اس لیے ایک آنہ فی دس تولہ محصول جو بک پیکٹوں پر لیا جاتا ہے بجائے اس کے آدھ آنہ فی دس تولہ مقرر کیا جانے ۔ اسی طرح

اور بعض مفید تحریکیں اُس کی طرف سے ہوئیں مگر ۱۸۶۷ء میں جب سرسید کی تبدیلی بنارس کو ہوگئی اسی وقت اس الیوسی ایشن کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

# اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں قائم ہوئیں

۱۸۶۷ء ہی میں سرسید کی تحریک سے زمینداران علیگڑھ نے ایک درخواست گورنمنٹ میں بھیجی کہ جب کہ علاوہ جمع مالگذاری کے ایک روپیہ واسطے خرچ تعلیم کے ہم سے لیا جاتا ہے تو قرین انصاف یہ ہے کہ انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی دخل دیا جائے اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم ہو جس میں حکام ضلع اور افسران سررشتہ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل ہوں۔ نواب لفٹنٹ گورنر نے اول امتحاناً ضلع علیگڑھ اور اٹاوہ میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر ہونا منظور کیا اور آخر کار تمام اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر ہوگئیں۔

پھر جب معلوم ہوا کہ کمیٹیوں میں ہندوستانی ممبروں کا عدم اور وجود برابر ہے اور یورپین حاکموں اور افسروں کے سامنے وہ آزادی اور دلیری سے کبھی ان کے خلاف دم نہیں مار سکتے تو ۱۸۷۲ء میں سرسید نے ایک یادداشت لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "جس غرض سے کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ اُن کے قیام سے پوری نہیں ہوئی کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے ہیں جن کو شکست دینا وہ اپنا قدرتی حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر کمیٹی میں اُن موم کی مورتوں کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو میڈم ٹساڈ کی نمائش گاہ میں تھیں۔"

اگرچہ ۱۸۷۱ء میں ایجوکیشنل کمیٹیوں کے قواعد ترمیم ہوکر از سرنو جاری

کیے گئے مگر چونکہ اُن سے بھی ہندوستانیوں کی مداخلت کو کچھ وسعت نہ ہوئی
تو سرسید نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اُن شکایتوں کا پھر
اعادہ کیا اور کہا کہ جن مقاصد کے واسطے کمیٹیوں کے تقرر کی ضرورت تھی وہ
حاصل نہ ہوئی اور اپنی رائے کے موافق کمیشن میں بہت سی ایسی اصلاحیں
پیش کیں جن سے ورنیکلر تعلیم کے موجودہ انتظام کی اصلاح کی جا سکے۔

# سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالنا

۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو
علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے اُن کے آخیر دم تک جاری رہا۔ یہ اخبار
پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا پھر ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا۔ اس اخبار کا اڈیٹوریل اہتمام
ابتدا سے آخیر تک سوائے اُن ایام کے جب کہ سرسید علیگڑھ میں نہیں رہے
انھیں کے ہاتھ میں رہا۔ گو ایک مدت سے بسبب اس کے کہ مدرسہ کا کام حد
سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور سرسید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔
اُن کو اُس میں کسی بڑے آرٹیکل کے لکھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ مگر تعلیم کے متعلق
بالخاص اپنے کالج کے متعلق یا جب کبھی ملک یا قوم میں کوئی مُہتم بالشان واقعہ
پیش آتا تھا، وہ ہمیشہ اُس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔

اول اوّل سرسید زیادہ تر اُس میں پولٹکل معاملات پر مضامین اور نوٹ
لکھتے تھے اس سبب اُس کی ابتدائی جلدوں کو اُن کے پولٹکل ورکس کا ایک
مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم
انگریزی میں اور ایک اُردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اُردو میں الگ اور انگریزی
میں الگ چھاپے جاتے تھے۔ اس لیے اُس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں

فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور اُن میں پولٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اُس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کرکے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔ اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آج تک کوئی پرچہ ہندوستان میں اس اخبار کے سوا ایسا نہیں نکلا جس سے یہ دونوں مقصد پورے ہو سکیں۔

اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے، جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی علاوہ اُن لیڈنگ آرٹیکلوں کے جو وہ خود لکھتے تھے، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت، یا تعلیم، یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیئے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شائع ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانۂ حال کی نئی اطلاعیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچہ کے اجرا سے شروع ہوئی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی پولٹکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک

کسی دیسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔

جو ماٹوائس نے اپنے لیے اختیار کیا تھا اُس کو ہمیشہ نصب العین رکھا۔ وہ ہمیشہ رعیت کو آزادی اور اطاعت سکھاتا تھا اور اُن کی خیر خواہی اور وفا داری کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کرتا تھا۔ اُس کی آواز ہمارے عام دیسی اخباروں کی طرح کوئی معمولی آواز نہ تھی، بلکہ جن معاملات پر وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا ہمیشہ اُس کی آواز پر کان لگائے جاتے تھے اور اُس کو غور سے سُنا جاتا تھا۔ اور اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اُس کا لکھنے والا اور اہتمام کرنے والا سید احمد خاں تھا۔ گورنمنٹ اور حکام اس بات کو تسلیم کیے ہوئے تھے کہ علیگڑھ کا اخبار تمام ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور سمجھ دار مسلمانوں کے خیالات کا ارگن ہے۔ کتاب "پلیزر اوف دی انڈین امپائر" کا مصنف اپنی کتاب میں ایک خاص موقع پر لکھتا ہے کہ "علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ سے جو مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اگر پچھلے دو سال کے مضامین جمع کیے جائیں تو ہندوستان کے قابل اور معزز مسلمانوں کی رائے کا، اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں، ایک عجیب اور مفید مجموعہ نسبت جنگ روم و روس اور روس و افغانستان اور روس و ہندوستان کے بنجائے گا۔" اسی کتاب میں علیگڑھ گزٹ کی رفعت اور اعتبار کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "علیگڑھ گزٹ جس کے اڈیٹر سید احمد خاں تھے اور اب بھی وہی معلوم ہوتے ہیں، شمالی ہندوستان میں سب سے عمدہ اخبار ہے" اس کے بعد اخبار کے بعض مضامین کا خلاصہ لکھ کر خاص ملکی معاملات پر مسلمانوں کی رائے کا موازنہ کیا ہے۔

جس قدر مضامین ۱۸۶۶ء سے اخیر تک اس اخبار میں خاص سرسید کے قلم سے لکھے ہوئے نکلے اگر اُن کو ایک جگہ فراہم کیا جائے تو بلا مبالغہ چند ضخیم

جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھیراتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اُس نے اپنی طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہمعصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دلآزاری روا نہیں رکھی۔ اُس نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اُس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ کبھی کسی غیر قوم کے عہدہ دار کی ترقی سے ناراضگی یا ناخوشی ظاہر نہیں کی۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اُس کے اہل کاروں پر زہر نہیں اُگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔ وہ جس طرح اپنی قوم کے اکابر اور نامور لوگوں کے مرنے پر افسوس کرتا رہا اسی طرح غیر قوموں کے مشہور اور نامور لوگوں کی وفات پر ہمیشہ اُس میں دردناک اور افسوسناک مضمون نکلتے رہے۔ باوجودیکہ وہ گورنمنٹ اور اُس کے مدبروں پر اکثر نکتہ چینی کرتا تھا مگر اعتدال اور ادب اور تعظیم کو جو ایک محکوم قوم کا زیور ہے اُس نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ اُس نے برخلاف اپنے ہمعصروں کے جن کی زبان درازی سے اول لارڈ لٹن کے زمانے میں اور اب لارڈ ایلگن کے عہد میں اُن کی آزادی چھین لی گئی، اپنے معتدل رویہ سے سب پر ظاہر کر دیا کہ سچی آزادی اپنی آزادی کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھنا ہے نہ اپنی بے اعتدالیوں کی بدولت اُس کو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھنا۔

ایک اور خصوصیت اس اخبار کی اس کی باقاعدگی ہے جو اکثر دیسی اخباروں

میں مفقود ہے اور اُس کی خبروں کا نہایت معتبر ذریعوں سے لیا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بے اصل قصوں اور بے سروپا خبروں سے مبرا دیکھا گیا۔ اُس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند انگریزی اخبار رہے۔ کبھی کوئی خبر کسی نا معتبر کاغذ سے (الا ماشاء اللہ) اُس میں نہیں لی گئی۔ دنیا کے ہر ایک بڑے واقعہ کی نسبت شروع سے اخیر تک اس میں تمام خبریں مسلسل اور ترتیب وار درج ہوتی تھیں جن سے اُس واقعہ کی ایک مختصر ہسٹری بقید تاریخ مرتب ہو سکتی تھی۔ اُس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ بتیس برس برابر جاری رہا اس عرصہ میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہوگا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا ہو۔ باوجودیکہ چندہ کی آمدنی سوسائٹی میں مدت سے بالکل نہیں رہی تھی اور اس لیے پچھلے برسوں میں وہ کئی ہزار کی مقروض ہوگئی تھی۔ مگر سرسید نے جس طرح ہو سکا اخبار کو کبھی بند ہونے نہیں دیا۔

## بنارس کی تبدیلی

۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو سرسید عہدۂ جج سمال کاز کورٹ پر ترقی پاکر علیگڑھ سے بنارس چلے گئے یہاں سے چلتے وقت وہ تمام کار و بار سوسائٹی کے راجہ جیکشن داس سی۔ ایس۔ آئی کو جو کہ وہ اُس وقت علیگڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے، سپرد کر گئے۔ انھوں نے نہایت توجہ اور دلسوزی سے سوسائٹی کے کام انجام دیئے اور سوسائٹی کی جو عمارتیں سرسید کے زمانے میں پوری نہیں ہوئی تھیں اُن کو پورا کیا۔

سرسید بنارس میں بھی سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کو برابر تقویت دیتے رہے اور اُن کے مفید آرٹیکل اور مضامین اسی طرح سوسائٹی کے

اخبار میں برابر چھپتے رہے۔ اگرچہ سر سید کا تعلق ملازمت کے اخیر زمانہ یعنی جولائی ۱۸۷۶ء تک بنارس کے ساتھ رہا لیکن چونکہ وہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے ولایت چلے گئے تھے۔ اس لیے پہلی بار بنارس میں اُن کا قیام ایک برس اور ساڑھے سات مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔ اُن کے اس قلیل زمانے کے بھی چند کام ذکر کے قابل ہیں۔

## ورنیکلر یونیورسٹی کے لیے تحریک

یکم اگست ۱۸۶۷ء کو جب کہ سر سید علیگڑھ ہی میں تھے انھوں نے ایک درخواست برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال مغرب کی طرف سے وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند کی خدمت میں بھیجی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا۔

۱۔ یہ کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔

۲۔ یہ کہ دیسی زبان میں انھیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جس میں کہ اب طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں۔

۳۔ جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں بجلدوی تحصیل لیاقت عطا ہوتی ہیں وہی سندیں اُن طلبہ کو عطا ہوا کریں جو انھیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔

۴۔ یہ کہ یا تو ایک اُردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کیجائے یا شمال مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔" اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس غرض کے لیے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہوگا سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ انجام دے گی۔

اس درخواست پر گورنمنٹ ہند نے بڑی توجہ ظاہر کی چنانچہ جو چٹھی سکرٹری گورنمنٹ ہند کی مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۶۷ء سرسید کے نام بمقام بنارس موصول ہوئی اس میں لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل اور تمام لوکل گورنمنٹیں نہایت خوشی سے اُن تمام کوششوں کی قدر کریں گے جو ایسی سوسائٹیاں جیسی کہ آپ کی سوسائٹی ہے یا خاص خاص آدمی اُس مقصد یعنی انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے اکو ترقی دینے کے لیے کریں گے جو آپ کی سوسائٹی کو اور گورنمنٹ کو برابر منظور نظر ہے۔"
اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ فقط یونیورسٹی کے کورس کی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ ہو جائیں بلکہ علوم و فنون کے وسیع دائرہ میں طلبہ کو مستعد اور تیار کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اس مطلب کے لیے کافی ذخیرہ دیسی زبان میں اب تک موجود نہیں ہے اس لیے کچھ عرصہ تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے یہ بات حاصل کرنی ہوگی۔" اسی چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل اُن تدبیروں سے خاص رضامندی ظاہر کرتے ہیں جو علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے یورپ کے علوم و فنون کو دیسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے اختیار کی ہیں۔

اس چٹھی کے آنے سے بڑے بڑے لائق تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ترجمہ کرنے کی حامی بھری تھی جن میں تین نامور آدمی دلی کے بھی تھے، ماسٹر پیارے لال، مولوی ذکاء اللہ اور پنڈت دھرم نرائن۔ اور جب اِن لوگوں کی آمادگی گورنمنٹ ہند کو معلوم ہوئی تو اس نے اس بات پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ اس کے بعد وزیر ہند کی چٹھی مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۸ء بنام گورنر جنرل کشور ہند صادر ہوئی جس میں ایسوسی ایشن کی تجویزوں سے پسندیدگی ظاہر کی گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کا چرچا شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ

گروہ میں بہت پھیل گیا تھا اور وہ لوگ اُس کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپریل ۱۸۶۸ء میں اسی یونیورسٹی کے متعلق دہلی سوسائٹی میں جبکہ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب بھی وہاں موجود تھے ایک مباحثہ ہوا اور گورنمنٹ پنجاب میں اس مضمون کا ایک میموریل بھیجا گیا کہ "یہ یونیورسٹی لاہور میں اور ترجمہ کرنے اور کتابیں بنانے کے لیے ایک کمیٹی دہلی میں قائم کیجائے اور اگر دونوں صوبوں کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے تو اس کا مقام دلّی ہونا چاہیے"

اول اول سرسید بہت سرگرمی کے ساتھ اپنی عادت کے موافق اس یونیورسٹی کے قیام کی تدبیروں میں مصروف رہے۔ گورنمنٹ ہند میں انھوں نے اطلاع دی کہ "ترجمہ کا بوجھ سوسائٹی اپنے اوپر گوارا کرتی ہے مگر گورنمنٹ سے یہ درخواست کرتی ہے کہ جو روپیہ وہ اشاعت تعلیم کی غرض سے ہندوستان میں خرچ کرتی ہے۔ اُس میں سے اگر کسی قدر مناسب ہوا کرے تو سوسائٹی کی اعانت اور تقویت کرے" یہ بھی لکھا کہ "سوسائٹی صرف یونیورسٹی کے کورس کا ترجمہ کرنا نہیں بلکہ علوم و فنون کے دائرہ کو فراخ کرنا چاہتی ہے اور امید وار ہے کہ اگر کاپی رائٹ کا ایکٹ ۲۰۔۱۸۴۷ء سوسائٹی کے مقصد میں حارج ہوا تو اُس قانون کی ترمیم کیجائے اور اگر نہ ہو تو اُس کی تشریح کیجائے"

مگر معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اُس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور انگریزی کو صرف بطور سکنڈ لینگویج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی چنانچہ سرسید نے بنارس انسٹیٹیوٹ کے ایک جلسہ میں جو اسی معاملہ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا یہ تقریر کی تھی کہ "مسٹر کیمپسن (ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اضلاع شمال مغرب) نے ایسوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان

کے سکھلائی جائے اور اُس کو اعلیٰ تعلیم وتربیت کا ذریعہ نہ گردانا جائے بلکہ اُس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اُس کے ساتھ ایک اور سررشتہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم وفنون اور خیالات دیسی زبان کے ذریعہ سے بہ کثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں. پس یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جُداگانہ ورنیکلر یونیورسٹی خاص ان اضلاع میں قائم ہو" اس کے بعد اپریل ۱۸۶۸ء میں جبکہ نواب لفٹننٹ گورنر بھی بنارس انسٹیٹیوٹ میں موجود تھے سرسید نے پھر اسی تقریر کا اعادہ کیا اور کہا کہ "مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا تنزل ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروڑہا آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیونکر پہنچے"

غالباً زیادہ تر اسی وجہ سے کہ گورنمنٹ کا ارادہ انگریزی تعلیم کو گھٹا دینے کا تھا سرسید نے ورنیکلر یونیورسٹی کا خیال چھوڑ دیا ہوگا. مگر اس کے سوا خود ورنیکلر یونیورسٹی کے قائم کرنے میں بعض مشکلات ایسی تھیں جن کا حل کرنا نہایت دشوار تھا. چنانچہ سرسید نے اسی باب میں جب مسٹر پیرسن انسپکٹر مدارس حلقہ راولپنڈی سے رائے دریافت کی تو انھوں نے اُس کے جواب میں ایک مفصل تحریر بھیجی جس میں ترجمہ کرنے کی اصلی اور حقیقی مشکلات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی تھیں. اس تحریر سے بھی ضرور اُن کے ارادوں میں تزلزل واقع ہوا ہوگا پھر انھیں دنوں میں اُن کو سفر انگلستان کا خیال پیدا ہوگیا جس میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں اور اُن کا حل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام تھا. ان وجوہ سے سرسید اور اُن کے ساتھ جتنے آمین کہنے والے تھے سب ورنیکلر یونیورسٹی کے خیال سے دست بردار ہوگئے. جو موانع اس یونیورسٹی کے قائم ہونے میں پیش آئے اگر اُن میں سے کوئی امر پیش نہ آتا تو بھی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر

نہیں آتی تھی، ہندوستانیوں کے اختلافات ضرور اس میں رخنہ ڈالتے دہلی سوسائٹی کے ممبر یہ چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا مقام دلّی ہونا چاہیے اور سائنٹفک سوسائٹی اور بنارس انسٹیٹیوٹ کی ضرور یہ خواہش ہوتی کہ اُس کا مقام شمال مغربی اصلاع کا کوئی شہر ہو۔ اس کے سوا اُردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اردو زبان اور ہندؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کیجائے۔ اور باوجود تسلیم کرتے اس بات کے کہ ہندی زبان سر دست ترجمہ کی قابلیت نہیں رکھتی اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اُس کی ترقی میں کوشش کر کے اُس کو ترجمہ کے لائق بنایا جائے۔ اگر یہ اصرار زیادہ بڑھتا اور ضرور بڑھتا تو گورنمنٹ آخرکار یہ فیصلہ کرتی کہ کیوں اندھا نیوتنا اور کیوں دو بلائے۔

## سوسائٹی کی امداد کی ایک خاص تدبیر

۱۸۶۷ء ہی میں سر سید بتقریب تعطیل دسہرہ بنارس سے علیگڑھ میں آئے اور ضلع علیگڑھ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ ابتک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے، کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اُس کی آمدنی مستقل ہو جائے۔ بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے اور اس کی شرائط واجب العرض میں بروقت بندوبست کے درج ہو جائیں، تاکہ نسلاً بعد نسلاً ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھ عذر نہ کرنے پائے چنانچہ ۱۲- اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سوسائٹی کے جلسہ میں سر سید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی

مع اُن کی عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۲ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علیگڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیجدی تاکہ وہ اُس کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعہ سے روانہ کر دیے۔ اُس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اُس کے جواب میں جو چٹھی پرائیویٹ سکرٹری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۶۱ء بنام سرسید کے موصول ہوئی اُس میں حضور وائسرائے کی طرف سے رضا مندی ظاہر کی گئی تھی۔

# ہومیوپیتھک علاج کی حمایت

غالباً بنارس ہی میں پہنچ کر اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کے طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ علاج کا عمدہ اور بے خطر نہیں ہے۔ اور جیسا کہ اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جو بات یا جو کام یا جو تجویز ملک کے لیے مفید سمجھی اُس کے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، انھوں نے ہومیوپیتھک علاج کی حمایت کرنے اور تقویت دینے کا ارادہ کیا۔ اسی ۱۸۶۷ء میں اُنھوں نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ہومیوپیتھک طبابت کا ہندوستان میں پھیلانا اور ہندوستانیوں کو اُس کی طرف مائل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے پریزیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکرٹری سرسید قرار پائے اور کمیٹی کی تجویز سے ۲۵۔ ستمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں ایک شفاخانہ بنام "ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہوسپٹل" کھولا گیا۔ سرسید نے ہر طریقہ سے جو اُن کے اختیار میں تھا لوگوں کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے بعضے اپنے دوستوں کو جو کسی مرض مزمن میں مبتلا تھے بنارس میں بلانے کے لیے خط لکھے اور جو وہاں نہ پہنچ سکے ان کے لیے دوائیں بھجوائیں۔ اِس

طرح اُس شفاخانہ کا چرچا چند روز میں نزدیک و دور ہوگیا۔ پانیونیر کے پرچہ مورخہ ۴۔ دسمبر ۱۸۶۷ء میں اس شفاخانہ کی نسبت یہ چھپا تھا کہ "پہلے ہی مہینے میں پانسو سولہ بیمار معالجہ کے لیے ہوسپٹل میں آئے، حالانکہ اس سے پہلے کوئی اس طریقۂ علاج سے مطلق واقف نہ تھا" ۱۷۔ دسمبر ۶۷ء کو سرسید نے ایک طول طویل لکچر ہومیوپیتھک طبابت کی تاریخ اور اُس کے اصول پر اور اس بات پر کہ یہ طریقۂ علاج تمام طریقہ سے زیادہ مفید اور بے خطر ہے کمیٹی کے عام جلسہ میں دیا اور ۶۸ء میں ایک رسالہ ہیضہ کے علاج پر بموجب اصول ہومیوپیتھک کے لکھا۔ یہ لکچر اور یہ رسالہ سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں چھپا ہوا موجود ہے۔

## اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت

سرسید ہمیشہ سے جیسا کہ اُن کی مذکورہ بالا ملکی خدمات سے ظاہر ہوتا ہے اس اُصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم کے ہل مل کر رہیں کسی طرح ممکن نہیں چنانچہ اُن کے تمام پچھلے کاموں میں اس اصول کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہوگئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا۔

انگریزی مدارس کی تعلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو مستفید ہوتے تھے تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں یا اُن کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقہ پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی بُرائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں۔ اس تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت

ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو روابط دوستی اور اتحاد بلکہ یگانگت کے قدیم ہندو مسلمانوں میں تھے وہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں بالکل باقی نہ رہے اور اس کا ظہور آج ہر شخص علانیہ تمام ہندوستان میں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔

اس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا جو عزت اور جاہ و منصب اور امور سلطنت میں شرکت تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی مسلمان اپنے غرور اور تعصب یا غفلت و بے پروائی یا افلاس کے سبب اس سے محروم تھے، اور واقعہ ۵۷ء نے ان کو اور بھی مٹا دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غالب پارٹی اپنے نئے اقتدار کا جو اس نے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ اور امنگیں بھری ہوئی تھیں مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی اور حیلہ ہاتھ نہ آئے تو اسی بہانے سے کہ دریا میں خاک کیوں اڑاتے ہو اس سے دست و گریباں ہو جائے، اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی و فارسی کے صرف کسی قدر اسما اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے اس کو ہمارے ہموطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کیجائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو

مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ "انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

غرض کہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اُس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اُس کے لیے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں بھی یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ اُنھیں دنوں میں لفٹنٹ گورنر بنگال بہادر کی سائنٹفک سوسائٹی میں آئے اور سوسائٹی کی طرف سے اُن کو ایڈریس ایسی اردو میں دیا گیا جس میں عبارت آرائی کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے کیے گئے تھے اور اس کا سمجھنا ایک ایسے یورپین حاکم کو جو ہمیشہ بنگالہ میں رہا ہو آسان نہ تھا۔ بہار کے تعلیم یافتہ ہندو پہلے ہی سے تحریک کر رہے تھے کہ جس

طرح بنگالہ میں بنگلہ زبان اور بنگلہ خط عدالتوں میں جاری ہوگیا ہے اسی طرح
صوبۂ بہار میں بہاری زبان اور کیتھی حرف جاری کیے جائیں۔ چونکہ ہزآنر ایڈریس کے
بہت ہی کم الفاظ سمجھے تھے، انھوں نے کہا کہ جس زبان میں یہ ایڈریس پڑھا گیا
ہے یہ ہرگز ملکی زبان نہیں ہے اور یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی چنانچہ
انھوں نے چند روز بعد حکم دیدیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں کیتھی حرف اور
جو زبان کیتھی حرفوں میں لکھی جاتی ہے جاری ہو۔ ہرچند مسلمانوں نے اور بہت
سے قدیم وضع کے ہندوؤں نے بھی کوشش کی کہ وہ حکم ملتوی رہے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا

اس واقعہ سے شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں کا زیادہ حوصلہ بڑھا اور
ان کی کوششیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہونے لگیں۔ الہ آباد کی صدر مجلس میں
چند جلسے اس مسئلہ کی تحریک کے لیے منعقد ہوئے اور آخر کار مجلس کے
سکرٹری بابو سرودا پرشاد سنڈیال نے اس باب میں سرسید سے خط و کتابت
شروع کی۔ سکرٹری کی متعدد چٹھیاں آئیں اور سرسید بطور اختلاف رائے کے
ہر ایک کا جواب دیتے رہے اور یہ مباحثہ اخباروں میں مشتہر ہوتا رہا۔ آخر
سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت کی اور سوسائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل
شائع کیے۔ الہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں اور بڑے بڑے محضر جن پر بیشمار
ہندوؤں کے دستخط تھے گورنمنٹ میں بھیجی۔ سناگیا ہے کہ مسٹر کیمپن ڈائرکٹر
سررشتۂ تعلیم نے بھی اس کمیٹی کی تائید کی مگر کمیٹی کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور
غالباً سر جان اسٹریچی کی گورنمنٹ میں یہ تحریک اس بنا پر نامنظور ہوگئی کہ فارسی
خط اور اردو زبان کی اشاعت بہ نسبت ناگری اور بھاشا کے بہت زیادہ تھی۔

۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے ایجوکیشن
کمیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا پھر موقع ملا۔ اس دفعہ پہلے سے بھی

زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندؤوں نے اُردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر اور میموریل کمیشن میں پیش کیے گئے۔ چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایت اُردو قائم کی اور میموریل اور محضر کمیشن میں بھیجے۔ مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقہ سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا بلکہ ایک بہت بڑا پولٹکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ پس اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔

اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی حضور سر انٹونی مکڈانل لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گذرانا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اُردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانہ میں ہجوم رنج والم کے سبب ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اُسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اُردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اُس کو اس باب میں بذریعۂ تحریر کے کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہانتک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔ اُن کو یقین ہو گیا

تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اس لیے وہ اپنے
ہندو دوستوں کی ناراضی کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے۔ جس طرح وہ ہندستانیوں
کے انگریزی لباس اور انگریزی طرزِ معیشت پر انگریزوں کے اعتراضات کو
ہمیشہ اُن کی تنگدلی اور غرور پر محمول کرتے تھے اور کبھی اُن کے اعتراضوں کا
جواب دینے سے نہ چوکتے تھے، اسی طرح انھوں نے اُردو زبان کی مخالفت
پر کبھی سکوت اختیار نہیں کیا یہاں تک کہ مرتے مرتے بھی وہ اس ڈیوٹی کو ادا
کیے بغیر نہیں رہے۔ وہ اپنے آرٹکل کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "غالباً اس
وقت اُن کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس
صوبہ کے ہز آنر لفٹننٹ گورنر بہادر اس زمانہ میں جب کہ صوبۂ بہار میں کیتھی حرف
اور بہاری زبان بعوض اُردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر و
مجسٹریٹ اور معاون اس تجویز کے تھے۔ پس ان صوبوں میں بھی ہندی وناگری
حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے، اور شاید یہ غلط خیال بھی اس
پُرانے مردہ مضمون کے اُٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ
کی نظرِ عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ اُن کو ناشکرا سمجھتی ہے۔"
اس کے بعد انھوں نے میموریل کے خلاف اُردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح
پر دلیلیں پیش کی ہیں۔ اگرچہ اس وقت ہز آنر نے کورٹ کی زبان میں کسی تبدیلی
کی ضرورت نہیں سمجھی مگر جو کچھ انھوں نے میموریل کے جواب میں فرمایا اُس سے
صاف پایا جاتا ہے کہ آیندہ ایسی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔

اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں کوئی زبان اُردو
سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ملک کے بعض
حصوں میں بہ نسبت بعض کے کم بولی جاتی ہے مگر ایسا کوئی حصہ نہیں جہاں

اُردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں. خود گورنمنٹ اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہے اور اسی بنا پر ۱۸۳۵ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اُردو قرار دی گئی. اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ تامل بھی ہو تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہاں کی قومی زبان اُردو ہے. یہ صوبہ اُن دو شہروں سے گھرا ہُوا ہے جو اُردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں، یعنی دلّی اور لکھنو. اس صوبہ کے ہندو عموماً اُردو سے ایسے ہی مانوس ہیں جیسے مسلمان. مگر حضرت تعصّب وہ ذات شریف ہیں جن کا مقولہ ہے کہ "من لجہنم لیکن نخنۂ یاراں تباہ گردد" فرانس کے مشہور اورنٹیلسٹ گارساں دتاسی جنھوں نے اُردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے وہ اسی متنازع فیہ مسئلہ کی نسبت اپنے ایک لکچر میں لکھتے ہیں کہ "ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو اُن کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے." اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوال سلطنت کے بعد اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں مگر انھوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہموطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں. لیکن ہم کو اطمینان رکھنا چاہیے کیونکہ جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں سے تعصب اور نفرت کرنا سکھایا ہے وہی آگے چل کر اُن کو یہ سبق دے گی کہ جب تک ہندو مسلمان مل جُل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے مصالح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک برٹش انڈیا میں اصلی عزت حاصل نہیں کر سکتے.

# رسالہ احکام طعام اہلِ کتاب

۱۸۶۶ء میں سرسید کے پاس ایک سوال بطور استفتا کے آیا تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے پر کوئی حرام چیز نہ ہو کھانا پینا درست ہے یا نہیں؛ سرسید نے اُس کا جواب آیات و احادیث کے حوالہ سے لکھ دیا کہ جائز ہے۔ اور ہندوستان کے سوا تمام دنیا کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ برابر کھاتے پیتے ہیں۔ یہ جواب ۱۴ ستمبر ۱۸۶۶ء کے سوسائٹی کے اخبار میں چھپا۔ اُس پر ایک سید صاحب نے اڈیٹر کے نام لکھنو سے ایک چٹھی لکھی اور سرسید کے جواب پر نہایت خوشی ظاہر کی اور لکھا کہ "میں اُس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سید احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا۔" اس کے جواب میں سرسید نے لکھا کہ "میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کر کے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ اور عمدہ اور سچا یقین کیا ہے۔ اور اسی سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرنا۔ نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو کرتا کچھ ہو۔ اور اُس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اُس کے کرنے میں تامل کرے۔ اسی لیے میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سؤر یا اور کوئی حرام چیز نہ ہو، کچھ تامل نہیں کرتا۔ میرے انگریز دوست میرے ہاں مہمان ہوتے ہیں اور میں اُن کے ہاں مہمان ہوتا ہوں اور ہم اور وہ ایک میز اور ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں۔ جس چیز میں ہم کو خدا سے شرم نہیں اُس میں دنیا کے لوگوں سے کیا ڈر ہے"؛

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے بہت پہلے سرسید نے انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کا پرہیز چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "بجنور فتح ہونے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور کو آتے تھے رستے میں ایک جگہ ہم دونوں اُترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چائے پیو گے! میں نے کہا یہاں چائے کہاں! انھوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ بنی ہوئی بوتل میں موجود ہے۔ میں نے کہا بہت بہتر، غرض کہ ہم نے چائے پی اور ایک آدھ توس کھایا۔ وہاں سے چلکر نگینے میں مقام ہُوا۔ عصر کے وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں بھی جا کر جماعت میں شریک ہو گیا۔ نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیلدار سے جو نماز میں شریک تھے، پوچھا کہ صدر امین نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توس کھائے ہیں پھر یہ نماز میں کیونکر شریک ہوئے! جب مجھے معلوم ہُوا تو میں نے اُن کو سمجھایا کہ قرآن مجید کی رو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور اُن کے ساتھ کھانا درست ہے۔ اُن لوگوں نے میری اس روز کی تقریر کو نہایت تعجب سے سنا۔ پھر ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے ہاں جانے کا اتفاق ہُوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے انھوں نے کہا کہ تم بھی کھانا یہیں کھا لو۔ اور خانساماں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی لگا دے۔ خانساماں کو اس بات سے ایسا تعجب ہُوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج مسلمان انگریز کے ساتھ کھانا کھائے گا۔"

اگرچہ سرسید انگریزوں کے ساتھ مدت سے کھانے پینے لگے تھے۔ لیکن ابھی تک اُن کو مسلمانوں میں اس خیال کے زیادہ پھیلانے کا کچھ خیال نہیں تھا۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ رسم و رواج کی قیدیں ایک آدمی کے

اٹھا دینے سے نہیں اُٹھتیں اور مسلمانوں کا انگریزوں سے خوف اور دحشت کرنا اور انگریزوں کا مسلمانوں سے بدگمان اور متنفر رہنا اُس وقت تک موقوف نہ ہوگا جب تک کہ دونوں قوموں میں میل جول اور ربط ضبط نہ ہو اور ہر ایک قوم کو دوسری قوم کے اصلی خیالات بلاواسطہ معلوم کرنے کا معلوم نہ ملے۔ اس لیے انھوں نے ایک مبسوط اور مفصل تحریر ۱۸۶۶ء میں بنام " رسالۂ احکام طعام اہل کتاب" بنارس میں لکھ کر شائع کی جس میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور روایاتِ فقہی سے اور خاص کر شاہ عبدالعزیز کے فتوے سے جس پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتبار ہے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں خود اُن کے ساتھ انھیں کے ہاتھ کا پکا ہوا انھیں کے برتنوں میں اور انھیں کا ذبیحہ جس طرح کہ انھوں نے کیا ہو کھانا درست ہے۔ صرف سوٗر اور شراب اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

اس رسالہ میں اُن تمام شبہات کا جواب جو ہندوستان کے علمائے اسلام مواکلت اہل کتاب پر کرتے تھے اور جن شبہات کی وجہ سے مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں کی ہر ایک کھانے پینے کی چیز اور اُنکے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب تھا۔ نہایت شافی طور پر جو ایک منصف مزاج آدمی کی تسلی کیلیے کافی دوافی ہے لکھا ہے۔ جب یہ رسالہ چھپا تو اول اول بہت شور وغل ہوا۔ سرسید کو کرسٹان کہا گیا۔ اُنکے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کیا گیا اُنکے رسالہ کے جواب لکھے گئے بعضوں نے اس باب میں کوشش کی کہ سرسید کے ساتھ سب مسلمان کھانا پینا چھوڑ دیں مگر بقول سرسید کے وہ سب باتیں ایسی تھیں جیسے آندھی کا ایک بگولا اٹھا اور خاک اڑا کر چلا گیا پھر مطلع صاف ہوگیا۔ اب وہی لوگ جو سخت معترض تھے خود انگریزوں کے ہاں جا کر اور اُن کو اپنے ہاں بلا کر ساتھ کھانے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی نہیں وہ اپنے تقوے اور طہارت پر بدستور قائم ہیں۔

# چوتھا باب

# ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک

"سفر انگلستان، سفرنامہ، لندن کے عمائد سے ملنا، جلسۂ سمٹونین سوسائٹی اوف سول انجینئرس میں شریک ہونا، سی. ایس. آئی کا خطاب اور تمغہ ملنا، ملکۂ معظمہ کی لوی میں شریک ہونا، پرنس اوف ویلز کی لوی میں بلایا جانا، ایتھینیم کلب کی ممبری، کیمبرج یونیورسٹی میں جاکر وہاں کے طریقۂ تعلیم و تربیت پر غور کرنا تعلیم ہندوستان پر پمفلٹ لکھنا، خطبات احمدیہ لکھ کر شائع کرنا، جان ڈیون پورٹ کی کتاب چھپوا کر شائع کرنا"

---

سرسید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جن دو باتوں کو مسلمانوں کی آیندہ بہبودی کے لیے ضروری سمجھا تھا اُن کے لیے انگلستان کا سفر کرنا نہایت ضروری تھا ان کا یہ خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول پیدا نہ ہوگا اُس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے. گو وہ اب تک ان دو تدبیروں میں برابر سرگرم رہے مگر جس حد تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہتے تھے اس کے لحاظ سے اُن کو ولایت کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا. اس کے علاوہ سر ولیم میور کی کتاب "لائف اوف محمدؐ" کا جواب لکھنے کے لیے جس کا اُن کو حد سے زیادہ خیال تھا. بہت سی

ایسی کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں نایاب تھیں اور صرف برٹش میوزیم یا انڈیا اوفس کے کتب خانوں ہی میں مل سکتی ہیں۔

مگر اُس وقت ولایت جانا آسان نہ تھا۔ اول تو ایک ایسا شخص جس کی آمدنی ہمیشہ خرچ سے شرمندہ رہے، اس کو ولایت جانا اور وہاں جاکر اپنے تمام مقاصد پورے کرنے کے لیے ایک مدت تک قیام کرنا سخت مشکل تھا۔ پھر جیسا کہ آج کل ہندوستانی مسافروں کا انگلستان تک برابر تانتا بندھا ہوا ہے اُس زمانے میں یہ حال نہ تھا۔ ہندوستانی اس دور دراز سفر سے ہچکچاتے تھے۔ اور بمبئی و بنگال کے متعدد آدمیوں کے سوا کسی نے یہ سفر اختیار نہیں کیا تھا

حسن اتفاق سے انھیں دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لیے علاوہ تین ہزار روپیہ خرچ آمدورفت کے چھ چھ ہزار سالانہ کی نو سکالرشپیں چند صوبوں کے واسطے منظور کی تھیں۔ خوش قسمتی سے گورنمنٹ اضلاع شمال مغرب نے اپنے صوبہ کی سکالرشپ کے سید محمود کو انتخاب کیا۔ اگرچہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجنے کے لیے بھی کافی نہ تھا، مگر گورنمنٹ کی اس امداد سے سرسید کے ارادہ کو بہت تقویت ہوئی۔ انھوں نے فوراً ولایت جانے کی دل میں ٹھان لی جس نیت اور جس ارادہ سے انھوں نے سید محمود کے ساتھ خود ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا وہ کسی قدر اُن کی درخواستِ رخصت سے جو ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے سوسائٹی اخبار میں چھپی تھی، معلوم ہوتی ہے۔ درخواست کا مضمون یہ ہے۔

"یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے سلطنت کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے بخوبی استحکام و پائداری

بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ
اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط وضبط کو ترقی دیجائے
پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں
یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی
کے عجیب وغریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ
کریں اور اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے
دولتمند، طاقتور اور دانا ہیں اور ان مفید اور عمدہ باتوں کو
ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اس امر کے نتیجے ہیں کہ
تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں
اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اس
کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ
کام لیا جاتا ہے۔"

"پس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان
جاکر اپنے ہموطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کروں۔ مجھ کو یقین ہے
کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ امید ہے کہ
اپنے سفر کے نتیجوں سے ان کو مطلع کر کے ان کو بھی فائدہ پہنچا
سکوں اور اس طرح پر جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں ان کو بھی
سکھاؤں اور ان کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں۔"

مولوی سید مہدی علی خاں اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "جب سید احمد خاں
لندن جاتے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو
اس ارادہ کو پورا نہ کرسکتا۔ انھوں نے اپنے کتب خانہ کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو

رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ انھوں نے بارہا مجھ سے اس بارہ میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذات خود اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں "

الغرض یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے ولایت کو روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ دونوں بیٹے سید حامد مرحوم اور سید محمود اور تیسرے مرزا خداداد بیگ اور چوتھا اُن کا قدیم خدمتگار، چھجو۔ یہ چار آدمی تھے۔ بنارس سے لندن تک پہنچنے کے حالات انھوں نے بطور ایک سفرنامہ کے نہایت عمدگی سے بیان کیے ہیں جو سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق میں چھپ گئے ہیں۔

# سفرنامہ

اس سفرنامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو اثنائے راہ میں اُن کو پیش آیا ہے، قلمبند کیا ہے اور سفر کی ضروریات جو ہر مسافر کو پیش آتی ہیں مفصل بیان کی ہیں اور وقتاً فوقتاً جو خیالات اپنے خاص مقصد یعنی وطن کی بھلائی کے اُن کے دل میں گذرے ہیں اُن کو ہر موقع پر ظاہر کیا ہے۔ جا بجا ایشیا اور یورپ کی سوشل اور مورل حالتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کیے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

جس دُھن میں سرسید نے یہ سفر اختیار کیا تھا اُس کا ثبوت اس سفرنامہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامہ لکھنے والا وطن اور قوم کی خیرخواہی اور ہمدردی میں شرابور ہے بمبئی میں پہنچ کر کہیں وہ میمن مسلمانوں کے اخلاق، نام و نمود پر مرنے، چھوٹی شیخی کرنے، مفید تعلیم پر متوجہ نہ ہونے اور گھروں پر مدرس نوکر رکھنے پر افسوس کرتا ہے اور

پارسیوں کی عمدہ حالت سے اُن کا مقابلہ کرتا ہے۔ کہیں پارسیوں کے صاف اُردو بولنے پر حیران ہوتا ہے اور اُن لوگوں پر تعجب کرتا ہے جو اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان نہیں مانتے۔ کہیں گجراتی زبان کی کچھ عبارت نقل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس میں بھی فارسی اور عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں اور پھر سوال کرتا ہے کہ الہ آباد ایسوسیئیشن کون کون سی زبان سے فارسی و عربی الفاظ نکال کر قدیم بھاشا جاری کرے گی! مصر کی ریل کی تعریف کرکے افسوس کرتا ہے کہ ریل کا تمام سامان فرانس اور انگلستان کا بنا ہوا ہے، مصریوں کی چیز بنائی ہوئی نہیں۔ مسٹر ڈینیس فٹز پیٹرک سے جہاز میں ملتا ہے اور پنجاب کی طرزِ حکومت کے ذکر میں اُس کو ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ بتلاتا ہے اور دلّی کو قانونی اضلاع میں سے نکال کر پنجاب میں داخل کرنے کو غدر کی سزاؤں میں سے ایک سزا قرار دیتا ہے۔ فرانس کے نامور انجینیر ایم۔ ڈی لسپس سے جس نے نہر سویز نکالی ہے۔ جہاز میں ملنے پر بے انتہا خوشی اور فخر ظاہر کرتا ہے اور اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ جب انگریزوں نے اس کو ایڈریس دیتے وقت کہا کہ اس نہر کا نام نہر لسپس رکھنا زیبا ہے تو ایم۔ ڈی لسپس نے جواب دیا کہ میرا فخر اس میں ہے کہ اس کا نام نہر فرانس رکھا جائے۔ وہاں اُس کی وطن پرستی پر ہزار ہزار آفریں کرتا ہے اور اپنی قوم پر تفریں کہ اُن کا کام سوائے حسد، بغض، تشخص اور چھوٹی شیخی کرنے کے کچھ نہیں اور اسی لیے وہ بدبختی اور ذلت میں گرفتار ہیں۔ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ جب آبنائے پر محبِ وطن "گیری بالڈی" کا گھر ہے وہاں سے جہاز رات کو گذرا اور اُس پھونس کے جھونپڑے کی جو شہنشاہوں کے محلوں سے زیادہ ادب اور تعظیم کے قابل ہے۔ زیارت میسر نہ آئی۔ پیرس کی عمارتوں کی خوبی کا ذکر کرتے وقت

روضۂ تاج گنج اور قطب کی لاٹ کو یاد کرتا اور اُس پر فخر کرتا ہے۔ وارسیل کے شہنشاہی محل میں حوض اور نہریں اور فوارے اور درختوں کی موزونیت دیکھ کر قلعۂ دہلی کی نہر مار پیچ اور مہتاب باغ کا حوض جس کے کناروں سے کبھی تین سو ساٹھ فوارے چھوٹتے تھے اور ساون بھادوں کی کیفیت یاد کرتا ہے وارسیل میں تصویروں کا عالم دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ مگر الجزائر کے محاربات کی تصویروں میں ایک مرقع دیکھ کر اس کے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے جس کی وجہ سے وہ فرانس اور اُس کی بہادری و سویلزیشن کو قابل نفریں سمجھتا ہے۔ اُس نے ایک تصویر دیکھی ہے کہ سید عبدالقادر جزائری کی عورتیں گرفتار ہیں۔ فرانسیسی سپاہیوں نے اُن کے اونٹ بٹھا کر کجاوہ کو گرا دیا ہے اور عورتیں اُس میں سے نکل پڑی ہیں اور اُن کے بدن پر سے کپڑا ہٹ گیا ہے۔ سپاہی سنگینیں اٹھائے ہوئے اور اُن کی نوکیں عورتوں کی طرف کیے ہوئے کہ گویا اب ماریں گے۔ اردگرد کھڑے ہیں۔ اس تصویر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک غیرت مند مسلمان کے لیے اُن عورتوں کا ایسی بیکسی کے عالم میں دیکھنا، آنکھوں سے خون ٹپکانے کے لیے کافی ہے اور کہتا ہے کہ اس تصویر کو فرنچ سپاہ کی بہادری کی یادگار سمجھنا اور عورت کا کپڑا تصویر میں بدن پر سے ہٹا ہوا بنانا فرانس کے لیے قابل شرم ہے اور اُس کی شائستگی کو دھبا لگاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ "اس تصویر سے امام عبدالقادر کی حقارت نہیں ہوتی بلکہ اُس کی ویسی ہی عزت دل میں پیدا ہوتی ہے جیسی الجزائر کی بادشاہت کے زمانہ میں تھی۔ وہ بیس برس تک تن تنہا فرانس جیسی سلطنت سے نہایت بہادری اور سچائی سے بغیر دغا اور فریب کے لڑتا رہا اور شکست کے بعد جن شرطوں پر صلح کی اُن کو اخیر عمر تک نباہ دیا۔" پھر ایک دوسرے موقع کی تصویر

دیکھتا ہے جس میں نپولین امام عبدالقادر کو قید سے چھوڑ رہا ہے اور اس کی ماں سے جو باہر پھرنے کا پورا پردہ دار لباس پہنے کھڑی ہے، مصافحہ کر رہا ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر نپولین کی فیاضی، دانائی اور ہمت کی تعریف کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ لندن پہنچتا ہے اور اپنے سفرنامہ کے خاتمہ پر ہندوستان کے تمام سنی شیعہ اور ہندوؤں کو آگاہ کرتا ہے کہ سب ہندوستانی اپنے اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ یہ سفر طے کر سکتے ہیں۔ پھر اپنے جان پہچان انگریزوں کی ملاقات کا ذکر کرنے کے بعد کلفٹن کے لٹکواں پل کے بننے کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ جو مدت سے ناتمام پڑا تھا اور جس کو سول انجنیرس انسٹیٹیوٹ کے ممبروں نے ایک ممبر کی بدنامی کے خیال سے باہم اتفاق کر کے اپنی فیاضی سے بنا دیا۔ پھر اپنے ہموطنوں کی طرف مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے ہموطنو! بتاؤ کہ انسان یہ لوگ ہیں یا ہم جو حیوانوں کی طرح اپنی خودغرضیوں میں مبتلا ہیں اور اپنے ہر ایک کام کا بندوبست گورنمنٹ سے چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکوں کو بھی وہی پڑھائے ہماری مذہبی تعلیم کا بھی وہی انتظام کرے۔ پھر ایک رصدگاہ کا ذکر لکھ کر کہ ایک عورت اُس کا تمام کام انجام دیتی ہے اپنے ملک کے مدعیان علم و فلسفہ و منطق کو شرمندہ کرتا ہے۔

یہ سفرنامہ نہایت دلچسپ طریقہ سے لکھنا شروع ہوا تھا، مگر جب اُس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے اُس پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنی شروع ہوئی اور سرسید کو بھی لندن ہی میں لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہُوا۔ ابھی حضرت کے کان ایسی مخالف صدوں سے زیادہ آشنا نہ تھے، اس لیے انھوں نے ناراض ہو کر سفرنامہ لکھنا موقوف

کر دیا، مگر زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

# لندن کے عمائد سے ملنا

الغرض سرسید بمبئی سے چھبیس دن میں لندن پہنچے اور میکلن برگ اسکوائر میں ایک مکان کرایہ پر لے کر ٹھیرے اور اپنے تمام دوستوں اور آشناؤں سے ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی مروت اور خلق سے اُن کے ساتھ پیش آئے، جیسے کہ وہ ہمیشہ ہندوستان کے مسافروں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور اُن کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور اُن کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ اکثر ان کو اپنے گھر ڈنر پہ بلاتے تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ اُن سے ملنے کو آتے تھے۔ انھوں نے ہی سرسید کو لندن کے اکثر امرا و مشاہیر سے ملوایا تھا، لارڈ اسٹینلی اوف ایلڈرلی جو قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے وہ بھی جب لندن میں آتے تھے تو سرسید سے ملتے رہتے تھے۔ سرجان ڈلیم کے انڈر سکرٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سرسید کو زیادہ خصوصیت ہوگئی تھی۔ ملکہ معظمہ کے سمدھی ڈیوک اوف آرگائل جو اُس وقت وزیر ہند تھے اور سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کے پیٹرن بھی تھے وہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ ملتے رہے اور اپنے بیٹے مارکوئس اوف لارن سے بھی جو ملکہ معظمہ کے داماد ہیں اُن کو ملایا۔

# جلسۂ سول انجنیرس سوسائٹی میں شریک ہونا

سرسید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز اُن کاموں میں جن کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا مصروف رہے۔ با اینہمہ اُن کو اکثر خاص خاص تقریبوں میں بلایا جاتا تھا اور اُن کی عزت افزائی کیجاتی تھی۔ ۲۴ جون سنہ ۶۹ء کو وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈنر پر بلائے گئے اور ۱۳۔ جولائی کو سمتھونین سوسائٹی اوف سول انجنیرس کے ایک عظیم الشان جلسہ میں اور اُس کے بعد جو اُسی کے متعلق گرینچ میں ڈنر ہوا اس میں شریک ہوئے۔ اس جلسہ کی کیفیت ڈیلی نیوز مورخہ ۲۱۔ جولائی میں مفصل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر ہین نے جو سوسائٹی مذکورہ کے پریسیڈنٹ تھے سرسید کو اس جلسہ میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ وقتِ متعین پر میر اسٹیمر میں جو پارلیمنٹ ہوس کے سامنے موجود ہوگا آئیں۔ مگر خود لارڈ لارنس سرسید کے مکان پر آئے اور اُن کو اپنے ساتھ سوار کرا کے لے گئے۔ سید حامد اور سید محمود بھی ساتھ تھے۔ اسٹیمر میں جا کر حاضری کھائی اور ٹیمز کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے۔ پھر خاص اجازت سے ایک جنگی جہاز اور اس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گرینچ میں جا کر ڈنر کھایا۔ اس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجنیر شریک تھے۔ کھانے میں طرفہ بات جیسا کہ ڈنر مذکور کی مینیو[1]

---

[1] مینیو ایک خوبصورت چھپا ہوا کاغذ ہوتا ہے جس پر ڈنر کے تمام کھانوں کی تفصیل ہوتی ہے اور کھانے کے وقت ہر ایک مہمان کے سامنے رکھدیا جاتا ہے۔ اس ڈنر کا مینیو سرسید کے کاغذات میں اب تک موجود ہے جس میں تیس کھانوں کے نام لکھے ہیں ۱۲۔

میں مندرج ہے۔ یہ تھی کہ تیس طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے! خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہ تھی تمام انجینیروں نے جو اس جلسہ میں شریک تھے کھانے کے بعد سپیچیں دیں اور سال گزشتہ کی مختلف ترقیات کا جو انجینیرنگ میں ہوئیں ذکر کیا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے سپیچ دی اور آخر میں لارڈ لارنس اور سرسید کا ذکر کر کے اُن کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا اس کے شکریہ میں لارڈ لارنس نے تقریر کی (سرسید کے پاس ایک ترجمان کو اس غرض سے بٹھا دیا تھا کہ جلسہ کی تمام کارروائی کو اُن کو اردو میں سمجھاتا جائے) لارڈ لارنس کے بعد سرسید اٹھے۔ ایک ایسے جلسے میں جہاں انگلستان کے نامور انجینیر جمع ہوں اور جلسہ کا موضوع انجینیرنگ کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہو، سرسید کو گفتگو کرنا نہایت دشوار تھا، باوجود اس کے ڈیلی نیوز نے اسی زمانہ میں لکھا تھا کہ سید احمد خاں کی اسپیچ شاندار اور دلچسپ تھی۔ پریزیڈنٹ نے لارڈ لارنس کو سیویر آف انڈیا کہا تھا، سرسید نے اُن کو فادر آف انڈیا کہہ کر یاد کیا۔ سرسید کی اسپیچ کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا رعب و داب اور دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے ذریعے ہیں۔ مثلاً تعلیم، ہتھیار اور عدل و انصاف وغیرہ، مگر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے صرف انھیں لوگوں کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوئی ہے جن کو اُن سے کام پڑا ہے یا جن کو اُن سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ لیکن وہ چیز جس نے خاص و عام سب کے دل میں انگلش گورنمنٹ کی عظمت پیدا کی ہے وہ فن انجینیری کے نتائج ہیں۔ جیسے ریل، بڑے بڑے دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گذرتی ہے۔ ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور اُس کے دل میں خود بخود انگریزی

سلطنت کا رعب و داب اور اُس کی بڑائی پیدا ہوتی ہے۔" اس پر جلسہ میں نہایت زور سے چیرز دی گئیں اور جب لارڈ لارنس نے اُس کو انگریزی میں ترجمہ کر کے سنایا تو پہلے سے بھی زیادہ چیرز کا غل ہوا۔ سر سید کہتے ہیں کہ میرا ارادہ اسپیچ کرنے کا پہلے سے نہ تھا مگر چونکہ میری نسبت ایسے الفاظ کہے گئے۔ مجھے جن کا شکریہ ادا کرنا ضرور تھا اس لیے مجھ کو بھی کھڑا ہونا پڑا۔

## خطاب اور تمغہ ملنا

۶ر اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا اوفس میں ڈیوک اوف ارگائل کے ہاتھ سے اُن کو سی. ایس. آئی کا خطاب اور تمغہ ملا۔ اُس کی تحریک لارڈ لارنس نے کی تھی۔ تاریخ معین پر سر سید انڈیا آفس میں گئے۔ وہاں سر جان ڈبلیو کے انڈر سکرٹری وزیر ہند آئے اور سر سید سے ہاتھ ملا کر اُن کو اپنے ہمراہ اُس کمرے میں لے گئے جہاں ڈیوک آوف آرگائل اُن کے منتظر تھے۔ ڈیوک کھڑے ہو کر چند قدم آگے بڑھے اور سر سید سے ہاتھ ملا کر پھر اپنے بیٹے مارکوئس اوف لارن سے ملاقات کرائی اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد تمغہ اپنے ہاتھ سے پہنایا اور مبارک باد کہہ کر سر سید کو رخصت کیا۔ اُسی روز چار اور شخصوں کو بھی یہی تمغہ ملنے والا تھا، جب سب کو تمغے مل چکے تو ڈیوک موصوف نے سر سید کو کھانے پر بلایا جہاں بہت سے معزز لوگ اور پارلیمنٹ کے ممبر آئے تھے۔ سر سید کو اس موقع پر ڈیوک کے برابر بائیں جانب جگہ دی گئی تھی۔ لطیفہ: جس زمانہ میں سر سید کو ولایت میں سی. ایس. آئی کا خطاب ملا اُس کے کچھ دنوں بعد راجہ جیکشن داس صاحب کو یہی خطاب ہندوستان میں بمقام علیگڑھ ملا تھا اور اس کے تمام مراسم سوسائٹی کے بڑے ہال میں آئے تھے

جب جلسہ برخاست ہوا اور راجہ صاحب کے تمام دوست اُن کو مبارکباد دینے لگے، سوسائٹی کا ایک ملازم ہر ایک کی زبان سے سی. ایس. آئی کا لفظ سنتا تھا اور نہایت تعجب کرتا تھا. باہر آکر اور نوکروں سے کہنے لگا ارے یارو عجب تماشا ہے سید احمد خاں تو خیر! لندن گئے تھے وہاں جاکر عیسائی ہوئے کسی نے جانا کسی نے نہ جانا، ان راجہ صاحب کو کیا ہوا تھا. کہ یہ ہندوستان ہی میں بھرے جلسہ کے اندر عیسائی بن گئے. لوگوں کی زبان سے جو بار بار سی. ایس. آئی کا لفظ نکلتا تھا وہ اس کو عیسائی سمجھتا تھا.

# ملکۂ معظمہ کی لوی وغیرہ میں بلایا جانا

۶ر نومبر ۶۹ء کو ملکۂ معظمہ کے ہاتھ سے بلیک فرائرز برج، ہا بجھورن اور ایڈکٹ کے افتتاح کا جلسہ ہونے والا تھا؛ جلسہ کی انتظامی کمیٹی نے سرسید کو بھی خاص طور پہ وہاں مدعو کیا تھا. سرسید کہتے ہیں کہ یہ جلسہ نہایت شان و شوکت کا تھا.

پھر ۱۱ر مارچ ۷۰ء کو ملکہ معظمہ کی لوی میں اُن کو بلایا گیا. سرسید کہتے ہیں. کہ حسب معمول لوی کے محل میں مجھ کو اور درباریوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا. جب ملکۂ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر سامنے جاکر سلام کیا. سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکۂ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں. جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں ہو لیتا اُس وقت تک ملکہ کھڑی رہتی ہیں.

# پرنس اوف ویلز کی لوی میں بلایا جانا

اس کے بعد سنہ کو پرنس آوف ویلز کی لوی میں اُن کو شریک کیا گیا۔ یہ لوی صرف فوجی افسروں کے لیے تھی، کسی سویلین کو اُس میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی، مگر چونکہ سرسید ولایت سے جلد واپس آنے والے تھے اور ممکن تھا کہ اُن کو پھر پرنس اوف ویلز کی کسی لوی میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے۔ اس لیے اُن کو خاص اجازت لوی میں شریک ہونے کی مِل گئی تھی۔

# اتھینیم کلب کی ممبری

لندن کی علمی مجلسوں میں بھی سرسید شریک ہوتے رہے۔ لندن جانے سے پہلے جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر ہو چکا ہے وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے فیلو مقرر ہو چکے تھے۔ جب لندن میں گئے تو اس کے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے وہ کہتے ہیں کہ چارلس ڈکنس کی آخری ریڈنگ پر بھی میں وہاں موجود تھا، لیکن سب سے بڑا امتیاز جو اُن کو لندن میں ایک علمی حیثیت سے ملا وہ اتھینیم کلب کا آنریری ممبر مقرر ہونا تھا۔ یہ کلب لندن میں سب سے زیادہ نامی اور معزز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کلب معزز خیال نہیں کیا جاتا۔ کوئی شخص جو مشہور مصنف یا کسی دوسرے کمال علمی میں ممتاز نہ ہو وہ اس کلب میں ممبر نہیں ہو سکتا۔ اس کے ممبروں کی تعداد بارہ سو تک محدود ہے۔ سیکڑوں آدمی درخواستیں دے دیکر یہاں کی ممبری کے امیدوار رہتے ہیں سرسید کہتے تھے کہ سنہ ۱۸۷۰ء میں جب کہ میں وہاں موجود تھا تین ہزار سے زیادہ امیدواروں کا نام درج رجسٹر تھا اور دس دس بارہ بارہ برس امیدواری پر

گذر گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو شخص اس کلب کا ممبر مقرر ہوتا ہے اُس کے دوست اس کو مبارکباد کی چٹھیاں لکھتے ہیں اور اس کو ایسا فخر ہوتا ہے کہ ویسا فخر اکثر خطابوں کے ملنے پر بھی نہیں ہوتا۔

غرض کہ سرسید خاص قاعدے سے جو نامور اور مشہور باکمال لوگوں کے لیے مقرر ہے دو دفعہ ایتھینیم کلب کے آنریری ممبر مقرر ہوئے اور جب تک لندن میں رہے اُس کے ممبر رہے اس کلب کی ممبری کی تحریک مسٹر اڈورڈ ٹامس نے کی تھی جو سرسید کی منصفی کے زمانہ میں دلّی کے جج تھے اور جنھوں نے اُن کو آثار الصنادید کے دوبارہ لکھنے اور ترمیم کرنے کی صلاح دی تھی۔

# کیمبرج یونیورسٹی میں جانا

آثار الصنادید کا مترجم گارساں دتاسی جو فرانس کے مشہور مستشرقین[1] میں سے نہادہ بھی لندن ہی میں سرسید سے خط کتابت اور شوقِ ملاقات رکھتا تھا۔ مگر یہ تمام اعزاز و امتیاز اور خاطر و مدارات جن کا ہندوستان سے چلتے وقت سرسید کو سان گمان بھی نہ تھا۔ یہ سب ضمنی اور غیر متوقع امور تھے۔ اُن کے اصلی مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اُس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جاکر دیکھا اور بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی غور کی اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا، تعلیم نسواں کو غور کی نگاہ سے دیکھا اور تعلیم کے مختلف

---

[1] زمانۂ حال کی عربی ہے اور نیٹلسٹ کو مستشرق کہتے ہیں ۱۲

طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا اُس کو نگاہ میں رکھا۔ اگرچہ انگریزی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ضرور ہے کہ اُن کو ہر ایک بات کے سمجھنے اور دریافت کرنے میں سخت دقتیں اٹھانی پڑی ہوں گی، اور شاید اُن کو پوری واقفیت حاصل نہ ہوسکی ہو، مگر جو نتیجے اس ادھوری واقفیت سے ہندوستان میں ظاہر ہوئے وہ بلکہ اُن کا عشر عشیر آج تک اُن ہندوستانیوں کی پوری واقفیت سے بھی ظہور میں نہیں آیا جو ولایت سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر آتے ہیں۔

# انگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کرنا

انگلستان کے طریقۂ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سرسید نے لندن ہی میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم کے نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کیے تھے۔ تعلیم کے سوا یورپ کی عام شائستگی اور طرز تمدن اور حسن معاشرت اور ہر قسم کی ترقیات کے اسباب جیسا کہ اُن کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیے اور جہاں تک ممکن تھا اپنی معلومات کو وسعت دی۔ یورپ کے طریق معاشرت کو دیکھا۔ وہاں کے امرا کے محل اور مکانات اور طرز ماند و بود پر نظر کی۔ عجائب خانوں اور کتب خانوں میں علوم اور تحقیقات کے ذخیرے ملاحظہ کیے۔ انجینیری کے عجائبات، جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا، سمندری تار کا بنتا، انجینیروں اور عالموں کی سوسائٹیاں، عام کاریگروں اور اہل حرفہ کے کام اور عموماً اہل انگلستان کے علمی ذوق و شوق اور علمی ترقیات کو دیکھا جس سرگرمی کے ساتھ اہل مذہب، مذہب کی حمایت کرتے ہیں اور باوجود اس کے نہایت بے تعصبی

سے غیر مذہب والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اخلاق کہ وہ پڑوسیوں اور مہمانوں کے ساتھ برتتے ہیں، یہ سب کچھ دیکھا۔ اُن کے عیبوں سے قطع نظر کی اور ان کی خوبیوں کو چُنا اور یہ سب کچھ ایک تماشائی کی طرح سیر تماشے اور دل لگی کے طور پر نہیں بلکہ ایک وطن دوست کی طرح دلسوزی، غیرت اور عبرت کی نگاہ سے دیکھا اور انگلستان کی حالت کو اپنے ملک کی حالت سے مقابلہ کر کے اپنے درد دل کو بڑھایا اور اُس درد کو دوسروں کے دلوں میں درد پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا۔ وہ مولوی سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں ولایت سے لکھتے ہیں "میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں، پوچھا کہ "کہو لندن بہشت ہے۔ اور حوروں کا ہونا سچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں دہی جلنا ہے یہاں کا حال دیکھ دیکھ اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہموطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔"

اُن کا ارادہ تھا کہ انگلستان اور ہندوستان کی حالت میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اُس کو اپنے سفرنامہ میں مفصل بیان کر کے اہل وطن کو خبردار کریں مگر اہل وطن نے اُس کو برداشت نہ کیا۔ وہ اپنی پستی کی درد انگیز داستان نہ سن سکے اور اس لیے جو سلسلہ سر سید نے اپنے سفر کے حالات کا لکھنا شروع کیا تھا، وہ منقطع ہوگیا۔ بااینہمہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے سفر کے جستہ جستہ حالات لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے اور جب کبھی موقع ملا انھوں نے کوئی نہ کوئی بات اہل وطن کے کان میں ڈال دی۔

۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو انھوں نے ایک لمبی تحریر سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس میں چھ مہینے کے حالات مختصر طور پر بیان کیے تھے اور یورپ کی ترقی اور اپنے ملک کے ادبار اور تنزل کی مثالیں پیش کر کے اہل وطن کو غیرت دلائی تھی جب اس تحریر کا نتیجہ بھی سوا اس کے کہ لوگ برافروختہ ہوں اور بُرا بھلا کہیں، کچھ حاصل نہ ہوا تو ۲۲ مارچ ۱۸۷۰ء کو ایک دوسری تحریر بعنوان "عذر از طرف گنہگار سید احمد" ہندوستان میں بھیجی، پھر ایک اور تحریر بعنوان "یادداشت سید احمد بخدمت اہل وطن" اخبار میں چھپنے کے لیے روانہ کی۔ ان تمام تحریروں کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں سر سید کو اہل وطن کی بھلائی کا کس قدر خیال تھا۔ گو ان تحریروں سے قوم و ملک کے کان پر جوں نہیں چلی، مگر درحقیقت یہ سب تمہیدیں تھیں اُن کارروائیوں کی جو آخر کار ہندوستان میں پہنچ کر سر سید کے ہاتھ سے ظہور میں آنے والی تھیں۔

## خطبات احمدیہ کا لکھنا اور چھپوانا

ان سب باتوں کے سوا سر سید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اُس کا ترجمہ کرا کر شائع کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاصکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب "لائف اوف محمد" میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کے کیرکٹر ظاہر کرنے میں دانستہ یا نادانستہ کی ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔ سر ولیم میور کی کتاب کی نسبت اکثر انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ اسلام کے متعلق

جو ٹھیک اطلاعیں سرولیم نے اہل یورپ کو دی ہیں وہ پہلے کسی دوسرے ذریعہ سے اُن کو حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ مگر درحقیقت یہ کتاب صرف عیسائیوں ہی کو اسلام اور بانی اسلام کی طرف سے گمراہ کرنے والی نہ تھی بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف سے شک میں ڈالنے والی تھی۔

اس کتاب کے مضامین کی تفصیل اور جو دقتیں سرسید کو اس کے لکھنے اور چھپوانے میں پیش آئیں اور جس جوش اور اُمنگ سے انھوں نے یہ کتاب لکھی اور جو رائیں انگریزوں نے اُس پر دیں، یہ سب امور ہم دوسرے حصہ میں بیان کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ ولایت میں سرسید نے کتاب کی لاگت بڑھ جانے کے خوف سے صرف اپنی یادداشتوں کا خلاصہ انگریزی میں ترجمہ کرا کے چھپوایا تھا مگر ہندوستان میں پہنچنے کے بہت بعد انھوں نے اُس کو اُردو میں بھی اپنی پوری یادداشتوں سے از سرنو مرتب کرکے تصانیف احمدیہ کے ساتھ بڑی تقطیع پر ٹائپ میں چھپوایا تھا جس میں ہر ایک مضمون بہ نسبت انگریزی کے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان ہوا ہے مگر چونکہ اس کی جلدیں بہت ہی کم چھپوائی گئی تھیں اس لیے اُس کی زیادہ اشاعت نہیں ہوسکی۔ خطبات احمدیہ لکھنے کے سوا انھوں نے ولایت ہی میں اور بھی اسلام کی بعض خدمتیں انجام دی ہیں جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا۔

سچ یہ ہے کہ سرسید نے جس تحریر کے ذریعہ سے ولایت جانے کے لیے گورنمنٹ سے اجازت چاہی تھی، جو کچھ اس تحریر میں لکھا تھا، اُس سے بہت زیادہ اپنے ارادوں کو پورا کرکے دکھایا۔ وہ لندن سے نہایت

قیمتی اطلاعیں لیکر ہندوستان میں آئے جن سے انھوں نے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدہ پہنچایا۔ شمالی ہندوستان میں اُن سے پہلے ظاہراً کسی ہندو یا مسلمان نے اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے ولایت نہیں بھیجا تھا۔ غالباً سید محمود شمالی ہندوستان میں پہلے شخص ہیں جو ولایت سے بیرسٹری کا ڈپلوما لے کر آئے محض انھیں کی ریس سے اس ملک کے ہندو مسلمانوں کو اپنی اولاد کے ولایت بھیجنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور انھیں کی دیکھا دیکھی ولایت جانے والے دیسی طالبعلموں کا ہندوستان سے انگلستان تک تانتا بندھ گیا۔ جس زمانہ میں سرسید ولایت گئے ہیں انھیں دنوں میں سائنٹفک سوسائٹی اخبار علیگڑھ میں چھپا تھا کہ "سید احمد خاں کے ولایت جانے سے ہندوستانیوں کے واسطے ایک عمدہ مثال قابل تقلید قائم ہو گئی ہے چنانچہ کلکتہ کے ایک نوجوان مسلمان سید امیر علی (جواب آنریبل سید امیر علی سی۔ ایس آئی بیرسٹرایٹ لا اور جج ہائی کورٹ کلکتہ ہیں) لندن روانہ ہوئے ہیں اور بہت سے ولایت جانے کو تیار ہو رہے ہیں۔" سید امیر علی نے صرف ولایت کا سفر کرنے ہی میں سرسیّد کی تقلید نہیں کی بلکہ اسلام کی خدمت کرنے میں اور اس کی خوبیاں یورپین قوموں پر ظاہر کرنے میں بھی انھوں نے سرسیّد کا پورا پورا اتباع کیا ہے۔ اُن کی دو با وقعت کتابیں "لائف اوف محمد" اور "اسپرٹ اوف اسلام" جو انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں اس دعوے کی شاہد ہیں۔

نواب محسن الملک اپنی ایک تحریر میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کو لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں ولایت گئے، مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اُس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے انھیں کے گھروں میں اور انھیں کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے

واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جاکر تماشا گاہ، تھیٹر، پارک میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں۔ اور یہ حامیٔ دین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطبات احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔"

الغرض سرسید ایک سال اور پانچ مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو مع سید حامد مرحوم کے لندن سے ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ اُن کی روانگی کے بعد ایک لمبا مضمون ہندوستان کے ایک مسلمان مقیم لندن سید عبداللہ نام نے اخبار ہوم ورڈ میل مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۷۰ء میں سرسید کی نسبت چھپوایا تھا جو سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۱ نومبر ۱۸۷۰ء میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں لکھے جاتے ہیں "جن انگریزوں سے یہاں (یعنی انگلستان میں) اُن کی ملاقات ہوئی ان پر اُن کی عام لیاقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصوں نے اُن سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی اُن سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا بہت عمدہ اثر ہوا۔ یہاں کے بہت سے مدبران سلطنت کی رائے ہے کہ، اگر ہم ایک ایسے لیق اور واقف کار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سید احمد خاں ہیں۔ نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی (پور) ہوتی۔ — اس اس مضمون کے لکھنے سے میری یہ غرض ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو ہندوستانی تربیت یافتہ اور مہذب ہوتا ہے اُس کی اہلِ یورپ کیسی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں ..... سید احمد خاں

کی بدولت اس بات کا ثبوت حاصل ہونے سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس ملک میں ہندوستان کے ایک شریف آدمی کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے انگریز اُس سے بڑی محبت اور تواضع اور تکریم سے پیش آتے ہیں۔"

## پانچواں باب

# ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۸ء تک

ولایت سے واپس آنا۔ تہذیب الاخلاق جاری کرنا۔ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان۔ کمیٹی خزنۃ البضاعۃ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو۔ ابتدائی مدرسہ علیگڑھ میں قائم کرنا۔ کالج فونڈیشن سٹون۔ چندہ وصول کرنیکی تدبیریں۔ عمارات کالج۔ کالج کلاس قائم ہونی۔ تفسیر القرآن۔

## ولایت سے ہندوستان میں واپس آنا

۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسید مع سید حامد مرحوم کے ولایت سے بمبئی پہنچے اور اسی مہینے میں بنارس پہنچ کر اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ یہاں آتے ہی انھوں نے اُس بڑے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کی جس کے لیے درحقیقت ولایت کا سفر اختیار کیا تھا۔ مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ جو انھوں نے ولایت جانے سے بہت پہلے باندھا تھا اس کے پورا کرنے میں ظاہرا اُن کو دو سخت مزاحمتیں نظر آتی تھیں۔ اول مسلمانوں کے مذہبی اوہام۔ انگریزی تعلیم سے اُن کی نفرت اور ایجوکیشن کے مفہوم سے ناواقفیت۔ اس مزاحمت کے دور کرنے کے لیے انھوں نے ولایت پہنچتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ سفر کے حالات اور متعدد آرٹیکل

جو انھوں نے لندن سے لکھکر بھیجے اور سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئے اُن میں طرح طرح سے مسلمانوں کو غیرت دلائی تھی اور جا بجا اُن کے تنزل پر افسوس ظاہر کیا تھا اور انگریزی تعلیم کی ضرورت بیان کی تھی لیکن ان تحریروں کا اثر مسلمانوں پر کچھ نہیں ہوا۔ دوسری مزاحمت اُن کو یہ معلوم ہوتی تھی کہ اُن کا ارادہ جیسا کہ آگے مفصل بیان کیا جائے گا فی الواقع ہندوستان میں پہنچ کر ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا، کیونکہ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم سے ہندوستانیوں میں حقیقی لیاقت پیدا ہونے کی اُن کو ہرگز امید نہ تھی۔ اس لیے ضرور تھا کہ گورنمنٹ کے طریقۂ تعلیم کو مسلمانوں کے لیے ناکافی اور ہندوستان کے ایجوکیشنل سسٹم کو غیر مفید قرار دیا جائے۔ چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے ولایت میں ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا تھا جس کا عنوان "ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیمی پر اعتراضات تھا مگر چونکہ اُس میں سرسید نے اپنی ذاتی رائے لکھی تھی اس لیے اُس سے بھی کسی نتیجہ کے پیدا ہونے کی اُمید نہ تھی۔ ان دونوں رکاوٹوں کے دور کرنے کے لیے انھوں نے ہندوستان میں پہنچ کر دو بڑے بڑے کام ایک ساتھ شروع کیے۔

## تہذیب الاخلاق

اول مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور اُن کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے پرچۂ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ انھوں نے اس پرچہ کے نکالنے کا ارادہ ولایت ہی میں کر لیا تھا کیونکہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو اس کا نام اور بیل چھپتی تھی اُس کا ٹائپ وہ لندن سے بنوا کر اپنے

ساتھ لائے تھے. الغرض سر سید اور ان کے دوستوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی جس
کے ہر ایک ممبر سے تہذیب الاخلاق کے اخراجات کے لیے ساٹھ روپیہ سالانہ
اور عام خریداروں سے ساڑھے چار روپیہ سالانہ لینا قرار پایا تھا. یکم شوال ۱۲۸۷ھ
ہجری مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا اول نمبر شائع ہوا اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ھ سے
رمضان ۱۲۹۳ھ یعنی پورے چھ برس تک برابر نکلتا رہا اور ہمیشہ اس کے اڈیٹر اور منیجر
خود سر سید رہے چونکہ یہ پرچہ کوئی تجارتی اخبار نہ تھا بلکہ محض قوم کی بھلائی
کے لیے جاری کیا گیا تھا، اس لیے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اسی کی ترقی میں صرف
کی جاتی تھی. اس کی اخیر جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور ماٹو کے یہ عربی فقرہ
لکھا جاتا تھا "حب القوم من الایمان فمن یسعی فی اعزاز قومہ انما یسعی فی اعزاز دینہ"

تہذیب الاخلاق ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تقریباً ویسا ہی پرچہ
تھا جیسے اسٹیل اور اڈیسن نے دو میگزین یعنی ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر نوبت بہ نوبت
لندن میں نکالے تھے اور ۱۷۰۹ء سے ۱۷۱۳ء تک جاری رہے. ان دونوں
پرچوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان سے انگریزوں کے اخلاق عادات، رسم و
رواج اور قومی خیالات پر بہت بڑا اثر ہوا تھا. اگرچہ اس وقت انگلستان
کی حالت کیا باعتبار علوم و فنون اور کیا باعتبار اخلاق و معاشرت کے آج کل
کی حالت سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھی مگر مذہبی خیالات اس عام ریفارمیشن کی
بدولت جو لوتھر اور کالون نے کی، بہت کچھ اصلاح پا چکے تھے. اس لیے
ان دونوں پرچوں میں مذہبی چھیڑ چھاڑ بہت کم ہوتی تھی اور اسی وجہ سے وہاں
ان پرچوں کی کچھ مخالفت نہیں ہوئی. لیکن تہذیب الاخلاق کا حال ایسا نہ تھا
اس میں مذہبی بحث کرنی لازم آپڑی تھی، کیونکہ جو باتیں مسلمانوں کی دنیوی
ترقی کی مانع تھیں وہ زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں. اگرچہ اس پرچے

میں مضمون لکھنے والے بہت سے لوگ تھے مگر سب سے زیادہ سرگرم خود سرسید، پھر مولوی سید مہدی علی خاں اور پھر مولوی چراغ علی تھے۔ سرسید مذہب کے سوا اخلاق و معاشرت و تمدن پر بھی اکثر مضامین لکھتے تھے مگر پچھلے دونوں شخص زیادہ تر مذہب پر لکھنے والے تھے۔

اس پرچہ کے دو ہی تین نمبر نکلنے پائے تھے کہ چاروں طرف سے اُس کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی اس مدرسہ سے بھی جس کو سرسید قائم کرنا چاہتے تھے عموماً سوء ظن پیدا ہونے لگا۔ بہت سے اخباروں میں مخالفانہ مضمون چھپنے لگے اور چند پرچے جن میں سے کانپور کا نور الآفاق اور نور الانوار زیادہ مشہور تھا تہذیب الاخلاق کے توڑ پر جاری کیے گئے رسالۂ اشاعۃ السنۃ جو خاص اہلِ حدیث کی تائید کے لیے جاری ہوا تھا اُس میں بھی تہذیب الاخلاق کے برخلاف مضمون نکلنے لگے اور سرسید کی تکفیر کے فتوے جابجا لکھے جانے لگے۔ یہاں تک کہ اُن کے ساتھ اُن کے دوست اور اعوان و انصار بھی نیچری بلکہ کرسٹان کہلانے لگے لطیفہ۔ جب محسن الملک سید مہدی علی خاں کے چند مضمون نہایت دھوم دھام سے اس پرچہ میں شائع ہوئے تو کسی سُنی صاحب نے اُن کے چچا سے جن کا تمام خاندان محسن الملک کے سوا اثنا عشری ہے، جاکر کہا کہ آپ کے لیے رونے کا مقام ہے کہ مہدی علی خاں کرسٹان ہو گئے انھوں نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ میاں اب تم کو رونا چاہیے، ہم تو اُسی دن رو چکے تھے جب اُس نے باپ دادا کا طریقہ چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کیا تھا۔

با ایں ہمہ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتدبہ گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہوگیا جو اس پرچہ کا ویسا ہی دلدادہ

تھا جیسے انگلستان والے ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کے دلدادہ تھے۔ وہ اُس کے مضامین پہ وجد کرتے تھے اور تاریخ معین پر اُس کے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے تھے۔ اور اُس کے مخالفوں کو تعجب سے دیکھتے تھے۔ جو نتائج اس پرچہ سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے اُن کو دوسرے حصہ میں بیان کیا جائے گا یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگر سرسید یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا خیال چھوڑ دیتے بلکہ صرف اُن کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہرا اُن کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی، مگر اُس کے ساتھ ہی اعانت اور امداد بھی کم ہوتی اور جو تحریک چند سال میں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اُس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

اس پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے اُن کو جہاں تک ہو سکے رفع کیا جائے اور اسلام پر جو عیسائیوں کا یہ اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے، اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے اس کے سوا یورپ کی سویلزیشن کے اصول و فروع سے اور اُن اسباب سے جو یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے، بیہودہ اور مضر رسموں سے اُن کو نفرت دلائی جائے اخلاق و عادات میں جو بسبب قومی تنزل کے خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ بیان کی جائیں۔ علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ بیٹھی ہوئی ہے جہاں تک اُس میں غلطی ہو اُس کو ظاہر کیا جائے علوم جدیدہ جن سے نفرت کی جاتی ہے اُن کی اصلی اور واقعی خوبیاں اور جو بدیہی نتائج دنیا میں اُن سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں اور بجائے نفرت کے ان کی طرف رغبت دلائی

جائے۔ اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں اُن کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے یا اسلام کا دامن اُن سے پاک ثابت کیا جائے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے اکابر و اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کیا جائے، اُن کی قدیم علمی اور عملی ترقیات اُن کو یاد دلائی جائیں اور اس طرح قوم کے مردہ دلوں کو از سر نو زندہ کرنے میں کوشش کی جائے۔ ان تمام اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لیے سر سید اور اُن کے دوستوں نے صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا وہ زیادہ تر قوم کے محققین کی تصنیفات سے استناد کر کے لکھا اور اخلاق و معاشرت و ترقی و تمدن کے متعلق یورپ کے مصنفین کے خیالات بھی جہاں تک ہو سکا اپنی زبان میں بیان کیے۔

چونکہ یہ پرچہ اسلام کو ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا جو مسلمانوں کے عام خیالات کے برخلاف تھی اور اُن کے کان میں وہ صدائیں پہنچاتا تھا جو انھوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں، اس لیے اول اول لوگ اُس سے بہت بھڑکے، مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں اُس کا اثر پھیل گیا۔ اَن پڑھ مسلمان جن کی تعداد ہمیشہ ایک گری ہوئی قوم میں پڑھے لکھوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے، وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تہذیب الاخلاق کس جانور کا نام ہے۔ مولویوں اور واعظوں پہ بھی اُس کا منتر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ وہ اُس کو نہ صرف مذہب کے حق میں بلکہ شاید اپنے حق میں بھی مضر جانتے تھے۔ اُمرا تک اُس کی رسائی ہوئی سخت دشوار تھی کیونکہ اُن کو مسلمانوں کے تنزل کا یقین دلانا ایسا ہی مشکل تھا جیسا کہ مرغابی کو طوفان سے خوف دلانا۔ اسی لیے تہذیب الاخلاق کا اثر

صرف متوسط درجہ کے لوگوں میں محدود رہا جو نہ محض جاہل تھے اور نہ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ اور سفدوس کے لحاظ سے نہ نہایت پست حالت میں تھے اور نہ اعلیٰ درجہ میں۔ پھر خاص کر دلی اور لکھنؤ اور اُن کے نواح میں جہاں مسلمانوں کی قدیم شائستگی کے کچھ دُھندلے نشان باقی تھے اس کا اثر بہت کم ہوا۔ باوجود اس کے چونکہ اُس کی آواز زمانہ کی گونج کے موافق تھی اُس نے توقع سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔

زیادہ تر اُس کے مقبول ہونے کا سبب یہ تھا کہ اُس کے مضامین معجزو اعظم سرسید کی دلنشیں تحریریں اور سید مہدی علی خاں کے دلکش آرٹیکل تھے۔ سرسید کی تحریر کی نسبت یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ اُس کے دیکھنے کے بعد آدمی اپنے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ سید مہدی علی خاں کی تحریروں پر بھی لوگ سر دُھنتے تھے۔ اس کے سوا اُس میں ہر ایک بات نرمی اور سنجیدگی سے برخلاف اس قدیم دلآزار طریقہ کے جو مسلمانوں کے مناظرات و مجادلات میں جاری تھا، بیان کی جاتی تھی۔ کسی شخص کی طرف روئے سخن بہت کم ہوتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ قوم کی عام حالت پر بطور دلسوزی کے نہ بطور طعن و تعریض کے گفتگو کیجاتی تھی۔ اُس میں ظرافت بھی ہوتی تھی۔ مگر نہ ایسی کہ کسی کو ناگوار گذرے اُس میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب نہایت ضرورت کے سوا کبھی نہ دیے جاتے تھے اور اس لیے مناظرہ کے بے مزہ ردوبدل اور جواب ردّ جواب و کدّ جواب و عدجواب کے ناگوار تسلسل سے وہ بالکل پاک تھا کیونکہ اُس کے جاری کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ جو بات صحیح معلوم ہو وہ لوگوں کے کان میں ڈالدی جائے نہ یہ کہ اُن سے زبردستی منوائی جائے۔

تہذیب الاخلاق میں عام خبریں درج نہیں ہوتی تھیں مگر مدرسۃ العلوم کے متعلق کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کی روئدادیں اور تمام حالات اُس میں کئی برس تک برابر چھپتی رہیں، اس لیے مدرسۃ العلوم کو اُس سے بہت تقویت پہنچی، ادھر تو اس کے مضامین لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر رہے تھے اور اُدھر چندہ کی روز افزوں ترقی، بانیان کالج کی سرگرمی، اور سرسید کی کوششوں کے عملی نتائج اُس کے ذریعہ سے دریافت ہوتے تھے اور اس لیے روز بروز مدرسۃ العلوم کی عظمت کا خیال لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا تھا۔

۱۸۷۶ء میں جب سرسید پنشن لیکر علیگڑھ میں آ گئے تو اُن کو ہمہ تن مدرسہ کی تکمیل، اُس کی عمارتیں تیار کرنے اور ہر طرح سے کالج کی زمین کو آباد و سرسبز کرنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا، اس کے سوا اُن کے وہ دوست جو تہذیب الاخلاق کے سرگرم معاون تھے وہ زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نیز تہذیب الاخلاق اپنا کام بہت کچھ کر چکا تھا اور مسلمانوں میں جس قدر کہ اُبال آنے کی قابلیت تھی اُس قدر اُبال پیدا کر چکا تھا۔ ان تمام وجوہات سے اُس کو بند کرنا پڑا اور یکم رمضان ۱۲۹۳ھ کے پرچہ پر اس کا خاتمہ ہو گیا چھ برس کے عرصہ میں ۲۲۶ مضمون تہذیب الاخلاق میں چھپے جن میں سے چھوٹے بڑے ۱۱۲ مضمون صرف سرسید کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی اور لوگوں کے۔

جن لوگوں کو تہذیب الاخلاق کا چسکا لگ گیا تھا اُن کو اس کا بند ہونا شاق گذرا اور اُن کی طرف سے برابر تحریکیں ہوتی رہیں کہ اُس کو پھر جاری کیا جائے، آخر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ میں دوسری بار جاری کیا گیا جو دو برس پانچ مہینے جاری

رہ کر بند ہوگیا۔اس دفعہ چونکہ سرسید کی توجہ زیادہ تر تفسیر لکھنے کی طرف معروف رہی اور اُن کے سرگرم معاونوں کو اُس سے مدد دینے کی فرصت یا موقع نہ تھا اس لیے اُس میں پہلے کی نسبت عمدہ مضامین کم نکلے۔اب کی بار کل ۱۷۰ مضمون چھپے جن کے لکھنے والے مختلف ۳ آٹھ شخص تھے۔ ازاں جملہ ۴۲ مضمون سرسید کے اور باقی اور لوگوں کے تھے۔شوال ۱۳۱۱ھ ہجری میں سرسیّد نے نواب محسن الملک کی تحریک سے اُس کو پھر جاری کیا مگر اس دفعہ اس کا دارومدار بالکل سرسیّد کی ذات پر رہا اور لوگوں نے اُس میں بہت مدد دی آخر تین برس جاری رہ کر بند ہوگیا۔

# کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

تہذیب الاخلاق ہی کے ساتھ سرسید نے دوسرا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم پر غور کرنے کے لیے انھوں نے بنارس ہی میں ایک دوسری کمیٹی قائم کی۔ وہ لندن ہی سے ایک اشتہار تدابیر ترقی تعلیم مسلمانان کی نسبت اُردو اور انگریزی میں چھپوا کر اپنے آنے سے پہلے مولوی سید مہدی علی خاں کے پاس جو اُس زمانے میں مرزا پور میں تحصیلدار تھے اشاعت کی غرض سے بھیج چکے تھے مگر اُنھوں نے اس کی تمام کاپیاں ایک صندوق میں ڈال دیں اور معمولی اشتہاروں کی طرح اُس کی اشاعت کو محض بے سود خیال کیا۔جب سرسیّد ولایت سے واپس آئے اور مولوی صاحب سے ملے تو انھوں نے تمام اشتہار سرسید کے سامنے رکھ دیے اور یہ کہا کہ ہر شخص سید احمد خاں نہیں ہے جو اس کام کو کر سکے۔اب سرسیّد نے خود اُس کام کو شروع کیا۔ وہی اشتہار جس کا عنوان یہ تھا "التماس بخدمت اہل اسلام و حکامِ ہند در باب ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" جہاں

جہاں مناسب سمجھا بھیجا اور اخبار کے ذریعہ سے بھی اُس کو شائع کیا، خلاصہ اِس التماس کا یہ تھا کہ " انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اٹھا رہے ہیں اور مسلمان اُن سے مستفید نہیں ہوتے، اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیے کیونکہ جو اسباب اور لوگوں نے ابتک بیان کیے ہیں اُن پر کافی بھروسا نہیں ہو سکتا اور بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ درحقیقت وہی اصلی اسباب ہیں۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصلی جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے اور مسلمانوں کو اس مسئلہ پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کام کے لیے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔ جب چندہ بقدر ضرورت جمع ہو جائے اُس وقت چندہ دہندگان میں سے ممبر منتخب کر کے ایک کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقد کی جائے۔"

اس چندہ میں سب سے پہلے سرسیّد نے ایک رقم اپنی طرف سے پیش کی اور باتفاق مولوی مہدی علی خاں کے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ دسمبر ۱۸۷۰ء میں یہ اشتہار جاری ہوا تھا اسی مہینے میں ایک ہزار ایک سو دو روپیہ جمع ہو گیا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ جمع ہوتا رہا۔ نواب کلب علیخاں مرحوم رئیس رامپور، کنور وزیر علیخاں مرحوم رئیس داتپور ضلع بلند شہر اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ ظاہر کی تھی۔ الغرض ۲۶ دسمبر کو بمقام بنارس "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" منعقد ہو گئی جس کے سکرٹری سرسیّد قرار پائے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ وہ جہاں ہو سکے اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں، علوم

قدیمہ اُن میں کیوں گھٹ گئے اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے۔ اور جب یہ مواقع ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو اُن کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور اُن تدبیروں پر عمل درآمد کرنے میں کوشش کرے۔ نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ "جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لیے جلسہ قرار پایا تھا اُس سے ایک روز پہلے میں پہنچ گیا تھا۔ رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بھجوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو اُن کے پلنگ پر نہ پایا۔ میں اُن کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ "اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں۔ اور کوئی صورت اُن کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ یہ پھر آپ ہی کہنے لگے۔ کہ "جو جلسہ کل ہونے والا ہے مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گذر گئی ہے کہ دیکھیے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔" نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ "سرسید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گذری اُس کو بیان نہیں کر سکتا اور جو عظمت اس شخص کی اُس دن میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اُس کو میں ہی جانتا ہوں۔"

اُسی تاریخ انعامی اشتہار جس میں تین انعام پانسو، تین سو، ڈیڑھ سو روپئے کے مقرر ہوئے تھے جاری کیا گیا اور میعاد معین تک ۳۲ مضمون مختلف لوگوں

کے لکھے ہوئے سکرٹری کے پاس پہنچے۔ مولوی مہدی علی خاں کا مضمون سب سے عمدہ تھا مگر اُن کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا اور پہلا مولوی سید اشرف علی ایم اے کو جو اُس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے، دوسرا نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین کو اور تیسرا مولوی عبدالودود کو ملا۔ سرسیّد نے ان مضامین سے ایک عمدہ رپورٹ اُردو انگریزی میں تیار کی جس میں تمام رسالوں کا خلاصہ کرکے اُن سے مفصلۂ ذیل نتائج استخراج کیے تھے:

۱- ہندوستان کے سمجھدار مسلمان اس تعصبات کو جو پُرانے خیال کے مسلمان انگریزی تعلیم کی نسبت رکھتے ہیں لغو اور مسلمانوں کے حق میں مضر جانتے ہیں۔

۲- مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدارس میں بمقابلہ ہندو طالب علموں کے جتنی ہونی چاہیے اُس سے بہت کم ہے۔

۳- جن خیالات سے مسلمان سرکاری مدارس میں اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے اُن میں سے کچھ ناواجب اور اکثر واجبی ہیں اور سرکاری طریقۂ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہے۔

۴- اگر گورنمنٹ مسلمانوں کے لیے اپنے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی کر دے تو بھی اُن کی تمام ضرورتیں رفع نہیں ہوسکتیں۔

۵- مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کا فکر آپ کریں اسی رپورٹ میں مجوزہ کالج کی سکیم اور طریقۂ تعلیم بھی مندرج تھا جو سرسید نے کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔

مسلمانوں کی ترقی کے موانع جو سرسید نے اس رپورٹ میں تمام رسالوں سے استنباط کر کے لکھے تھے اُن کی نسبت شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "ایجوکیشن کمیشن نے بھی ۱۸۸۳ء میں تمام ہندوستان کے معتبر گواہوں کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی تعلیم کے وہی موانع تسلیم کیے ہیں جو سرسید نے ۱۸۷۲ء میں اپنی رپورٹ میں درج کیے تھے۔"

اس رپورٹ کی ایک ایک جلد گورنمنٹ ہند اور تمام لوکل گورنمنٹوں میں بھی بھیجی گئی تھی، چنانچہ مدراس، بنگال اور بمبئی کی لوکل گورنمنٹوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو جو تدبیریں اور کارروائیاں اب تک کی تھیں اُن کے تمام کاغذات سکرٹری کے پاس بھیجد یے اور گورنمنٹ شمال مغرب نے اس رپورٹ کی کچھ جلدیں تعلیمی کمیٹیوں کو تقسیم کرنے کی غرض سے طلب کیں اور یہ وعدہ کیا کہ اگر کمیٹی کی کوشش سے کالج مجوزہ قائم ہو گیا تو گورنمنٹ علوم دنیوی کی تعلیم کے لیے بموجب قواعد گرانٹ اِن ایڈ کے اس مدرسہ کو مدد دے گی۔ اس کے بعد سکرٹری گورنمنٹ ہند کی چٹھی مورخہ ۹ اگست ۱۸۷۲ء اس مضمون کی پہنچی کہ "نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل کو تجویز مندرجۂ رپورٹ کمیٹی خواستگار ترقی کی اطلاع سے جو بابت قائم کرنے اینگلو اورنٹیل کالج کے ہے، نہایت خوشی ہوئی ہے اور وہ دل سے امید رکھتے ہیں کہ اس تجویز میں جیسی کامیابی ہونی چاہیے ویسی ہی ہوگی۔ شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تدبیر اس بات کی مستحق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گورنمنٹ اُس میں مدد دے۔ اور سید احمد خاں بہادر اور اُن صاحبوں کی کوششیں جو اس عمدہ کام میں اُن کے شریک ہیں نہایت تحسین و آفرین کے قابل ہیں۔" ان دونوں چٹھیوں کے آنے

سے کمیٹی کو حد سے زیادہ تقویت ہوئی۔

# کمیٹی خزنتہ البضاعۃ

ایک دوسری کمیٹی اس غرض سے کہ قیام مدرسۂ مجوزہ کے لیے وقتاً فوقتاً چندہ وصول کرتی رہے مقرر کی گئی جس کا نام "کمیٹی خزنتہ البضاعۃ لتاسیس مدرستہ المسلمین" رکھا گیا اور اُس کے لائف سکرٹری سرسیّد قرار پائے اور یہ ٹھیرا کہ جب تک مدرسہ قائم کرنے کے لیے لائق سرمایہ جمع نہ ہو جائے تب تک اس کمیٹی کا مقام وہیں رہے جہاں لائف سکرٹری کا قیام ہو چنانچہ جب تک مدرسہ علیگڑھ میں قائم نہ ہو گیا تب تک کمیٹی مذکور کا دفتر بنارس ہی میں رہا جہاں سرسیّد جج سمال کاز کورٹ تھے۔

جولائی ۱۸۷۲ء میں سرسیّد نے کمیٹی خواستگار تعلیم کی طرف سے ایک اشتہار جاری کیا جس میں مسلمانوں سے پوچھا گیا تھا کہ مدرستہ العلوم کونسے شہر میں قائم کیا جائے۔ اس اشتہار کے جاری کرنے کی یہ ضرورت تھی کہ بعض لوگ جو پرامیسری نوٹ خریدنے کے برخلاف تھے چندہ اس شرط سے دیتے تھے کہ ہمارے روپیہ سے جائیداد خریدی جائے۔ پس تاوقتیکہ مدرسہ کے لیے کوئی جگہ قرار نہ پائے جائیداد نہیں خریدی جا سکتی تھی کیونکہ جائیداد کا مقام مدرسہ کے قریب خریدا جانا ضروری تھا۔ اس اشتہار پر مختلف رائیں لوگوں نے ظاہر کیں مگر سب سے زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی جنھوں نے علیگڑھ کو ترجیح دی تھی اُن کو معلوم تھا کہ سرسیّد نے مدت سے ارادہ کر رکھا ہے کہ پنشن لینے کے بعد دلّی کی سکونت ترک کر کے علیگڑھ میں بود و باش اختیار کریں۔ کیونکہ غدر کے بعد دلّی کے مسلمانوں کی جو حالت ہو گئی

تھی وہ اُن سے دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ اُن کو پنجاب کی طرزِ حکومت پر بھی اعتراض تھا۔ چنانچہ انھوں نے پنجاب کے ایک جلیل القدر حاکم سے صاف کہدیا تھا کہ دلّی کو شمال مغربی اضلاع سے نکال کر پنجاب میں داخل کرنا انھیں سزاؤں میں سے ایک سزا ہے جو فتح دہلی کے بعد اہل دہلی کو دی گئیں۔ اس کے سوا مسلمانوں کی تعلیم کا جو اعلیٰ منصوبہ سرسیّد نے باندھا تھا اُس کا دلّی میں پورا ہونا ممکن معلوم ہوتا تھا۔

کمیٹی کو سب سے زیادہ تقویت اس بات سے ہوئی کہ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے بعض شرائط کے ساتھ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی شاخ میں اسکالرشپ دینے کے لیے دس ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دینے کا وعدہ فرمایا اور سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب نے ایک ہزار روپیہ کا چندہ اور اسی طرح مسٹر اسپنکی جج ہائی کورٹ الہ آباد نے ایک معقول رقم مدرسہ کے لیے عنایت کی۔ ان عطیوں نے سرسیّد کی کوششوں میں جان ڈالدی اور کمیٹی کی ڈھارس سی بندھ گئی۔ جب اس طرح سے چندہ میں ترقی ہونے لگی تو سرسید نے کمیٹی میں تحریک کی کہ کمیٹی خزانۃ البضاعۃ کی موجب ایکٹ ۲۱ ۱۸۶۰ء کے رجسٹری ہو جانی چاہیے۔ ورنہ تمام جائداد اور پرامیسری نوٹ سکرٹری کے یعنی میرے نام سے خریدے جائیں گے اور میرے اور میرے وارثوں کے نام منتقل ہو سکیں گے۔ چنانچہ کمیٹی مذکور کی رجسٹری حسب ضابطہ عمل میں آئی اور تمام مسلمانوں کو چھاپہ کے ذریعہ مطلع کیا گیا کہ جو سرمایہ مدرسۃ العلوم کے لیے جمع ہوا ہے یا آئندہ جمع ہوگا اس کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے۔

فروری ۱۸۷۳ء میں سیّد محمود نے ایک اسکیم انتظام و سلسلۂ تعلیم

کی جو ولایت کے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کا انتظام اور طریقۂ تعلیم دیکھ کر مرتب کی تھی مجوزہ کالج کے لیے پیش کی۔ موجودہ ممبروں نے اس کو پسند کیا اور منظوری کے لیے اُس کی کاپیاں چھپ کر تمام ممبروں کے پاس بھیجی گئیں اور نیز لوکل گورنمنٹوں اور گورنمنٹ ہند میں بھی اُس کی نقلیں ارسال کی گئیں تاکہ اگر گورنمنٹ اُس اسکیم کو پسند کرے تو گرانٹ اِن ایڈ سے حسب وعدہ امداد کرے۔ نیز ایک استفتا مع اس اسکیم کے علمائے وقت کے پاس بھیجا گیا جس میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ جس مدرسہ میں اس اسکیم کے موافق تعلیم دی جائے گی اُس میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں۔

جب یہ استفتا شائع ہوا تو کانپور سے مولوی امداد العلی نے جو اُس وقت وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے ایک دوسرا استفتا شائع کیا جس میں بنارس کے استفتا کو غلط اور دھوکا دینے والا بنایا تھا اور لکھا تھا کہ جو لوگ مدرستہ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں۔ یہ پہلی مخالفت تھی جو علانیہ مدرستہ العلوم کے ساتھ کی گئی۔ اس کے بعد دھڑادھڑ مخالفتیں ہونی شروع ہوئیں۔ بعض نے مشہور کیا کہ مدرسہ میں سید احمد خاں کا بُت اور اُن کے معاونوں کی تصویریں قدِ آدم یا نصف قدِ آدم رکھی جائیں گی۔ بعض کہتے تھے کہ وہاں شیعوں کے مذہب کی کتابیں بھی پڑھائی جائیں گی اور اس باطل کی اعانت کی جائے گی۔ بعض کہتے تھے کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد و اقوال ہوں اُس کے قائم کیے ہوئے مدرسہ میں چندہ دینا یا اُس میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا مسلمان کا کام نہیں۔ بعض کا یہ اعتراض تھا کہ جو روپیہ چندہ سے جمع ہوگا وہ سود میں لگایا جائے گا اور اس کے پرامیسری نوٹ خریدے جائیں گے اور مدرسہ میں لڑکوں کو انگریزی لباس پہننا پڑے

گا بعض کہتے تھے کہ یہ تمام شور و غل سید احمد خاں کے دم تک ہے اس کے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کام کو سرانجام کر سکے اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کو سن کر سمجھ دار آدمیوں کے دل بھی افسردہ ہو جاتے تھے۔ یہ تمام باتیں اخباروں میں شائع ہوئی تھیں، چند دیسی اخبار ہمیشہ سرسید اور مدرسۃ العلوم کے خلاف مضمون لکھتے تھے۔ ایک آدھ مضمون انڈین آبزرور میں بھی مدرسہ کے خلاف نہایت سخت لکھا گیا تھا۔ مگر اودھ اخبار، پنجابی اخبار، اُردو گائیڈ، پٹیالہ اخبار اور انگریزی اخباروں میں پائونیر ہمیشہ مدرسہ کی تائید کرتے تھے۔

جب اس قسم کی مخالفتیں ہونے لگیں اور اتفاق سے انھیں ایام میں چندہ کی آمد بھی سست پڑ گئی تو سرسید کے دوست مایوس ہونے لگے۔ انھوں نے دوستوں کی ہمت بندھوانے اور مسلمانوں کے دل سے غلط خیالات اور مخالفوں کے اعتراض رفع کرنے کے لیے ایک نہایت مفصل مضمون تہذیب الاخلاق میں چھاپا اور دیگر اخبارات سے بھی اُس کے شائع کرنے کی درخواست کی۔ اُس کے اخیر کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں "اب وہ وقت نہیں رہا کہ صرف کاغذ کے گھوڑے دوڑانے سے کام چلے بلکہ ہماری کمیٹی کے ممبروں کو خود شہر بہ شہر اور ضلع بہ ضلع دورہ کرنے، اسپیچیں سنانے اور لوگوں کے دلوں کو جوش میں لانے کا وقت ہے، اس کام کے لیے علاوہ فرصت کے روپیہ بھی درکار ہے کہ بدوں خرچ کے دورہ نہیں ہو سکتا۔ کمیٹی کی تھیلی میں جو گیا پھر نہیں نکلتا، پس دورہ کرنے کا وقت، اُس کی محنت اور اس کا خرچ سب ہم کو اپنی گرہ سے کرنا ہے۔ اگر خدا کی مرضی ہے تو ہم سب کچھ کریں گے۔ اگر زندہ ہیں اور خدا کو بھی منظور ہے تو اپنے مخالفوں کو دکھائیں گے کہ خدا نے کیا کیا اور

اگر اس بیں آنکھ بند ہوگئی اور لحد میں جا سوئے تو یہ امید رکھیں گے کہ "مردے
از غیب بروں آید و کارے بکند"

اب سرسید نے چندہ جمع کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرنی شروع کی۔ جہاں جہاں اُن کے دوست اور مددگار تھے وہاں اس غرض کے لیے سب کمیٹیاں قائم کیں، جیسے مرزا پور، علیگڑھ، کانگڑہ، پٹیالہ وغیرہ۔ اور خود سرسید نے مع اپنے اکثر دوستوں کے اسی مطلب کے لیے پٹنہ، لاہور، گورکھپور وغیرہ کا سفر کیا اور ہر ایک مقام پہ نہایت زبردست اسپیچیں اور لکچر دیے۔ تمام سب کمیٹیوں نے توقع سے زیادہ چندہ جمع کیا اور سرسید کے ہر ایک سفر میں معتدبہ کامیابی ہوئی۔ انھیں دنوں میں سرسید نے ایک سرکلر بحیثیت سکرٹری ہونے کے انگلستان کو بھی روانہ کیا تھا جس میں اپنے یوروپین دوستوں سے درخواست کی تھی کہ وہاں بھی مدرستہ العلوم کے لیے چندہ جمع کرنے کے واسطے ایک کمیٹی قائم کی جائے اور لارڈ لارنس سابق گورنر جنرل ہندوستان، لارڈ اسٹینلی اوف ایلڈرلی، سر بارٹل فریر، سر چارلس ٹریویلین اور اڈورڈ ٹامس کے نام پرائیوٹ چٹھیاں روانہ کی تھیں کہ اس کمیٹی کے قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوں مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس تحریک کا کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ اس مقام پر ایک لطیفہ ذکر کرنے کے لائق ہے۔

جب دوسری بار سید محمود تفریحاً انگلستان کو گئے اور کیمبرج میں اپنے دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے اور آج کل یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ چرچ متعلقہ ٹرنٹی کالج کو منہدم کر کے ایک نہایت عظیم الشان عمارت از سر نو بنائی جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں صرف کیا جائے۔ سید محمود نے اپنے دوست سے برسبیل تذکرہ یہ کہا کہ اچھی خاصی

عمارت کو توڑ کر اُس میں روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے ؛ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اس کی ضرورتوں سے زیادہ بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ مدرسۃ العلوم ہی کی امداد کے لیے دیدیں۔ اُن کے دوست نے کہا کہ ہندوستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؟ سید محمود نے کہا چھ کروڑ۔ وہ سنکر نہایت متعجب ہوا اور یہ کہا کہ "جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلہ ہیں کہ چھ کروڑ آدمی اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے" اُن کی اعانت کرنی گناہ ہے اُن کو تباہ ہونے دو۔"

# ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے جو ہندوستان کے مدبران سلطنت میں شمار ہوتے ہیں ایک کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی خیالات پر لکھ کر شائع کی جس کا نام "اورانڈین مسلمانز" تھا اس کتاب میں انھوں نے اپنی دانست میں یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے اور گورنمنٹ کی کسی طرح خیر خواہ نہیں بن سکتی۔ نیز وہابیت اور بغاوت مترادف الفاظ ہیں، پس گورنمنٹ کو اُن کی طرف سے مطمئن اور بے فکر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کتاب کے عنوان کی عبارت یہ تھی، "کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے ایمان کے ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے"؟ آگے چل کر انھوں نے ایک مقام پر لکھا تھا کہ "اس بیان سے معلوم ہوا کہ تمام مسلمان اپنے بغاوت سکھانے والے پیغمبر کی زہر آمیز نصیحتوں کو نہایت ذوق وشوق سے سنتے ہیں اور ایسے بہت تھوڑے ہیں جو اپنی تیزی طبیعت سے اپنی

شریعت کا کچھ اور مطلب ٹھیرا کر بغاوت کے بڑے فرض سے بچ جاتے ہیں۔" پھر اس کے بعد لکھا تھا کہ " ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں۔" پس اگرچہ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے شروع میں یہ ظاہر کیا تھا کہ " اس کتاب کے مطالب صرف بنگالہ کے مسلمانوں سے متعلق ہیں کیونکہ میں صرف انھیں سے زیادہ واقف ہوں۔" لیکن جو فقرے ان کی کتاب کے اوپر نقل کئے گئے ان سے صاف پایا جاتا ہے کہ انھوں نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے گورنمنٹ کو بدگمان اور غیر مطمئن کرنا چاہا تھا۔

جس زمانہ میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب شائع ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ ۵۷ء کا ہنگامہ انگریزوں کو ابھی تک فراموش نہیں ہوا تھا، دوسرے بنگالہ کے وہابیوں کے مقدمات کا سلسلہ جاری تھا۔ تیسرے انھیں دنوں میں مسٹر نارمن چیف جسٹس بنگال کا ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہونا اس پر اور طرہ ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے معزز شخص کی کتاب نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا ہوگا اور مسلمانوں کی طرف سے ان کی بدگمانی کو کس حد تک پہنچا دیا ہوگا۔

سرسیّد اپنے ریویو میں لکھتے ہیں کہ " میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو مسلمانوں کا بڑا دوست ہے، نہایت شوق سے دیکھنی شروع کی تھی، مگر افسوس ہے کہ مجھ کو اس کے پڑھنے سے بڑی مایوسی ہوئی اور بے اختیار منہ سے نکلا کہ خدا مجھ کو میرے دوستوں سے بچائے۔" انھوں نے اس ریویو میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر

کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک اور وہابیت کے اصول بشرح بیان کیے ہیں، اور صاف اقرار کیا ہے کہ میں خود وہابی ہوں[1] اور وہابی ہونا جرم نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کی بدخواہی اور بغاوت جرم ہے۔ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہوگا خواہ وہ وہابی ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا بلا خیال مذہب کے مجرم قرار پائے گا۔ انھوں نے جہاد کے مسئلہ کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اس کی نسبت تھیں ان کو اچھی طرح ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور مستامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں وہ شریعت اسلام کی رو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں نہ بغاوت نہ اور کسی قسم کا فساد، ان کو ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کے زیر حکومت اسی اطاعت و فرماں برداری سے از روئے مذہب اسلام کے رہنا واجب ہے جیسا کہ ہجرت اولیٰ میں مسلمان حبش میں جا کر عیسائی بادشاہ کے زیر حکومت رہے تھے۔

سرسید کے ریویو نے تمام انگریزی حکام کے دل پر اور نیز انگلستان کے

---

[1] سنا ہے کہ جن دنوں بنگال میں وہابیوں کی تحقیقات اور تلاش ہو رہی تھی ایک یورپین معزز افسر سے جو اسی کام پر مامور تھا ریل میں سرسید سے مڈبھیڑ ہوگئی، دونوں آگرہ جا رہے تھے اور سرسید کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ افسر وہابیوں کی تلاش پر مامور ہے اس افسر نے ان سے پوچھا کہ آپ کا کیا مذہب ہے، انھوں نے کہا وہابی مسلمان ہوں۔ پھر اس نے سرسید کا سارا پتہ دریافت کیا انھوں نے صحیح صحیح بیان کر دیا۔ جب ریل آگرہ میں پہنچی دونوں اتر کر اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے گئے پھر سرسید بٹن صاحب کمشنر آگرہ سے ملنے کو گئے اتفاق سے وہ افسر انھیں کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا اور ان سے ذکر کر چکا تھا کہ اس حلیہ اور اس نام کا ایک وہابی مسلمان فلاں جگہ ٹھیرا ہوا ہے۔ اب صاحب کمشنر نے افسر مذکور کو بلا کر کہا کہ لو یہ تمہاری اسامی حاضر ہے جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ شخص باوجود وہابی ہونے کے بڑا خیر خواہ سرکار ہے تو اسے نہایت تعجب ہوا اور سب بہت دیر تک اس بات پر ہنستے رہے۔

لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا۔ اُس زمانہ میں حافظ احمد حسن مرحوم وکیل ٹونک لندن میں تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور بُرے خیالات مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں انھوں نے تمام ریویو پایونیر کے پرچوں سے نقل کر کے جدا بطور پمفلٹ کے چھپوا دیا اور لندن میں جا بجا تقسیم کر دیا۔ سنا ہے کہ جب وہ لندن سے آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ اُس ریویو کے شائع ہونے سے لندن میں لوگوں کی طبیعتوں کا ایسا حال ہو گیا تھا جیسے کہ جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے۔ جو شخص اُس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر تعجب کرتا تھا اور جو کچھ انھوں نے مسلمانوں یا وہابیوں کی نسبت لکھا تھا اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔

ہندوستان میں جب یہ ریویو پایونیر کے ذریعہ سے شائع ہوا انھیں دنوں میں پایونیر مورخہ ۲۳ نومبر ۱۸۷۱ء میں ایک بہت مبسوط آرٹیکل جو کسی بڑے لائق عربی داں انگریز کا لکھا ہوا تھا اور جس کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ وہ سر ولیم میور کا لکھا ہوا تھا، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے برخلاف گویا سر سید کی تائید میں چھپا اور پایونیر سے سوسائٹی اخبار میں نقل ہوا۔ اس آرٹیکل میں نہایت علامانہ لیاقت سے ڈاکٹر ہنٹر کے شبہات کا جواب دیا گیا تھا اور سر سید کی تائید کی گئی تھی۔ اُس کے آخر کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:۔

"وہابی وہ ہے جو خالص خدا کی عبادت کرتا ہو، موحد ہو اور اس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو۔ اُس کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ در پردہ تخریب سلطنت کی فکر میں اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے، محض تہمت ہے ہم اس وقت بہت سے ایسے آدمی

نشان دے سکتے ہیں جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ اُن سے زیادہ سرکار کا خیرخواہ اور معتمد کوئی نہیں، بااینہمہ وہ اپنے تئیں علی الاعلان اور بے تامل فخریہ طور پر وہابی کہتے ہیں اور سرکار نے بے سوچے سمجھے اُن کو معتمد علیہ نہیں گردانا بلکہ غدر کے زمانہ میں جبکہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی اُن کی وفاداری کا سونا اچھی طرح سے تایا گیا اور وہ خیرخواہی سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر وہ جہاد کا وعظ کہتے ہوتے اور بغاوت وہابیت کی اصل ہوتی تو جو کچھ اُن سے ظہور میں آیا یہ کیونکر ظہور میں آتا۔ ہم ڈاکٹر ہنٹر کی آگاہی کے لیے ان لوگوں کے چال چلن کو پیش کرتے ہیں۔"

اس کے ایک مدت بعد انڈین آبزرور مورخہ ۱۶ مارچ ۱۸۷۲ء میں خود اُس کے یوروپین اڈیٹر کا ایک زبردست آرٹیکل سر سید کے ریویو پر نکلا جو درحقیقت ہندوستان کے یوروپین حکام اور افسروں کی رائے کا آئینہ تھا۔ ہم اس آرٹیکل کے چند مقام یہاں بجنسہٖ نقل کیے دیتے ہیں۔ تاکہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس ریویو نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا تھا اور تاکہ ہندوستانیوں پر ظاہر ہو جائے کہ انگریز سچی بات کے قبول کرنے میں کس قدر غیر متعصب اور منصف مزاج ہوتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ "ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں نے یا دنیا میں سے اس گروہ کے لوگوں نے جو اس قسم کی باتوں سے سروکار رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب متعلقہ مسلمانانِ ہندوستان کی قدر و منزلت کی بابت، بلکہ ٹھیک ٹھیک یہ کہنا اچھا ہے کہ اس کے لچر و پوچ ہونے کی بابت بالاتفاق تصفیہ کر دیا ہے۔ جہاں تک کہ ہم کو لٹریچر میں مداخلت ہے اُس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر

کی کتاب کو لاثانی سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے سوا ہم نہیں جانتے ہیں کہ کسی مصنف نے
دیدہ و دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو
جس کسی کو کچھ بھی علم اُن باتوں کا ہو گا جن کی بحث اس کتاب میں ہے وہ ایک
ہی نظر میں معلوم کرلے گا کہ ڈاکٹر ہنٹر مسلمانوں کے مذہب کی نسبت اور
خاصکر وہابیوں کے مذہب کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتے وہ شمال مغرب
کی سرحد کے لوگوں کی حالت سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہاں تک کہ جو قومیں
اُس ملک میں بستی ہیں اُن کے نام تک نہیں جانتے اور امورات سلطنت
کی پیچیدہ باتوں کی نسبت اور اس بات کی نسبت کہ سید احمد کے زمانہ میں
سکھ اور افغانوں کے باہم کیا معاملہ تھا، نہایت دھندلے خیالات کے سوا
انھوں نے اور کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور جب سے کہ ملک پنجاب
گورنمنٹ انگلشیہ کے قبضہ میں آیا ہے اُس کے بعد کی سرحدی تاریخ سے بھی
ناواقف ہیں اور جو مسلمان خاص بنگالہ کی حد سے باہر رہتے ہیں اُن کے
حالات سے بالکل بے خبر ہیں بلکہ جب اُن لوگوں کا ذکر کرتے ہیں تو اُس میں
ایک غلطی سے دوسری غلطی میں پڑتے ہیں اور جب وہ اپنے خیال اور قیاس
کو اکبر کے زمانہ کے حالات کے تذکرہ سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تو
ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو ہنسی کے قابل اور بالکل غیر ممکن ہیں۔ اگرچہ
وہ دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث ایک مکہ کے مولوی کیسی فصاحت
اور واقفیت کے ساتھ کرتے ہیں، تاہم اُن کے مباحثہ کے ہر حصہ کے
مانند ان باتوں کا علم بھی اُن کو اُن مہمل اور بے سر قہ خیالات سے کچھ بڑھ
کر نہیں ہے جو ہر ایسے تعلیم یافتہ اشخاص کے ہوتے ہیں جس نے کچھ
ہسٹری پڑھی ہو۔"

"اسی بڑی ناواقفیت کے باعث ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب میں ایک ایسا وصف ہے جو اُس کے ساتھ مخصوص ہے جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ یہ کتاب لٹریچر کے کتب خانہ میں بے نظیر ہے۔ ہر شخص جس نے سید احمد خاں کی تحریر کو پڑھا ہے ضرور یقین کرے گا کہ ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے اُس میں اس معاملہ کے اصل حالات کی نسبت کچھ مبالغہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر کو یہ توقع کہ اپنی فصاحت و بلاغت اور دلفریب عبارت کے ذریعہ سے کامیاب ہو جائیں گے، مگر ظاہراً انھوں نے اپنی ناواقفیت کی گہرائی کی تھاہ دریافت نہیں کی تھی، یا غالباً یہ سمجھا تھا کہ جس قدر میں جانتا ہوں اُس سے زیادہ کوئی واقف نہ ہوگا اس لیے کوئی میری باتوں کی اصلاح نہ کر سکے گا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے میزبان میری کیسی مدارات کریں گے؛ ان کی اس بات پر ہم سے زیادہ اور کسی کو افسوس نہ ہوگا۔ غالباً ڈاکٹر ہنٹر ابھی زندہ رہیں گے اور بہت سی کتابیں لکھیں گے جن کی عبارت بہت سے لوگوں کے دل کو لبھائے گی، مگر اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُن کے ہاتھ سے ایسی کھوئی گئی ہے کہ پھر کبھی میسر نہ ہوگی۔ کتاب کا پڑھنے والا اُن کی کتابوں کو بغیر اس کے کہ کھول کر دیکھے بالائے طاق رکھ دے گا اور یہ سمجھے گا کہ قصہ کی دلچسپ کتابوں کے مانند ہیں جو اپنی طرز میں نہایت دلفریب ہوتی ہیں مگر کسی کام کی نہیں۔"

"سید احمد خاں کا چھوٹا سا رسالہ سوائے ڈاکٹر ہنٹر کی تردید کے اور بھی خوبی اور عمدگی رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتاب ہے جو ہر طرح سے ہمارے اور اپنے ہم مذہبوں کے درمیان ترجمانی کے کام کے لیے بخوبی لائق ہے۔ سید احمد خاں مذہب اسلام کو خاص خدا کا دیا ہوا ہونے پر نہایت پختہ یقین رکھتے ہیں اور اُن کو یہ بھی یقین ہے کہ آخر کار اور

مذہبوں پر یہی مذہب غالب آئے گا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دل سے اور نہایت گرمجوشی سے انگریزی عملداری کے معاون ہیں وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ اگر انسان وحشیانہ حالت کی طرف مراجعت نہ کرلی چاہیے تو تبدیلیوں کا ہوتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ بغیر کسی استثنا کے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اسلام کو روحانی سلطنت حاصل کرنی ہے تو وہ تہذیب و شائستگی کے ساتھ ملا چلا رہے، کوئی انگریز اس قسم کی دلیل پر اعتراض نہیں کرسکتا، کیونکہ ان کا دعوٰی اس قدر مدلل اور مستند ہے کہ کوئی انگریز ان دلیلوں اور سندوں کا بیسواں حصہ بھی اپنے بیان کی تائید میں پیش نہیں کرسکتا۔ پس اگر سید احمد خاں یہ کہتے ہیں کہ وہابی یا پکّے مسلمان کے دین کا یہ کوئی جزو نہیں ہے کہ گورنمنٹ انگلشیہ کا مقابلہ کرے اور یہ کہ مسلمان پر جیسا اور غیر مذہب والوں کے ساتھ خاص خاص حالتوں میں جہاد کرنا فرض ہے ویسا ہی عیسائیوں کے ساتھ ہے اور ویسا ہی ہندوؤں کے ساتھ اور یہ کہ مسلمان حکمی فرض سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اور مذہب والوں کی مانند تمام بنی آدم کے ساتھ برادرانہ طور پر یگانگت اور اتفاق سے رہیں تو گو اس قسم کے بیانات ہمارے اگلے خیالات کے کیسے ہی مخالف ہوں جب تک کہ ہم کو اس قدر اعلیٰ درجہ کی واقفیت نہ ہو کہ ہم سید احمد خاں پر غلطی کا الزام لگا سکیں اُس وقت ہم کو ان باتوں کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعصب اور فساد کے مقابلہ میں ہم زیادہ احتیاط نہ کریں، لیکن اب ایسی باتوں کا خوف حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے، کیونکہ انگریزوں کے دلوں میں علی العموم اس بات کا یقین ہے کہ مسلمان جس قدر زیادہ ایماندار ہوگا اُسی قدر انتظام کا سخت دشمن ہوگا اور اُسی قدر اس کا پکّا

ارادہ ہوگا کہ یا تو وہ اُسے توڑے یا خود اُس سے ٹوٹ جائے، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے لوگ جن کو یہ یقین ہے کہ اگر ہم کسی انگریز کو حق یا ناحق مار ڈالیں تو ہم کو ثواب دائمی ملے گا، گورنمنٹ انگلشیہ کے لیے نہایت دقت کی چیز ہیں۔ پس یہ نہایت تسلی اور راحت کی بات ہے کہ ایسی عمدہ سند سے جس کی عمدگی حتی الامکان ثابت ہے یقین دلایا جائے کہ یہ خوف بے بنیاد ہے ہم بھی اس قسم کی باتیں بار بار کہہ چکے ہیں مگر ہم کو امید نہ تھی کہ ایک انگریز اخبار نویس کی رائے ایسے معاملہ میں کچھ معتبر ہوگی۔"

اس کے بعد انڈین آبزرور کے اڈیٹر نے سرسید کے رسالہ سے چند فقرے نقل کرکے اُن کی تائید کی ہے اور ایک لمبی بحث کے بعد اپنے آرٹیکل کو اس فقرہ پر ختم کیا ہے "ممکن نہیں کہ کوئی بیان اس سے (یعنی سرسید کے بیان سے) زیادہ صاف ہو، اس سے اُن لوگوں کا اطمینان ہونا چاہیے جو بزدل لاد وہمی ہیں۔ سید احمد خاں کے مختصر رسالہ میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا تذکرہ ہم کرتے اگر ہمارے اس پرچہ میں گنجائش ہوتی۔ ہم ایسی کسی کتاب سے واقف نہیں ہیں جس میں ایسی تھوڑی سی جگہ میں مسلمانوں کے خیالات کی نسبت اس قدر زیادہ اطلاع حاصل ہو۔ ہندوستان کے ہر انگریز کو اسے بغور پڑھنا چاہیے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ بہت پھیلے گی۔ یہ ٹھیک اُسی قسم کی کتاب ہے جس کی ضرورت آج کل اُن تمام عام لوگوں کے دلوں کو تسلی اور قرار بخشنے کے لیے ہے جو اپنی ناواقفیت کے سبب سایہ سے بھی بھڑکتے ہیں۔" سر ایلفرڈ لائل اپنے ایک ایسے میں جو سرسید کے بعد تھیو لوجکل ریویو میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریمارک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس مصنف کو مبالغہ کا جن بسا اوقات پریشان کرتا

ہے اور بہتر ہوتا اگر اس جن کو وہ اتار دیتا۔"

سرسید کے ریویو اور بھی بعض مدبرانِ سلطنت نے رائیں لکھی ہیں مگر ہم یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ ریویو اخبارات میں شائع ہونے کے بعد کتاب کی صورت میں بھی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپا تھا۔ اس کی پوری پوری کیفیت جب تک کہ وہ اول سے آخر تک نہ پڑھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی، مگر ہم بطور نمونہ کے اُس کا ایک مختصر مقام اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے تیسرے باب کے خاتمہ پر یہ لکھا تھا کہ "مجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے دلی خیر خواہی اور محبت کی ہرگز توقع نہیں ہے بلکہ میں اُن ذات سے بڑی امید بھی کر سکتا ہوں کہ وہ حکومت انگریزی کے قبول کرنے میں سرد مہری کریں گے۔" سرسید اس پر یوں لکھتے ہیں کہ "اگر ڈاکٹر صاحبوں کو ہم لوگوں کے مسلمان ہونے کے باعث اس قدر مایوسی ہے تو میں اولاً اُن سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ قرآن شریف کی اس آیت کی طرف توجہ فرمائیں۔ "ولتجدن اشد الناس عداوۃ للذین امنوا الیہود والذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃ للذین امنوا الذین قالوا انا نصاریٰ ذلک بان منھم قسیسین ورھبانا وانھم لا یستکبرون" (یعنی اے محمدؐ تم پاؤ گے تمام آدمیوں میں سخت دشمن مومنین کا یہودیوں اور مشرکوں کو اور پاؤ گے مومنین کا سب سے زیادہ دوست اُن لوگوں کو جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ نصاریٰ میں اکثر عالم اور عابد ہیں اور وہ بہت گھمنڈ نہیں رکھتے)۔

"دوسرے یہ مسئلہ مشہور ہے کہ جیسا کوئی کرتا ہے ویسا ہی اُس کو نتیجہ ملتا ہے۔ پس اگر مسلمان محض سرد مہری کے قوم حکمراں کی جانب سے

کچھ سلوک نہیں دیکھتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو مسلمانوں کی سرد مہری پہ کچھ متحیر نہ ہونا چاہیے۔ ہم دونوں قوموں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو حضرت عیسیٰ کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ جس سلوک کے تم اور آدمیوں سے متوقع ہو تم کو بھی اسی طرح ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہیے۔"

پھر اسی باب کے خاتمہ پر ایک حاشیہ میں ڈاکٹر ہنٹر نے مندرجہ ذیل سوال لکھا تھا۔ "سوال اے علماء محققان شرع اسلام تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزوں کی امان ترک کرنی اور اس غنیم کی مدد دینی جائز ہے یا نہیں؛ اس سوال کے جواب میں سرسید نے اوّل اصول اسلام کی رو سے ایک بہت لمبی تقریر کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "جب تک مذہبی معاملات ہیں ہم کو ہر قسم کی آزادی ہندوستان میں حاصل ہے۔ اپنے مذہبی فرائض بے کھٹکے ادا کرتے ہیں اذان جس قدر بلند آواز سے چاہیں مسجدوں میں دے سکتے ہیں۔ شارع عام میں دعوت اسلام کر سکتے ہیں، پادری جو اعتراض مذہب اسلام پر کرتے ہیں ان کا جواب بلاخوف وخطر دے سکتے ہیں، خود مذہب عیسوی پر اعتراض کر سکتے ہیں، اس کے برخلاف کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور عیسائیوں کو بلا کسی مزاحمت اور اندیشہ کے جب وہ مسلمان ہونا چاہیں، مسلمان کر سکتے ہیں، اس وقت تک انگریزی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے۔ اور اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ گنہگار خیال کیے جائیں گے، کیونکہ ان کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کا توڑنا ہوگا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔"

"اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ" البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر آیندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبار عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کریں گے! کیونکہ وہ شخص درحقیقت نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوا عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے، بلکہ میری دانست میں تو شاید رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل ہے۔ چنانچہ جو ملکی لڑائیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں اُن میں باپ بیٹوں سے اور بھائی بھائی سے لڑے تھے۔ پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا! میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو اُن کی پولٹکل حالت اُن سے کروائے گی اور میری دانست میں یہ سخت سوال ہندوؤں سے بھی اسی طرح متعلق ہو سکتا ہے جیسا کہ مسلمانوں سے ہے۔ پس اس لحاظ سے اس کا دریافت کرنا دونوں قوموں سے ضرور ہے۔"

سرسید نے جو کچھ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر لکھا تھا اس کا حال بقدر ضرورت ہم نے بیان کر دیا ہے مگر ہمارے نزدیک بڑی بے انصافی اور ناشکری ہوگی اگر اس مقام پر آنریبل ڈبلیو ڈبلیو ڈاکٹر ہنٹر کے اُس شریفانہ برتاؤ کا ذکر نہ کیا جائے جو اس واقعہ کے بعد سرسید اور مسلمانوں کے ساتھ اُن سے ظہور میں آیا۔ انھوں نے مدرستہ العلوم کے پختہ بورڈنگ ہاؤس میں ایک کمرہ بنانے کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۱۸۸۲ء میں جب وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسیڈنٹ تھے کمیشن کے دورہ کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علیگڈھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ محمڈن کالج میں آکر دی جس میں نہایت بشاشت اور کشادہ دلی کے ساتھ سرسید اور اُن کی کوششوں کی

بے انتہا تعریف اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی۔

# ابتدائی مدرسہ علیگڑھ میں قائم ہونا

فروری ۱۸۷۳ء میں جو جلسہ صدر کمیٹی کا بنارس میں ہوا تھا اُس میں سید محمود نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بہت جلد مقام مجوزہ میں ایک مدرسہ ماتحت مدرسۃ العلوم مجوزہ کے قائم کیا جائے چنانچہ ۲۱۔ اگست ۱۸۷۳ء کو علیگڑھ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہُوا اور جس میں علیگڑھ اور بلند شہر کے اکثر رئیس اور معزز مسلمان شریک تھے، وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی اسپیچوں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی۔ پھر ۲۱۔ دسمبر ۱۸۷۳ء کو دوسرا جلسہ علیگڑھ ہی میں ہوا اور مولوی سمیع اللہ خاں نے تقریر کرتے وقت کہا کہ مدرسۃ العلوم کی مخالفت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے رفع کرنے کی تدابیر اس سے بہتر نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ کے علیگڑھ میں قائم کیا جائے، جس کے طریقۂ تعلیم سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ جو تعلیم صدر کمیٹی بنارس نے تجویز کی ہے وہ کسی طرح اصولِ اسلام کے برخلاف نہیں ہے۔ اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور بعض علمائے اہلِ اسلام نے جو اُس جلسہ میں شریک تھے طریقۂ تعلیم کو جو سکرٹری نے اس وقت بیان کیا بلا محظورِ شرعی تسلیم کیا۔ اس جلسہ میں اور سب کمیٹیوں کی نسبت چندہ کی رقم زیادہ لکھی گئی تھی اور جس شرط پر مدارس ماتحت مختلف مقامات میں جاری کرنے قرار پائے تھے اُس کی طرف سے علیگڑھ کی سب کمیٹی نے کافی اطمینان

کر دیا تھا۔ اس لیے صدر کمیٹی بنارس نے بھی علیگڑھ سب کمیٹی کی تجویز کو پسند کیا اور سکرٹری سے درخواست کی کہ علیگڑھ میں مدرسہ ماتحت جاری کیا جائے مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری سب کمیٹی نے جو اُس وقت علیگڑھ میں سبارڈینیٹ جج تھے نہایت دلی سعی اور کوشش سے صدر کمیٹی کے مقاصد کو انجام دیا اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء جو کہ ملکۂ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔ تاریخ مذکور پر سر سید بھی بنارس سے علیگڑھ آ گئے اور ایک جلسہ میں جس کے صدر انجمن مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر علیگڑھ تھے رسمِ افتتاح عمل میں آئی[۱] اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی تاریخ مذکور سے لے کر اب تک مدرسۃ العلوم کو قائم ہوئے ۲۴ برس کا زمانہ گذر رہا ہے، اس عرصہ کے تمام واقعات اور حالات جو مدرسۂ مذکور کے انتظام اور ترقی سے متعلق ہیں اُن کے لکھنے کے لیے ایک مجدا کتاب کی ضرورت ہے اس لیے یہاں ہم صرف ضروری امور بیان کریں گے جو اس کتاب کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں۔

جس وسیع میدان میں اب محمڈن کالج علیگڑھ اور اس کی تمام عمارتیں موجود ہیں کسی زمانہ میں یہ چھاؤنی سے متعلق تھا اور یہاں فوج کی پریڈ ہوا کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی اور اس میدان میں سے کچھ قطعات لوگوں کو سرکار سے کوٹھیاں بنانے کے واسطے مل گئے تھے لیکن اب بھی

---

[۱] افتتاح کے موقع پر مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد ہاشم نے عربی نظم و نثر بطور مبارکباد کے اور مولوی صفدر حسین نے فارسی اور اردو میں قطعات تاریخ کہے تھے چونکہ یہ سب تحریریں طولانی ہیں اس لیے صرف قطعہ تاریخ تحریر کیا جاتا ہے۔

قریب ۷۲ ایکڑ کے زمین باقی تھی۔ سرسید نے مدرسہ کے لیے کمیٹی کی طرف سے اس زمین کے ملنے کی درخواست کی تھی۔ اُس وقت ہنری لارنس علیگڑھ میں کلکٹر تھے انھوں نے اس قطعہ کے ملنے کی رپورٹ گورنمنٹ میں بھیج دی اور سرولیم میور نے بھی جو اس زمانہ میں لفٹننٹ گورنر تھے اُس قطعہ کے دینے کا وعدہ کر لیا مگر ابھی وہ قطعہ کمیٹی کو ملنے نہیں پایا تھا کہ ماٹی گمبوٹ صاحب علیگڑھ میں قائم مقام کلکٹر ہو گئے۔ انھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی کہ وہ قطعہ کمیٹی کو کالج کے لیے دیا جائے۔ اُن کے بعد جو مسٹر کالون مستقل کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو کر آئے انھوں نے بھی ویسی ہی مخالفت کی اور اس وقت کے تمام یوروپین حکام اُن کے ہم رائے اور ہمزبان ہو گئے یہ ایسی سخت مزاحمت ہوئی تھی کہ بانیان کالج اس کے ملنے سے مایوس ہونے لگے تھے اور قریب تھا کہ وہ کالج کا خیال چھوڑ دیں اور تمام کوششیں برباد ہو جائیں۔ مگر خوش قسمتی سے اُسی زمانے میں سرجان اسٹریچی جن کا اس کالج پر سب سے زیادہ احسان ہے لفٹننٹ گورنر ہو گئے اور یہ معاملہ اُن کے سامنے پیش ہوا۔ وہ خود دورہ کے دنوں میں علیگڑھ آئے اور موقع کو ملاحظہ کیا۔ سرسید بھی بنارس سے علیگڑھ پہنچے اور بہت سی گفت و شنید کے بعد ہز آنر نے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کالج بنانے کے لیے کمیٹی کو اس شرط پر دی جائے کہ جو عمارت اُس میں بنائی جائے اُس کے بننے سے پہلے اُس کا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا جایا کرے اور اگر بالفرض کبھی کوئی ایسا اتفاق پیش آئے کہ یہ کالج بند ہو جائے تو جس قدر عمارات کمیٹی کی بنائی ہوئی یہاں موجود ہوں گی اُن سب پر سرکار کا قبضہ ہو جائے گا۔ کمیٹی نے یہ دونوں شرطیں منظور کر لیں اور سرجان اسٹریچی نے اُس کی منظوری گورنمنٹ ہند سے منگا کر سند عطائے اراضی کمیٹی کو عنایت

کی اور حسب ضابطۂ قطعۂ مذکور پر قبضہ دلایا گیا۔ مدرسہ تا تحت کے افتتاح سے
سے پہلے یہ زمین کمیٹی کو مل چکی تھی اور جس بنگلہ میں ابتک محمڈن ہائی اسکول کی جماعتیں
پڑھتی ہیں۔ اس بنگلہ میں ابتدائی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔

۱۲۔ نومبر ۱۸۷۵ء کو سر ولیم میور جو اُس زمانے میں وائسرائے کی کونسل
کے ممبر تھے مدرسہ کے ملاحظہ کو آئے اور ایک لمبی اسپیچ دی جس میں کمیٹی کو
مبارکباد دینے کے بعد سرسید کی نسبت کہا کہ میں خاصکر اپنے دوست کی دیرینہ
خواہش کے پورا ہونے اور اُن کے دلی مدعا کا پہلا پھل حاصل ہونے پر
اُن کو مبارکباد دیتا ہوں۔

جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی اور مدرسہ کو جاری ہوئے ایک سال گزر
چکا تو سرسید کو ضروری معلوم ہوا کہ نوکری سے علیحدہ ہو کر مدرسے کی تکمیل میں
اطمینان اور کامل توجہ سے کوشش کی جائے کچھ تو سرکاری کاموں کی مصروفیت
مدرسے کے کام میں جارح ہوتی تھی اور کچھ وہ اپنی جبلی احتیاط کے سبب
سے سرکاری عہدہ دار ہونے کی حالت میں چندہ وصول کرنے سے ہچکچاتے
تھے۔ پنشن کا نقشہ تو وہ مدرسہ کے جاری ہوتے ہی بھیج چکے تھے، جولائی ۱۸۷۶ء
کے آخر میں پنشن کی منظوری بھی آگئی اور وہ اُسی وقت ملازمت سے کنارہ
کش ہو کر علیگڑھ چلے آئے اور اپنی قدیم کوٹھی جو علیگڑھ میں تھی ولایت جاتے
ہوئے رہن کر گئے تھے مگر جب یہ امر طے ہو گیا کہ مدرسۃ العلوم علیگڑھ
میں قائم کیا جائے تو سید محمود نے اپنے اور سرسید کے رہنے کے لیے ایک
اور کوٹھی خرید لی تھی اور پہلی کوٹھی کو فروخت کر دیا تھا۔ جب سرسید بنارس
سے آئے تو اس کوٹھی کو اپنی ضرورت کے موافق درست کیا اور اس میں
سکونت اختیار کی۔

جب وہ بنارس سے آئے تو ضلع علیگڑھ کے رؤسا اور معزز لوگوں نے ان کو دعوت دی اور ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں اضلاع قرب وجوار کے رؤسا بھی شامل تھے اس جلسہ میں سرسیّد کو ایڈریس بھی دیا گیا تھا جس میں اُن کے احسانات کا ذکر تھا جو قوم کی بھلائی کے لیے اُن سے ظہور میں آئے سرسیّد نے ایک فقرے کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے وہ ہم بجنسہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "ہاں یہ بات سچ ہے کہ میں نے اپنے اس قدیم نامی اور پرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا میں بنا ہوں اور پھر اُسی میں میری خاک مل جائے گی، صرف مدرستہ العلوم کی محبت، اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسان ضلع علیگڑھ وبلند شہر کی محبت وعنایت کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو؟ دور و دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود عیش وآرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں! جہاں تک ہوسکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرستہ العلوم

قائم کیا جائے جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی ہے۔"

# فونڈیشن سٹون کا جلسہ

الغرض سرسید علیگڑھ میں آ کر ہمہ تن کالج کے کام میں مصروف ہو گئے کالج کی عمارتوں میں جلد از جلد ترقی ہونے لگی، ہندوستان کے اطراف میں چندہ کے واسطے زیادہ تحریکیں اور کوششیں ہونے لگیں اور علیگڑھ صرف دارالعلوم ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد، قومی مصالح اور قومی مقاصد کی تحریک کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا۔ ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر غیر معمولی اور غیر متوقع شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ پہلے یہ تجویز ٹھیری تھی کہ لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے یہ رسم ادا کی جائے گی، لیکن لارڈ ممدوح کو کسی خانگی ضرورت کی وجہ سے پیش از وقت ہندوستان کو چھوڑنا پڑا۔ پھر سرجان اسٹریچی لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس رسم کے ادا کرنے کا وعدہ کیا، مگر سرکاری ضرورتوں کی وجہ سے وہ بھی وقتِ معیّن پر نہ آ سکے۔ آخر لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند کے ہاتھ سے اُس عظیم الشان دربار کے بعد جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا ادا ہوئی۔ لارڈ لٹن نے دربار قیصری کے بعد دلّی سے مدرسۃ العلوم میں آنے کا وعدہ کر لیا تھا، چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو مع لیڈی لٹن کے علیگڑھ میں تشریف لائے اور سرسید کے ہاں مہمان ہوئے۔ سہ پہر کو وقتِ معین پر مع لیڈی صاحبہ کے فونڈیشن کے موقع پر تشریف لے گئے۔ اوّل سیّد محمود نے ایڈریس پڑھا اور وائسرائے نے اُس کا جواب نہایت شیریں زبانی اور اپنی مشہور فصاحت کے ساتھ دیا۔ پھر سرسیّد نے بنیاد کا پتھر رکھنے کی

درخواست کی چنانچہ حضور ممدوح نے بنیاد کا پتھر اس موقع پر جہاں اسٹریچی ہال کے صدر مقام میں سنگ مرمر کا کتبہ بنیاد کے قریب لگا ہوا ہے اپنے ہاتھ سے رکھا اور فونڈیشن کی تمام رسمیں یوروپین قاعدہ کے موافق ادا کی گئیں۔

وائسرائے نے علیگڑھ سے چلتے وقت اپنی تصویر اور کئی جلدیں اپنی تصنیفات سرسید کو بطور یادگار کے عنایت کیں، اس کے بعد ۱۸۷۸ء میں ان کو ایک کشتی نقرئی بطور تحفہ اور یادگار کے بھیجی جس پر عبارت کندہ تھی۔

"بیادگار رکھنے بنیاد کالج کے بدست خاص وائسرائے بتاریخ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء ونشان اعزاز بخشی و دوستی از جانب رابرٹ لارڈ لٹن جی سی بی وجی ام ایس اے وائسرائے و گورنر جنرل ہند بمولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی۔ پریسیڈنٹ اینگلو اورنٹیل کالج اہل اسلام مقام علیگڑھ تاریخ یکم جنوری ۱۸۷۸ء"

سید محمود نے جو سکیم ۱۰- فروری ۱۸۷۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی اس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے۔ پس کمیٹی نے جو انگریزی میں اپنا نام "محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیے اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دارالعلوم نام رکھنا چاہیے اور بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگران حال رہے۔ اس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیے، چنانچہ اس سکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا تھا۔ لوکل گورنمنٹ سے اس کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دینے کی۔ باوجود اس کے سرسید

کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اُن کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ
یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے
اُن کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے
گا، تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی۔ وہ چاہتے
تھے کہ اس دارالعلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلو سسٹم جاری کیا جائے
اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اُس کو کسی خاص علم میں جس سے وہ
خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہنے اور اُس میں کمال حاصل کرنے کے
لیے فیلو شپ دی جایا کرے اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم
میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ کے
ہو۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسہ پر قائم کرنا
کوئی آسان کام نہ تھا، طالب علم اور نہ اُن کے مربی کوئی اس بات پر رضامند
ہونے والا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ
ہیں قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقۃ مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی
تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو فوزِ عظیم سمجھا جائے
الغرض سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہو گئی۔ یونیورسٹی
قائم کرنے کا خیال انھوں نے بالکل چھوڑ دیا اور مدرسۃ العلوم میں وہی کورس
اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں تجویز کریں۔ انھوں نے اپنے دل کو یہ کہ
کر تسلی دے لی۔

نہ ہو تابِ پرواز گر آسماں تک
تو واں تک اُڑیں ہو رسائی جہاں تک

# چندہ وصول کرنے کی تدبیریں

مدرسۃ العلوم کے متعلق سب سے زیادہ مشکل کام چندہ کا وصول کرنا تھا۔ جن کی اولاد کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا منظور تھا اول تو وہ پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے، دوسرے جس وقت مدرسہ کے لیے تحریک شروع ہوئی اُسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہوگیا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے تھے اور جس کی وجہ سے مدرسۃ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے تھے۔ اخباروں اور رسالوں میں مدرسۃ العلوم کے خلاف بے شمار مضامین چھپتے تھے اور سرسید کی تکفیر کے فتوے شائع کیے جاتے تھے۔ مولوی وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ منصبی دباؤ سے چندہ وصول کیا گیا ہوگا سو یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے۔ سرسید نے مدرسہ قائم ہونے سے ایک ہی برس بعد ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلی تھی اور اُس سے پہلے جس قدر چندہ ہوا وہ زیادہ تر علیگڑھ، لاہور، پٹنہ، مرزا پور اور پٹیالہ وغیرہ سے ہوا۔ بنارس میں جہاں وہ خود سرکاری عہدہ دار تھے انھوں نے اپنے چند ہندو یا مسلمان دوستوں کے سوا کسی سے چندہ مانگنا پسند نہیں کیا۔ اس کے سوا ہندوستانی اور خاصکر مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے محض ناواقف تھے۔ جب تک کسی حاکم کا دباؤ یا اشارہ ہوتا تھا چندہ جمع ہونا نہایت مشکل تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ولایت جانے سے پہلے ایک روز نواب امّو جان مرحوم سے جو اُن کے قریب رشتہ دار تھے برسبیل تذکرہ یہ کہا کہ کیوں حضرت آپ کے نزدیک مسلمانوں کی تعلیم کے لیے دس لاکھ

روپیہ جمع ہوسکتا ہے یا نہیں۔ انھوں نے نہایت تعجب سے کہا "تم کیا دیوانوں کسی باتیں کرتے ہو! مسلمانوں سے دس لاکھ پیسے بھی وصول نہیں ہو سکتے " اس حکایت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس وقت چندہ جمع کرنے کی نسبت لوگوں کے کیسے خیالات تھے۔ باوجود اس کے یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ ایک شخص کی تحریک یا کوشش سے بیس برس کے عرصہ میں سات آٹھ لاکھ کی عمارت تیار ہوگئی اور مدرسہ کی آمدنی اس حد تک پہنچ گئی کہ اسّی ہزار روپیہ سالانہ تک اُس میں خرچ ہونے لگا۔ ایک ایرانی سیاح نے مدرسہ کو دیکھ کر خود ہمارے سامنے یہ الفاظ کہے " واللہ معجزہ مینماید کار یکہ از سلطنت برنیاید چگونہ از یک فرو رعیت سرانجام شد "۔ مگر ہم سرسید کی اس کامیابی کو معجزہ نہیں سمجھتے بلکہ کامیابی کے اسباب پر نظر کرتے ہیں جن پر بغور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دانشمند اور راست باز آدمی استقلال اور ہمت سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آسکتا ہے۔

سرسید نے مدرسہ کے کام کو جس لیاقت اور باقاعدگی کے ساتھ شروع کیا، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سمجھ دار اور روشن خیال مسلمان اس کی طرف گرویدہ ہو گئے اور سلطنت کے بڑے بڑے جلیل القدر رکن اُس کی جانب التفات ظاہر کرنے لگے اور اُس کے معاون بن گئے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اُس کا اثر ذی مقدور لوگوں پر پڑنے لگا۔ اگرچہ مخالفتیں چلتی گاڑی میں برابر روڑا اٹکاتی رہیں مگر کام کی عظمت، اُس کی تائید کرنے والوں کا اعتبار اور اُن کی وجاہت اور خود سرسید کا استقلال آہستہ آہستہ ہر ایک مخالفت کا مقابلہ کرتا رہا۔ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی سقیم حالت اور انگریزی تعلیم کی ضرورت اُن پر ظاہر کرنی شروع کی اور مذہبی توہمات جو تبدیلِ حالت کے

سدِّ راہ تھے شدہ شدہ دور ہونے لگے، سرسید کی طرف سے اس بات کا اطمینان کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے وہ اسی کام میں صرف ہوگا، سب سے زیادہ فراہمی چندہ کا باعث ہوا۔

سرسید کی سب سے بڑی تدبیر جس نے کالج کی عظمت کا نقش خاص و عام کے دل پر بٹھا دیا اور جس سے کالج کو بے انتہا مدد پہنچی وہ یہ تھی کہ کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتیں تابمقدور اعلیٰ درجہ کے اسکیل پر بنانی تجویز کیں اور عمارات کے بنانے میں نہایت جرأت اور دلیری سے کام لیا۔ اگر روپیہ میں کمی ہوئی تو قرض لے لیکر عمارتوں کو پورا کیا۔ اس تدبیر سے ایک طرف تو کالج کی بڑائی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کو قومیت کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگے۔ حکام کے دل میں کالج کی وقعت زیادہ ہونے لگی اور ہر شخص کو اس میں چندہ دینے کی ترغیب ہوئی اور دوسری طرف کرایہ کی آمدنی روز بروز بڑھنی شروع ہوئی جو رفتہ رفتہ ۲۴ برس کے عرصہ میں تقریباً دس ہزار سالانہ تک پہنچ گئی۔ مگر بڑی بڑی عمارتوں کا بنوانا خود روپیہ کا محتاج تھا سوائس کے لیے سرسید نے یہ تدبیر نکالی کہ کالج کی ہر ایک عمارت کا تخمینہ کر کے اس کو متعدد حصوں میں تقسیم کر دیا اور اشتہار دے دیا کہ فی حصہ اس قدر روپیہ ہوتا ہے، جو شخص اتنا روپیہ دے گا اس کا نام عمارت پر کندہ کیا جائے گا۔ مثلاً کالج کے بڑے احاطہ کی سنگین جالیوں کے لیے فی جالی بیس روپیہ قرار دیے اور اس طرح احاطہ کا ایک بڑا حصہ تیار ہوگیا، یا بورڈنگ ہوس کی پختہ بارک کے لیے فی کمرہ پندرہ سو روپیہ مقرر کیا اور اس طرح ایک تعداد کثیر پختہ کمروں کی رفتہ رفتہ تیار ہوگئی احاطہ کے تین دروازے مقرر کیے اور جو شخص ایک دروازہ

بنوادے اُسی کے نام سے اُس دروازہ کو نامزد کرنا تجویز ہوا۔ اسٹریچی ہال کی لاگت کے بہت سے حصے کر کے فی حصہ پانسو روپیہ مقرر کیا اور جتنے آدمیوں نے پان پانسو روپیہ دیئے ان سب کے نام اُس میں ہنگ مرمر پر کندہ کرادیئے۔ اس کے سوا بہت سی عالیشان عمارتیں کالج کے بڑے بڑے محسنوں کی یادگاریں بنانی تجویز کیں جن میں ان کے دوستوں اور ہوا خواہوں نے بطیب خاطر چندہ دینا قبول کیا۔ طالبعلموں کے رہنے کے لیے بہت سے مکان قرض لے کر بنوائے اور اُن کے کرایہ کی آمدنی میں سے کسی قدر سود میں لگا دیا اور جب کہیں سے کچھ روپیہ بہم پہنچا فوراً قرضہ ادا کر کے اُن کی کل آمدنی مدرسہ کے تحت میں لے لی۔

صیغہ تعمیرات کے سوا کالج کے اور اخراجات کے لیے سرسید نے نئے نئے طریقوں سے روپیہ وصول کیا جس کو سن کر لوگ تعجب کریں گے ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری ڈالی۔ ہرچند مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید نے کچھ پروانہ کی اور بعد تقسیم انعامات کے بیس ہزار کے قریب کالج کو بچ رہا۔ **لطیفہ**۔ جن دنوں میں لاٹری کی تجویز درپیش تھی دو رئیس سرسید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی۔ سرسید نے کہا جہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی۔ سرسید کے ایک دوست وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا "لاٹری کا گناہ درحقیقت رئیسوں اور دولتمندوں پر ہوگا۔ اگر وہ مدرسہ کی مدد کرتے تو کیوں لاٹری کی ضرورت ہوتی"۔

لاٹری کے سوا اُنھوں نے اور بے شمار تدبیروں سے روپیہ جمع کیا۔

اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کر کے روپیہ پیدا کیا۔ اپنی تصویر کی کاپیاں بیچیں اور جو کچھ ملا کالج کو دیدیا جب خلیفہ سید محمد خاں مرحوم وزیر ریاست پٹیالہ کے پوتا پیدا ہوا اور انھیں دنوں میں سرسید کا پٹیالہ جانا ہوا تو وزیر صاحب سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ روپیے طلب کیے جس پر انھوں نے ایک معقول رقم ان کی نذر کی۔ اُن کے ایک دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علیگڑھ آئے آپ سیادت کے دعوے سے اُن کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے پہنچے اور وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپیے لے کر آئے۔

چندہ وصول کرنے کے موقع پر انھوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں، کس سے مانگتا ہوں؛ اور کس طرح مانگتا ہوں؛ نمائش گاہ علیگڑھ میں انھوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لیے دوکان پر بیٹھے۔ نیشنل والنٹیرن کر گلے میں جھولی ڈالی۔ پنی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔

پنی ریڈنگ کا جلسہ اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ غریب طالب علموں کے وظیفوں کے لیے کچھ سرمایہ جمع کیا جائے۔ جب اس جلسہ کی تجویز ٹھیری تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجیے گا۔ لوگ مطعون کریں گے اور تماشے والا کہیں گے، اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔ سرسید نے کہا " اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں "۔ جس وقت وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے ایک مؤثر تقریر کی جس کے چند فقرے یہاں لکھے جاتے ہیں:

"کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا ؛ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں۔ وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں اُن کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اُس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے اپنے گھر میں کھُلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی و بے حیائی بھی شرما جائے۔ لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرت کا کام سمجھے۔"

"اے رئیسو اور اے دولتمندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بُری حالت ہو اور ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب انھیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سر انجام نہ ہونے سے ذلیل اور رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے۔ مگر افسوس ؛ کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی۔ والنیٹر بنانے چاہے، اگر بہت کم بنے اور جو بنے اُن سے کچھ بن نہ آئی۔ پس میں اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم

کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔" اس کے بعد سرسید نے کچھ اور تقریر کی اور آخر کو خواجہ حافظ کی یہ غزل بہ اضافہ دو اشعار حسب حال جلسہ میں پڑھی

ساقیا برخیز و در دہ جام را — خاک بر سر کن غمِ ایام را
ساغرِ مے بر کفم نہ تا ز بر — برکشم ایں دلقِ ازرق فام را
گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں — ما نمی خواہیم ننگ و نام را
بادہ در دہ چند ازیں بادِ غرور — خاک بر سر نفسِ نافرجام را
دودِ آہِ سینۂ نالانِ من — سوخت ایں افسردگانِ خام را
محرمِ رازِ دلِ شیدائے خود — کس نمی بینم ز خاص و عام را
با دل آرامے مرا خاطر خوش ست — کز دلم یکبارہ بُرد آرام را
ننگرد دیگر بسرو اندر چمن — ہر کہ دید آں سروِ سیم اندام را
کیست آں سرو سہی کاندر سرش — باختم دین و دل و آرام را
قومِ ما! اے قومِ ما کز مہرِ تو — دادہ ام بر باد ننگ و نام را
صبر کن احمد بہ سختی روز و شب — عاقبت روزے بیابی کام را

غرض کہ سرسید نے مدرسہ کی خاطر ہر بات کو اپنے نفس پہ گوارا کر لیا تھا۔

۱۸۷۳ء میں جب پہلی بار انھوں نے لاہور میں لکچر دیا، جہاں لاہور کے تمام جلیل القدر عہدہ دار اور حاکم اور شہر کے ہندو اور مسلمان رئیس اور ادنٰی اور اعلٰے تقریباً دس بارہ ہزار آدمی جمع تھے، تو مذہبی مخالفتوں کا ذکر کر کے انھوں نے کہا کہ "فرض کرو کہ میں ایک بدعقیدہ ہوں، مگر اے بزرگانِ پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے؟ آپ کے لیے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش

پاتے ہیں، یا آپ کے لیے مسجد بناتے ہیں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں۔ چوڑھے، چمار، قلی کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اُس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھ کو بھی اِس مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اُس کا بنانے والا یا اُس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے۔ اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔"

مدرسہ کے لیے قلیل سے قلیل چندہ کو بھی ویسی ہی خوشی اور کشادہ پیشانی سے قبول کرتے تھے جیسے بڑی بڑی رقموں کو لیتے تھے۔ لوگ دو دو آنے اور چار چار آنے دیتے تھے اور وہ چوم چاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ ایک صاحب نے ناچ کی محفل میں اہل محفل سے چندہ جمع کیا۔ یہاں تک کہ طوائف اور سازندوں نے بھی مدرسہ کی حقیقت سن کر خوشی سے چندہ دیا اور اس طرح سو سوا روپیہ جمع ہو گیا۔ انھوں نے سید کو اطلاع کی کہ ایسا اور ایسا روپیہ ہے اگر کہیے تو بھیج دیا جائے۔ سر سید نے کچھ پس و پیش نہیں کی اور فوراً روپیہ منگوا لیا۔

مدرسہ کے لیے انھوں نے بڑے بڑے لمبے سفر کیے، پٹنہ، گورکھپور، الہ آباد، مرزا پور، لاہور، امرتسر، پٹیالہ، حیدرآباد، نیل گری، بھوپال، جبل پور اور دیگر مقامات میں صرف مدرسہ کی دُھن میں گئے۔ لاہور اور حیدرآباد متعدد دفعہ اسی غرض سے جانا ہوا۔ ہزار ہا روپیہ ان سفروں میں اُن کا صرف ہوا۔ اگرچہ اُن کے دوست اور رفیق بھی جو اُن کے ہمراہ جاتے تھے اپنا اپنا

خرچ اپنی گرہ سے اٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر بدلتے رہتے تھے اور سرسید کا ہر سفر میں ہونا ضروری تھا۔ اس کے سوا ہمیشہ رزرو ڈ گاڑیوں میں سفر ہوتا تھا اور جس قدر سواریاں کم ہوتی تھیں اُن کی کمی زیادہ تر سید کو پوری کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار اُن کے ایک دوست نے ان سے کہا کہ آپ راجپوتانہ کا بھی ایک بار دورہ کیجیے۔ سرسید نے کہا روپیہ نہیں ہے۔ ان کے منہ سے نکلا کہ جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپ کا سفر خرچ کمیٹی کو دینا چاہیے۔ سرسید نے کہا میں اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کے لیے سفر کر سکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔

ایک اور طریقہ انھیں سفروں میں چندہ جمع کرنے کا انھوں نے یہ نکالا تھا کہ جو احباب دعوت کرنی چاہتے تھے اُن سے نقد روپیہ لے لیتے اور کالج کے چندہ میں جمع کر دیتے تھے۔ جب وہ دوسری بار پنجاب کو جانے لگے تو انھوں نے خان بہادر برکت علی خاں کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا اور احباب میری مہمانداری میں صرف کرنا چاہیں از راہِ عنایت اس کی لاگت نقد عنایت فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اسی طرح دعوت کے بدلے نقد روپیہ لیا ہے اور اُس کو کالج کے چندہ میں جمع کر دیا ہے۔ اِس میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک دوست نے مجھے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا۔ میں نہایت خوش ہوا کہ مدرستہ العلوم کے کسی مزدور دن کی مزدوری ملی وہ دوست بھی خوش ہوئے کہ دعوت ٹھکانے لگی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ

چند دوست بھی ہوں گے پس اگر یہ طریقہ دعوت کا اختیار نہ کیا جائے گا تو جن کے ہاں ٹھیروں گا اُن پر خرچ کثیر پڑ جائے گا اور وہی مثل ہوگی گدھے کا کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پُن۔"

حیدرآباد کے پہلے سفر میں جو ۱۸۸۲ء میں سرسید نے کیا تھا جس قدر روپیہ دعوت میں آیا وہ سب انھوں نے چندہ میں جمع کر دیا تھا جب وہاں سے واپس آئے تو علیگڑھ میں اُن کے احباب نے فی کس بیس روپیہ کے حساب سے دو سو بیس روپیہ اس لیے جمع کیے کہ سرسید کو شکر گزاری کے طور پر دعوت دی جائے۔ سرسید نے کہا اس کا انتظام میں خود کر دوں گا۔ وہ سب روپیہ ان سے لے کر اور بیس روپیہ اپنے حصہ کے اس میں ملا کر دو سو چالیس روپیہ کی دو اسکالرشپیں دس دس روپیہ ماہوار کی غریب طالب علموں کے لیے مقرر کر دیں۔ اُن کے دوستوں نے کہا کہ آپ نے اپنے ساتھ ہم کو بھی دعوت سے محروم رکھا اب ہم آپ سے دعوت لیں گے۔ اس پر مولوی محمد کریم مرحوم نے کہا کہ سیّد صاحب کی طرف سے میں سب صاحبوں کو دعوت دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے بڑی دھوم سے سب کی دعوت کی۔

سیّد محمود کی شادی میں نواب انتصار جنگ نے سو روپئے بطور اظہار مسرت کے اس غرض سے بھیجے تھے کہ کالج میں صرف کیے جائیں۔ اس پر سرسید نے نہایت خوشی ظاہر کی اور اخبار میں لکھا کہ "ہمارے بعض دوست نیوتانہ لینے سے ناراض ہوئے مگر ہم نیوتا لینے کو موجود تھے اگر اُس کا روپیہ اسی طرح مدرستہ العلوم میں خرچ کرنے کو دیا جاتا۔" پھر لکھا کہ بعض دوستوں نے شکایت کی ہے کہ شادی میں دعوت ولیمہ

نہیں کی، مگر ہم نہ جاگیردار ہیں نہ رئیس ہیں، اگر دعوت ولیمہ کرتے تو زیادہ سے زیادہ پانسو روپیہ لگا سکتے تھے، سو ہم نے پانسو روپیہ مدرسہ میں دیدیا۔"

پوتے کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی جو ۹۳ء کی کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد سب ممبروں کی موجودگی میں ہوئی تھی سرسید نے ایک نہایت عمدہ تقریر کے بعد اسی طرح پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیے تھے۔

حیدرآباد کے اخیر سفر میں جب کہ وہ ایک ڈپوٹیشن لیکر حضور نظام میں ایڈریس پیش کرنے کو گئے تھے، چونکہ تمام ڈپوٹیشن سرکار عالی کا مہمان تھا، سرسید کے دوستوں نے جو کچھ اُن کی دعوت میں دیا وہ سب مدرسہ کے چندہ میں جمع کیا گیا۔ نواب انتصار جنگ نے تو غالباً ہزار روپئے نقد دیدیے تھے مگر نواب محسن الملک نے بڑی دھوم کی ایک گارڈن پارٹی دینی چاہی تھی۔ سرسید نے انکار کیا اور کہا کہ نقد دلواؤ۔ محسن الملک نے کہا نقد بھی لیجیے اور پارٹی بھی ہونے دیجیے۔ سرسید نے ہرگز نہ مانا اور کہا کہ نقد اور پارٹی دونوں میں جس قدر خرچ ہو وہ سب نقد ہی دیدو۔ آخر پارٹی موقوف رہی اور ایک ہزار روپیہ نقد نواب محسن الملک نے سرسید کی نذر کیا۔

ابتدائے قیام مدرسہ کے وقت جس طریقہ سے سرسید نے نواب مختار الملک مرحوم کی مدرسۃ العلوم کی طرف متوجہ کیا وہ یادگار کے قابل ہے انہوں نے مصور سے ایک تصویر بنوائی جس میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے تنزل کی کیفیت محض تصویر کے ذریعے سے ظاہر کی گئی تھی اس کی صورت یہ تھی کہ سرسید سمندر کے کنارے ایک درخت سے کمر لگائے حیران اور فکرمند کھڑے ہیں اور اس سے کسی قدر فاصلہ پہ مختار الملک مع دو مصاحبوں کے استادہ ہیں۔ سمندر میں طوفان آرہا ہے، جہاز جس میں بہت سے مسافر

سوار ہیں اس کا مستول ٹوٹ گیا ہے اور وہ ڈوبا چاہتا ہے. کچھ آدمی پانی میں گر پڑے ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں. ایک کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں ان ڈوبتوں کے بچانے کی جہاز کی طرف جا رہی ہے. اس کی جھنڈی کے پھریرے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہیں "ون لک روپیز" سر سید اس حیرت اور تشویش کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ "ناٹ سفیشنٹ" یعنی یہ روپیہ کافی نہیں ہے۔ ایک فرشتہ آسمان سے اترا ہے جو ہوا میں معلق ہے اور ایک ہاتھ سے سر سید کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سر سید سے کہتا ہے "لک ایٹ دس نوبل مین" یعنی اس شریف آدمی کی طرف دیکھو۔

اس تصویر میں سمندر سے زمانہ مراد ہے اور جہاز سے مسلمانوں کی قوم. کشتی جو جہاز والوں کی دستگیری کے لیے جا رہی ہے اس سے مدرسۃ العلوم مراد ہے، اس کے پھریرے پر جو "ایک لاکھ روپیہ" کا لفظ لکھا ہے اس سے وہ لاکھ روپیہ مراد ہے جو اس وقت تک مدرسہ کے لیے جمع ہوا تھا۔ سر سید گویا مسلمانوں کی سقیم حالت دیکھ کر اپنے دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ابھارنے کے لیے ایک لاکھ روپیہ کافی نہیں ہے. اس وقت خدا کی طرف سے ان کے دل میں یہ القا ہوتا ہے کہ نواب مختار الملک سے مدد مانگنی چاہیے. فرشتہ کا ان کی طرف اشارہ کرنا اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔

یہ تصویر نواب مختار الملک سید تراب علی خاں مرحوم کی خدمت میں بھیجی گئی اور وہ اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے. سنا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر روپیہ مانگنے کی ہیرے

دل پر موثر نہیں ہوسکتی تھی۔ اُنھوں نے سو روپیہ ماہوار اپنی خاص جاگیر سے اور اول تین سو اور پھر پانسو ماہوار سرکار عالی نظام سے مقرر کیے۔ اُس کے بعد جب حضور نظام نے عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو پانسو روپیہ ماہوار کا دو دفعہ کر کے اور اضافہ ہوا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں جب سرسید ڈپوٹیشن لیکر حیدرآباد گئے تو حضور نظام نے بجائے ایک ہزار کے دفعۃً دو ہزار روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مقرر کیا اور اُس کی سند سرسید کو عنایت فرمائی۔ درحقیقت یہ اُسی تصویر کا نتیجہ تھا جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ گیا۔

غرض کہ اس قسم کی بیشمار تدبیروں سے سرسید نے مدرسہ کے لیے سرمایہ جمع کیا ہے۔ ولایت سے واپس آکر وہ اٹھائیس برس زندہ رہے۔ اِس عرصہ میں برابر اُن کو یہی ادھیڑ بُن لگی رہی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہو اور کیونکر مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرستہ العلوم میں مہیا کیا جائے۔ اُن کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا اُنھوں نے چند اصول گویا اپنے اوپر لازم کر لیے تھے۔ اولاً اُنھوں نے ہر قسم کی داد و دہش سے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مدرستہ العلوم کے سوا رفاہِ عام کے اور کاموں میں چندہ دینا شادی اور غمی کی رسموں میں روپیہ صرف کرنا، اپنے کنبے کے حقداروں کے سوا عموماً مساکین و غربا کی امداد کرنا اور اسی قسم کے تمام ابواب یک قلم بند کر دیے اور جہاں تک ہو سکا مدرسہ کے چندوں میں آپ بھی دیا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی لیا اور اپنے دل میں ٹھان لی کہ جو لوگ مدرسہ کی اعانت کریں وہی دوست ہیں اور وہی عزیز و رشتہ دار ہیں۔ اگر غیروں نے اعانت کی تو اُن کو دوست اور عزیز سمجھا اور اگر دوستوں

اور عزیزوں نے پہلو تہی کی تو اُن کو سو غیروں کا غیر جانا۔ انھوں نے ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گاڑھے دوست کو جو ذی مقدور آدمی تھے مگر مدرسہ کے کچھ سرگرم معاون نہ تھے صاف یہ کہلا بھیجا کہ بغیر مدرسہ کی اعانت کے دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

دوسرے جب سے اُنھوں نے مدرسہ کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا مرُوّت اور لحاظ کو جو اُن کی ایک جبلی خصلت تھی بالکل بالائے طاق رکھ دیا جن سے بے تکلفی اور خالص دوستی تھی اکثر اُن کا نام اور اُن کی رقم چندہ کی فہرست میں بغیر اُن کے استمزاج کے لکھ دی جاتی تھی اور اُن کو صرف اُس وقت خبر ہوتی تھی جب اُن سے روپیہ مانگا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ انکار کرتے تھے اور ادھر سے سخت اصرار بلکہ ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا اور آخر کار بغیر دیئے کچھ بن نہ آتا تھا۔ سرسید کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ وہ ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ "ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس لکھے کی بدلا پاتا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ اس پر سعدی کا ایک شعر یاد آیا اور دل نے چاہا کہ اس میں کچھ مصرعے لگ جائیں تاکہ حسب حال ہو جائے، سو ایک خدا کے بندہ نے مصرعے لگا دیے اور اب اُس شعر کی یہ صورت ہو گئی۔

پیش ازیں سعدیِ رند سخن دل آزادش

گفت درباب گدایاں سخن از صدق ویقین

"گرگدا پیشیر وِشکرِ اسلام بود — کافر از بیم توقع بیرود تا درچیں"

لیک در نوبتِ ما کار بجائے برسید — کہ بہ کافر چہ رسد خود تبوان گفت چنیں

گرگدا پیشیر وِشکرِ اسلام بود — ہم مسلمان رود از بیم سوالش تا چیں

ایک بار مدرسہ کے کسی کام کے لیے چندہ کھولا گیا، سر سید نے اپنے قدیم دوست مولوی سید زین العابدین خاں سے چندہ کا تقاضا کیا۔ انھوں نے بدمزہ ہو کر کہا "صاحب ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے"، سر سید نے کہا "ارے میاں اب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے، پھر کون تم سے چندہ مانگے گا" یہ الفاظ کچھ ایسے طور پر کہے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً ادا کیا گیا۔

چندہ کے علاوہ جب کبھی اُن کو دوستوں سے کچھ اُچک لینے کا موقع ملا انھوں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "خانۂ دوستاں بروب و درِ دشمناں مکوب" ایک روز مسٹر تھیوڈر بک کے والد جو سیاحت کے لیے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے ایک خاص سکہ کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اُس کے لینے سے انکار کرتے تھے۔ آخر دونوں صاحب سر سید کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔ سر سید نے نہایت بدمزہ ہو کر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بداخلاقی کی بات ہے۔ انھوں نے وہ اشرفی لے لی سر سید نے کہا دیکھوں کس سکہ کی اشرفی ہے اور ان سے لیکر مدرسہ کے کھاتہ میں جمع کر دی۔ اسی طرح ایک دن سید محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط بدی اور یہ ٹھیرا کہ جو ہارے پچاس روپے مدرسہ میں دے۔ اتفاق سے سید محمود ہار گئے، وہ سو روپیہ کا نوٹ لے کر آئے اور قاضی صاحب سے کہا کہ پچاس روپیہ دیجیے اور

نوٹ لیجیے۔ انھوں نے کہا وہ تو ہنسی کی بات تھی، کیسی شرط اور کیسا روپیہ! دوسرے شرط بد ناجائز بھی نہیں ہے۔ سرسید بھی وہیں موجود تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ روپیہ مدرسہ میں آتا ہے فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ جائز ہے اور فوراً بکس میں سے پچاس روپے نکال کر سید محمود کو دیدیے اور نوٹ لے لیا۔

اس قسم کے صدہا واقعات روز مرہ گذرتے تھے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ جس قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہ ہو، جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو۔ جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولتمند مسرف یا بخیل، علما زمانے کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مفلس ہوں وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی منظور ہو کوئی شخص نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ سرسید کی طرح اپنے تئیں اس کام میں فنا نہ کر دے اور جو فائدے کہ وہ اپنی عقلمندی، شہرت، لیاقت، وجاہت، دوستی، کوشش اور محنت سے خود اٹھا سکتا ہے ان سے آپ دست بردار ہو کر اس کام پر وقف نہ کر دے۔

دوستوں کے علاوہ اجنبی اور انجان آدمی جن سے کچھ وصول ہونے کی امید ہوتی تھی، شاید پہلی ایک آدھ ملاقات میں ان کی باری نہ آتی ہو ورنہ اکثر صاحب سلامت ہوتے ہی سوال ڈالا جاتا تھا اور اس میں کچھ مسلمان ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ انگریزوں سے بھی بعض اوقات یہی برتاؤ ہوتا تھا۔ ایک بار سرسید نے ایک محض اجنبی مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلہ میں ٹھیرا تھا چندہ طلب کیا۔ اس نے بہت روکھے پن سے یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لیے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔ سرسید نے کہا " بیشک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے۔ اگر یہ انسٹی ٹیوشن

بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہوگیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ وہ باوجودیکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوئے۔ وہ انگریز یہ سنکر شرمندہ ہوا اور اسی وقت ایک نوٹ بیس روپے کا سرسید کی نذر کیا۔

سرسید نے مدرسہ کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ کوئی سعی اور کوئی کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرستہ العلوم سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔ جو کوشش بظاہر وہ خاص اپنی ذاتی اغراض کے لیے کرتے تھے اُن سے بھی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو خود اُن کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچتا تھا جس قدر کہ مدرستہ العلوم کو پہنچتا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی اپنے پرائے کی سفارش کسی سے نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی ملاقات یا دوستی یا وجاہت سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ مدرستہ العلوم کے سوا کسی کو پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنے ایک جلیس سے کہا کہ "تو اوروں کے فائدے کے لیے سفارش مت کیا کر کیونکہ اس سے تیرے فائدوں میں کمی پڑے گی"۔ اگرچہ یہ نصیحت جن معنوں میں کی گئی تھی اُس کو کوئی کریم النفس آدمی قبول نہیں کر سکتا، مگر جن معنوں میں سرسید نے اس پر عمل کیا وہ ایک جوانمردانہ خصلت تھی جو سرسید کے سوا کسی میں نہیں دیکھی گئی۔ وہ محض قوم کی خاطر دوستوں اور عزیزوں کا بُرا ماننا گوارا کرتے تھے اور جو خوشی لوگوں کی سفارش اور حاجت روائی کرنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ سرسید کے ایک معزز ہموطن نے ایک رفاہ عام کے کام میں اُن کو شریک کرنا اور اپنی کمیٹی کا ممبر کرنا چاہا۔ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں صلاح و مشورہ سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چندہ

نہ خود دوں گا اور نہ اوروں سے دلوانے میں کوشش کروں گا اگر اس شرط پر ممبر بنانا ہو تو مجکو ممبری سے کچھ انکار نہیں۔ لطیفہ ایک شخص نے جس سے کچھ واقفیت نہ تھی سرسید سے سفارش کی درخواست کی اور لکھا کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ بے انتہا تعریف کرتے ہیں کہ اُن کی تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں گذری ہے جب میری آنکھ کھلی تو مجکو یقین ہو گیا کہ ہوں نہ ہوں وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہوگی" سرسید نے اس کا یہ جواب لکھ بھیجا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس سے مجکو کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے وہ غالباً شیطان تھا۔"

# عمارات کالج

ہم چاہتے تھے کہ کالج کی عمارات کا حال اور اُن کی تفصیل مفصل طور پر بیان کی جائے کیونکہ ان تمام عمارتوں کا اس قدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کر دینا اور ایک ویران قطعۂ زمین کو چند سال میں محض قومی چندہ سے گلزار بنا دینا اور سیکڑوں پردیسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا یہ بھی سرسید کی زندگی کے اُنھیں بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے جن کا ذکر اُن کی لائف میں کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے کہ نواب محسن الملک کا ارادہ کالج کی مفصل تاریخ لکھنے کا ہے اور امید ہے کہ اُس میں عمارات کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا جائے گا۔ اس لیے ہم اس موقع پر تمام کالج اور بورڈنگ کی عمارتوں کا مفصل حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے مگر جو اصول کہ

سرسید نے ان عمارتوں کے بنانے میں ملحوظ رکھے ہیں اور جس کوشش اور توجہ سے انھوں نے یہ دشوار کام آسان کیا ہے اور جن مصالح سے وہ برخلاف اکثر ممبران کمیٹی کی رائے کے تعمیر کے کام کو سب کاموں سے مقدم سمجھتے رہے اُن کو کسی قدر بیان کرنا ضروری ہے۔

کالج کمیٹی کے سرگرم ممبر جو کالج کے کاروبار سے زیادہ دلبستگی رکھتے تھے اُن میں بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو کالج بلڈنگ میں زیادہ روپیہ صرف کرنے کے روادار ہوں، کیونکہ ابتدا میں تعلیم ہی کے اخراجات کے لیے کافی روپیہ بہم پہنچانا دشوار معلوم ہوتا تھا چہ جائیکہ لاکھوں روپیہ کی عمارتیں تب اسکرائی جائیں۔ مگر سرسید نے کالج کی ترقی بلکہ اُس کا قیام و دوام اسی پر منحصر سمجھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ درجہ کی اسکیل پہ عمارتیں بنائی جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ کالج کے اصلی نتائج علی الاعلان ظاہر ہونے کے لیے جس سے عام لوگوں کو اس کی طرف ترغیب ہو ایک مدت دراز درکار ہے اور تعلیم و تربیت کی خوبی کے سمجھنے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں میں ہمیشہ معدود آدمی ہوتے ہیں۔ البتہ عمارات کی شان و شوکت ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر فوراً خاص و عام کے دل پر پڑتا ہے۔ سرسید کا یہ خیال جہاں تک دیکھا جاتا ہے بالکل صحیح نکلا۔ فی الواقع کالج کی عظمت کا خیال باوجود سخت مخالفتوں کے جس قدر سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیل گیا یہ زیادہ تر اُس کی شاندار عمارتوں کا نتیجہ تھا۔ خصوصاً گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں جن کی توجہ اور التفات سے کالج کو نہایت فائدہ پہنچا ہے اُس کی وقعت بہت کچھ اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں جب کہ ایجوکیشن کمیشن نے علیگڑھ میں اپنا اجلاس کیا تھا اس وقت علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں مسٹر وارڈ

نے جو کمیشن کی لوکل کمیٹی کے ممبر تھے علیگڑھ کے ہندوؤں کے ایڈریس کے
جواب میں بورڈنگ ہاؤس محمدن کالج کی پختہ بارگ کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ
"جس وقت میں نے کمروں کی قطار کو دیکھا جو بعد مکمل ہونے کے تمام دنیا میں
شاید اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارت ہوگی تو مجکو اس بات کا خیال ہوا کہ کوئی
شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر آیندہ کی نسبت
نئی ہمت پیدا نہ ہو" میرے ایک عزیز دوست جو ولایت میں تعلیم پاکر آئے
ہیں اُن کا بیان ہے کہ "انگلستان کے نامور سیاح ریورنڈ کپتان بارنٹ جب
چین، جاپان اور امریکہ کی سیاحت کے بعد لندن میں آئے تو انھوں نے مجھ
سے کہا کہ میں نے کہیں کیمبرج یا آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونہ کا کالج سوائے
محمدن کالج کے نہیں دیکھا"

سرسید کو کالج کی زیادہ شاندار عمارتیں بنانے کا خیال اس نظر سے بھی ضرور
ہونا چاہیے تھا کہ آیندہ نسلوں کو اپنے قومی انسٹی ٹیوشن کا عظیم و شان دیکھ کر
اس کے قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ ایشیائی قوموں میں برخلاف اہل یورپ
کے یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اگلوں نے جو کام ادنی درجہ کی حالت میں چھوڑا
ہے اُس کو اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں یا جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں اُن کو پورا
کردیں۔ ہم ایسے بہت سے مدرسے اور خانقاہیں نشان دے سکتے ہیں جن کے
بانی اُن کو ناتمام چھوڑ کر مر گئے اور وہ چند روز میں کھنڈر ہوگئیں۔ لیکن اکثر
اوقات عمارت کا عظیم و شان ان ملکوں میں بھی لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیتا
ہے کہ اُس کو جس طرح ہوسکے قائم اور آباد رکھیں۔ ہم کو اسٹریچی ہال کی نسبت
جبکہ وہ بالکل مرتب اور تیار ہوچکا تھا ایک معزز مسلمان کا یہ کہنا یاد رہے گا کہ
"جب تک یہ عمارت قائم ہے مسلمان یہ دعوی کرسکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے

بھی ایسے کام کر گذرتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے۔ بہر کیف اس انسٹیٹیوشن کے قائم و برقرار رہنے کی اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو انھیں عمارتوں کی بدولت ہو سکتی ہے جن کی نسبت کمیٹی نے گورنمنٹ سے یہ اقرار کر لیا ہے کہ اگر خدا نخواستہ کالج بند ہو جائے تو تمام عمارتیں گورنمنٹ کے قبضہ میں چلی جائیں۔

سرسید نے ان عمارتوں میں آیندہ نسلوں کے فخر و مباہات کے لیے ایک نہایت مؤثر طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ تمام سنگین اور پختہ عمارتوں پر اُن کے بانیوں کے اور کالج کے محسنوں، مربیوں اور مددگاروں کے نام جن میں زیادہ تر مسلمان ہیں بڑے اہتمام سے کندہ کرائے ہیں۔ ان میں بہت سی عمارتیں بن چکی ہیں، کچھ زیر تعمیر ہیں، کچھ ناتمام پڑی ہیں اور بہت سی قوم کی فیاضی کی منتظر ہیں۔ اگر قوم میں کچھ جان باقی ہے تو وہ ضرور ان معزز ناموں اور معزز کتبوں کی لاج رکھے گی اور اس قومی یادگار کو صفحۂ روزگار سے مٹنے نہ دے گی۔ سنا ہے کہ کالج کے احاطہ کی جالیوں پر مسلمانوں کے نام کھدے ہوئے دیکھ کر ایک یوروپین افسر نے کہا تھا کہ "یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے"

کتبوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی باتیں ان عمارتوں میں ملحوظ رکھی گئی ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں کالج کی طرف ایک کشش پیدا ہو مثلاً اکثر محرابیں سیرسنک اسٹائل پر بنوائی گئی ہیں یا بورڈنگ ہوس کے صدر دروازہ کی پیشانی پر کھجور کا درخت جو عرب کی خصوصیات میں سے ہے اور ہلال و تاج کا نشان جو مسلمانوں کا برٹش حکومت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہے۔ منبت کرایا گیا ہے۔ اکثر انگریزوں کی اسپیچیں جن میں مسلمانوں کو غیرت اور

ان کے اسلاف کی عظمت یاد دلائی گئی ہے جابجا پتھروں پر کندہ کرادی ہیں۔ جن یوروپین افسروں اور حاکموں نے کالج کی مدد کی ہے اُن کی عالیشان یادگاریں بنوائی گئی ہیں تاکہ مسلمانوں کو آیندہ زمانے میں اس بات پر فخر کرنے کا موقع ملے کہ اُن کے اسلاف اپنے محسنوں کے کیسے شکر گزار اور دل سے قدر کرنے والے تھے۔

بعض ممبروں کی یہ رائے تھی کہ تعمیر کے لیے ہماری باسالانہ ایک رقم معین ہونی چاہیے کہ اُس سے زیادہ کبھی صرف نہ ہونے پائے۔ بیشک یہ ایک نہایت سلامت روی کی چال تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو سرسید نے جو ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے یہ ہرگز ظہور میں نہ آتا اور کالج کی وقعت جو دفعۃً تمام زمانے کے دل میں پیدا ہوگئی اُس کے لیے ایک مدتِ دراز تک انتظار کرنا پڑتا اور سرسید کے بعد کسی سے یہ امید نہ تھی کہ تعمیر کا کام ایسے چاؤ اور امنگ سے سرانجام کرتا جیسے کوئی اپنا محل تیار کراتا ہے۔ حالانکہ سرسید کا سب زیادہ دلچسپ مشغلہ ہمیشہ تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کا کام رہا ہے اور ایسے لوگوں کا کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا نادرات سے ہے باوجود اس کے انھوں نے اس قطعۂ زمین کے آباد و سرسبز کرنے میں فوق العادۃ کوشش اور توجہ کی ہے۔ برسوں بلاناغہ دو دو پہر اور تمام تمام دن سخت سے سخت موسموں میں وہ خود مدرسہ پر جاجا کر بیٹھے ہیں اور اپنے سامنے راج مزدوروں اور سنگتراشوں سے کام لیا ہے۔ باوجود اس تن و توش کے وہ کالج کے باغ کی تیاری میں پہروں دھوپ اور لوؤں میں پھرتے تھے، کنوئیں کھدواتے تھے زمین ہموار کرتے تھے، ہل چلواتے تھے، روشیں بنواتے تھے، دور دور سے ہر قسم کی پود منگواتے تھے جو اُن کے روبرو باغ میں لگائی جاتی تھی، باوجود ان

تمام باتوں کے تعمیر وغیرہ کے متعلق ہر ایک کام اُن کو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجنیر یا اوورسیر تھا جس سے اصلاح لیجائے نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو۔ جن دیہاتی معماروں سے یہ کام لیے گئے انھوں نے کبھی اس قسم کی عمارتیں نہیں بنائی تھیں اس لیے سرسید کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی سوچنا پڑتا تھا اور خود ہی اُس کے تمام نشیب و فراز سوچنے پڑتے تھے۔ معماروں اور سنگتراشوں کو خود بیٹھ کر ایک ایک بات بتانی پڑتی تھی اور پھر جب تک وہ کام ختم ہو خود ہی اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جس طرح بتایا گیا ہے اُسی طرح کام بنتا ہے یا نہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ بعض یورپین انجنیروں نے کالج اور بورڈنگ ہاوس کی عمارتوں کو دیکھ کر تعجب ظاہر کیا ہے اور جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر کسی تعلیم یافتہ انجنیر کی صلاح اور مشورہ کے یہ عمارتیں تیار ہوئی ہیں تو وہ اور بھی زیادہ متعجب ہوئے ہیں۔ با اینہمہ ممکن ہے کہ ان عمارتوں میں انجنیرنگ کے اصول کے موافق یا طلبہ کے آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو۔ لیکن ہم کو اس قومی انسٹیٹیوشن کے لیے ایسا انجنیر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کے لیے روپیہ فراہم کرے۔ خود ہی عمارت بنوانے، ایک کوڑی تنخواہ کی نہ لے، نہایت دیانت داری سے اپنا کام انجام دے اور ہر ایک عمارت کو ایسے شوق سے بنوائے کہ گویا اپنا گھر بنواتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تعمیر پر جتنا روپیہ صرف ہونا چاہیے تھا اس سے بہت زیادہ صرف ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی عالیشان عمارتیں بنانی کیا ضرور تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بیسیوں عمارتیں ناتمام پڑی ہیں ان کے شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی، جس قدر روپیہ آتا جاتا اُسی قدر عمارتیں بنی جاتیں

بعض اور اعتراض کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے خود کسی قومی عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بنا کر دکھایا ہے اور نہ کوئی ایسی عمارت نشان دیتے ہیں جو قوم سے بھیک مانگ کر اس سے بہتر کسی نے بنائی ہو۔

مشکلے دارم ز دانشمندِ مجلس باز پُرس
کار فرمایان چرا خود کار کمتر می کنند

عمارات کے متعلق اخیر بات جو سرسید کی لائف میں ذکر کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سرسید نے باوجود اس کے کہ کالج کے بانی ہونے کا فخر درحقیقت اُنھیں کو حاصل تھا، ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ کالج میں اُن کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے۔ جب اول ہی اول کالج کے قائم ہونے کی تجویز ہوئی تو اُن کے دوستوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ کالج کا نام مدرسۂ احمدیہ رکھا جائے۔ بلکہ کلکتہ کے اخبار اُردو گائیڈ نے ایک دفعہ یہ نام اپنے پرچہ میں چھاپ بھی دیا، مگر سرسید نے اس کی سخت مخالفت کی اور ہرگز اس بات کو منظور نہیں کیا کہ کالج ان کے نام سے موسوم کیا جائے اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں نے سرسید کی اطلاع اور مرضی کے بغیر ایک عمارت اُن کی یادگار میں بنانے کے لیے چندہ کھولا اور کالج کا دروازہ اُن کی یادگار میں بنانا اور اُس پر سرسید کے نام کا کتبہ لگانا تجویز کیا اُنھوں نے اس کی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ مسلمان جن سے میری یادگار کا چندہ وصول کرنے کی آپ امید رکھتے ہیں اُن کی نظر میں میری اور میرے کاموں کی مطلق وقعت نہیں ہے پس آپ چندہ کس سے وصول کریں گے مگر جب حاجی صاحب نے کسی طرح نہ مانا تو سرسید دو شرطوں پر راضی ہوئے۔ ایک یہ کہ دروازہ کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا جائے

اس پر یہ لکھا جائے کہ قوم نے قومی بھلائی کے لیے یہ کالج بنایا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو کتبہ دروازہ کے اندرونی جانب لگایا جائے اس پر مولوی سمیع اللہ خاں اور حاجی اسمٰعیل خاں کا نام بھی جو اس عمارت کے بنانے کے محرک ہوئے ہیں کندہ کرایا جائے حاجی صاحب نے پہلی شرط تو بہ اکراہ قبول کر لی، مگر دوسری شرط کی نسبت یہ کہا کہ آج تک کبھی ایسا نہیں سُنا گیا کہ کسی خاص شخص کی یادگار میں اوروں کے نام بھی شریک کیے جائیں، سرسید نے کسی طرح نہ مانا اور دونوں شرطیں قبول کرنی پڑیں، چنانچہ دروازہ کے پیش طاق پر چند عربی اشعار کندہ کرائے گئے جن میں کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں ہے اور اندرونی جانب حاجی محمد اسمٰعیل خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں کا نام بھی شامل کیا گیا۔

قطع نظر اس کے کہ حاجی صاحب کے اصرار نے سرسید کو مجبور کر دیا تھا بڑی وجہ سرسید کے راضی ہو جانے کی یہ تھی کہ اُن کو اپنی یادگار کے حیلہ سے احاطۂ بورڈنگ ہوس اور کالج کا صدر دروازہ جو ایک نہایت ضروری عمارت تھی اور بورڈنگ ہاؤس کے چھ پختہ کمرے تیار ہوتے نظر آتے تھے جن کا بغیر اس حیلہ کے تیار ہونا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ ۲۶ جون ۸۱ء کے جلسہ "کمیٹی یادگار سید احمد خاں" میں مولوی سید فرید الدین احمد خاں نے صاف کہا تھا کہ اگر حاجی صاحب اس چندہ سے بورڈنگ کی ایک ضروری عمارت کا بننا تجویز نہ کرتے تو سید احمد خاں اس کی شدید مخالفت کرتے۔

اسی طرح ایک دفعہ کالج کے بعض یورپین افسروں نے یہ تحریک کی کہ ایک میاں بھی ولایت کے کالجوں کی طرح فونڈرز ڈے (یعنی بانی مدرسہ کی سالگرہ کا دن)، بطور ایک خوشی کے دن کے قرار دیا جائے جس میں

ہر سال کالج کے ہواخواہ اور دوست اور طالب علم جمع ہو کر ایک جگہ کھانا کھایا کریں اور کچھ تماشے تفریح کے طور پر کیے جایا کریں۔ سرسید نے اس کو بھی منظور نہیں کیا اور یہ کہا کہ "ہمارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس سے دے کر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سوا اس کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے چندہ جمع کر کے کالج قائم کیا جائے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپیہ سے قائم ہوا اُس کے کسی خاص بانی کے نام پر ایسی رسم ادا کی جائے۔ اس لیے میرے نزدیک فونڈرز ڈے کے فونڈیشن ڈے (یعنی کالج کی سالگرہ کا دن) مقرر ہونا چاہیے۔" چنانچہ اسی تجویز کے موافق کئی سال تک یہ رسم ادا کی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید نے کس لیے اپنی یادگار قائم کرنے کی مخالفت کی تھی؟ تمام دنیا میں اور خاص کر اُن ملکوں میں جہاں ہمیشہ ایسے قومی رفاہ کے کام ہوتے رہتے ہیں، یہ عام دستور ہے کہ ہر قوم کے افراد اُن لوگوں کی شکر گذاری کے طور پر جن سے کوئی قوم کی بھلائی کا کام ہوتا ہے اُن کی یادگاریں قائم کرتے ہیں اور اُس سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم کی ناشکری و احسان فراموشی کا دھبا نہ لگے اور آیندہ نسلوں میں بھی قوم کی خیر خواہی کا حوصلہ پیدا ہو۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ایسے مفید کام کے کرنے سے سرسید لوگوں کو مانع آتے تھے؟

اس کا جواب بہت صاف ہے۔ جن ملکوں میں قومی بھلائی کے کام کرنے اور محض قوم کی خیر خواہی میں اپنی عمریں صرف کر دینے کا عام دستور ہے اور جہاں ہر زمانے میں ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں وہاں کبھی ایسے لوگوں پر

جو ایسے کام کرتے ہیں خود غرضی کا گمان کسی کو نہیں ہوتا بلکہ ادنےٰ سے لے کر اعلےٰ اور جاہل سے لے کر عالم تک سب دل سے اُن کی عزت کرتے ہیں، اُن کا احسان مانتے ہیں، اُن کو مدد دیتے ہیں اور اُن کی شکر گذاری اور آیندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لیے اُن کی یادگاریں قائم کرتے ہیں، مگر ہمارے ملک کا حال اس کے برخلاف ہے۔ یہاں ایسی مثالیں کمیاب بلکہ نایاب ہیں کہ کوئی شخص بے شائبہ غرض محض قوم کی بھلائی میں اپنی عمر صرف کردے۔ رات دن اسی اُدھیڑبن میں لگا رہے اور قوم ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالے، اس لیے اگر حسن اتفاق سے قرنوں اور صدیوں کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جس قسم کے کام کا وہ ارادہ ظاہر کرتا ہے اس کا نمونہ قوم میں موجود نہیں ہوتا اس لیے اُس کو اپنی طرف سے بدگمانی کے رخنے بند کرنے پڑتے ہیں تاکہ قومی رفاہ کے کام میں خلل واقع نہ ہو اور لوگ اس کا ذاتی کام سمجھ کر امداد اور اعانت سے پہلو تہی نہ کریں۔ چنانچہ ایک آدھ موقع پر جس کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا اگر کسی وجہ سے سر سید اس مصلحت کا لحاظ نہ کر سکے تو نہ صرف اُن کے مخالف بلکہ نہایت عزیز دوست اُن کی طرف سے کھٹک گئے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہوگئیں۔

## تعلیم

کالج میں اول دو ڈپارٹمنٹ قائم کیے گئے تھے ایک انگریزی ڈپارٹمنٹ جس میں یونیورسٹی کا کورس پڑھایا جانا تجویز ہوا تھا، دوسرا اورنٹیل ڈپارٹمنٹ جس کی پڑھائی منفرد کرنی کمیٹی کے اختیار میں تھی اور اُردو میں علوم جدیدہ اور فارسی و عربی ادب اور علوم قدیمہ پڑھائے جانے قرار پائے تھے اور انگریزی کے

لیے بطور سکنڈ لینگوج کے صرف ایک گھنٹہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس ڈپارٹمنٹ کے لیے سرسید انگلستان سے بڑے بڑے نامور علماء و فضلا سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی ایک فہرست لکھوا کر اپنے ساتھ لائے تھے جس میں ہر فن کے علما نے اپنے اپنے فن کی نہایت مستند اور معتبر کتابیں لکھی تھیں مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں اُن کا ترجمہ کرا کر اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کی پڑھائی میں داخل کریں مگر سوا اس کے کہ شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ نے اُس فہرست کی اکثر کتابوں کا ترجمہ بطور خود کر دیا اور کوئی نتیجہ اُس سے پیدا نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ تک دونوں ڈپارٹمنٹ جاری رہے مگر اورنٹیل ڈپارٹمنٹ روز بروز تنزل کرتا جاتا تھا یہانتک کہ بلا مبالغہ طلبہ کی تعداد سے استادوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی چونکہ طالب علموں اور اُن کے مربیوں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم میں کوئی امید دنیوی فائدے کی نہ تھی اس لیے اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کو کوئی پسند نہ کرتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر اس کو توڑ دیا گیا۔ مگر انگلش ڈپارٹمنٹ جیسا کہ آگے کسی موقع پر بیان کیا جائے گا، روز بروز ترقی کرنے لگا۔

# کالج کلاس قائم کرنا

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ابتدائی مدرسہ کھولا گیا تھا اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کلاس قائم ہو گئی نیز اسی سال محمڈن کالج فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور ۱۸۸۱ء میں بی اے اور ایم اے کے امتحان تک اور ۱۸۸۳ء سے قانونی امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ اور اسی طرح سائنس اور آرٹس کی اعلیٰ تعلیم میں اور نیز قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ ایفلییٹ ہو گیا۔ جو ترقی گذشتہ ۲۳ سال میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اس کالج نے کی ہے اُس کے متعلق

مفصل حالات کالج کی سالانہ رپوٹوں سے معلوم ہو سکتے ہیں، یہاں ہم صرف اس قدر دکھانا چاہتے ہیں کہ اس کالج کی بدولت صوبہ شمال مغرب و اودھ کے مسلمان گریجوٹس کی تعداد میں بمقابلہ ہندو گریجوٹس کے کس قدر اضافہ ہوا ہے۔

۱۸۹۳ء میں جو لکچر آنریبل سید محمود نے ایجوکیشنل کانفرنس میں بمقام علیگڑھ دیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ مذکور کے سوا ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں سنہ مذکور تک مسلمان گریجوٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوٹس کے اس قدر گھٹی ہوئی تھی کہ اُس کو صفر سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً بنگال میں جہاں مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان گریجوٹس فیصدی ۹،۵ ہونے چاہییں وہاں اُن کی تعداد ۴،۳ سے زیادہ نہیں بنتی۔ اسی طرح مدراس میں بجائے ۶،۸ کے صرف ۹،۰ اور بمبئی میں بجائے ۲۱،۵ کے ۲،۱ اور پنجاب میں بجائے ۹ما کے ۲۵ فیصدی برآمد ہوئی تھی برخلاف اضلاع شمال مغرب و اودھ کے جہاں نسبتہً مسلمان گریجوٹس کی تعداد ۲ء۱۱ ہونی چاہیے تھی لیکن معلوم ہوا کہ سنہ مذکور تک اُن کی تعداد ۶،۱۷ تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ محمدن کالج نے قطع نظر اُن فوائد کے جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا خاص کر ترقی تعلیم کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کو اس قلیل عرصہ میں کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔

## تفسیر القرآن

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا، اسی وقت سے اُن کو اس بات کی فکر تھی کہ جس طرح دنیوی عزت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ اُن کو تعلیم کے اُن مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اُس

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے)

سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے. وہ دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں، خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی، اُن کے دل میں مستثنےٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی. وہ مذہب کی کوئی بات جو بظاہر یا فی الحقیقۃ عقل یا قانون قدرت کے خلاف ہو اُس کو تسلیم نہیں کرتے. وہ ریاضی اور علم طبیعی کی ممارست سے مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلہ پر اُن کو ملتا رہا ہے. اُن کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کا استخفاف اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے. اُن کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی مذہب مضمحل ہوتا جاتا ہے اسی لیے ان کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے جس کو وہ قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں کہیں ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں بھی نہ پیدا ہوں جیسے یورپ میں عیسائی مذہب کے حق میں پیدا ہوئے ہیں. چنانچہ ۱۸۷۶ء میں کہ یہی زمانہ اُن کے تفسیر شروع کرنے کا معلوم ہوتا ہے انھوں نے ایک اسپیچ میں خاصکر مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے. اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے. پھر اگر تم آسمان

---

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ؎ صوبۂ شمال مغرب و اودھ کے گریجوٹس سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اُس صوبہ کے کسی کالج میں تعلیم پا کر یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہو نہ صرف وہ گریجویٹ جو خاص صوبۂ مذکور کے باشندے ہوں کیونکہ اُن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے پنجاب سے آکر محمڈن کالج میں تعلیم پائی اور کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہے ۱۲-

کے تارے ہو گئے تو کیا! پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کی عزت ہوگی۔"

لیکن باوجود اس اندیشہ کے وہ مغربی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری اور ناگزیر جانتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ جیسا کہ انھوں نے اپنی اکثر تحریروں اور اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے اُن کو یہ بھی یقین تھا کہ خالص اسلام جس کو وہ ہمیشہ ٹھیٹ اسلام سے تعبیر کرتے تھے۔ اس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے اُن کا ہمیشہ یہ قول رہا ہے کہ جو لوگ مغربی تعلیم یا مغربی علوم کو اسلام کے حق میں خطرناک تصور کرتے ہیں اور اس لیے مسلمانوں میں اُن کا پھیلنا نہیں چاہتے، وہ درحقیقت اسلام کو بہت بودا اور کمزور مذہب خیال کرتے ہیں جو علم و حکمت کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا۔ انھوں نے ایک موقع پر کہا کہ "یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچا مانا جاتا ہے اگر آیندہ غلط ثابت ہو جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوئی ہے اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعوےٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے۔ اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے ہی علم کا نقصان تھا مگر قرآن ویسا ہی سچا تھا" البتہ وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ جس مجموعۂ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زمانتا اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا۔

الغرض اُن کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اُن کا انسداد کیا جائے۔ لیکن جو طریقہ استدلال کا زمانہ گذشتہ میں یونانی فلسفہ کے مقابلہ کے لیے ہمارے

متکلمین نے اختیار کیا تھا اور جس سے رفتہ رفتہ ایک نیا فلسفہ بنام علم کلام کے پیدا ہو گیا وہ کسی طرح فلسفۂ حال کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دے سکتا تھا کیونکہ برخلاف یونانی فلسفہ کے جس کا مدار محض قیاس اور ظن و تخمین پر تھا، فلسفۂ حال کا ہر ایک مسئلہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ پس ضرور تھا کہ جس طرح مسائل حکمیہ کے ثبوت کا طریقہ بدل گیا ہے اسی طرح اُس کے مقابلہ کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔

ہمارے علما جو فلسفۂ قدیم اور علوم دینیہ میں تمام قوم کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں اور جن کا یہ منصب تھا کہ فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کے لیے کھڑے ہوتے، اُن کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ یونانی فلسفہ کے سوا کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے سوا کوئی اور علمی زبان بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ علوم جدیدہ صرف کرسچینٹی یا صرف اسلام کی بلکہ تمام دنیا کے مذاہب کی جڑ کاٹ رہے ہیں، اور اگر بالفرض وہ اسلام کی حمایت کا کوئی نیا طریقہ مقتضائے وقت کے موافق اختیار کرنے کا ارادہ بھی کرتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اپنے ارادہ میں کم و بیش کامیابی حاصل کر سکتے اُن کو تقلید کی عادت نے ہرگز اس قابل نہیں رکھا کہ وہ قدما کی پیروی کے دائرہ سے قدم باہر رکھ سکیں اور طعن و ملامت کے خوف اور مرجع خاص و عام بننے کی خواہش نے آزادی کا جوہر اُن کی طبیعتوں میں بالکل نہیں چھوڑا۔

بہرکیف سرسیّد کو اس طرف سے بالکل مایوسی تھی کہ ہمارے مسلم الثبوت علماء اس ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے۔ پس اُنھوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا ہوں اس کام کو اپنا ایک ضروری فرض سمجھ کر اپنے ذمہ لیا۔ انھوں نے اپنا ایک اسپیچ میں

اس معاملہ کے متعلق اپنے تمام خیالات مفصل طور پر بیان کیے ہیں جن میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں

انھوں نے کہا کہ "جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجت کے اسلام پر یقین رکھتے ہیں بلاشک ان کا ایمان اور ان کا یقین بہ نسبت ان لوگوں کے جو دلیل و حجت سے اپنے عقیدہ کو مستحکم کرتے ہیں بہت زیادہ مستحکم ہے کیونکہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ نے راہ نہیں پائی اور نہ راہ پانے کی اس میں گنجائش ہے...... میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان کے ایمان کو (میں اور کسی سے کیوں کہوں) اپنے ایمان سے تو بہت زیادہ مستحکم جانتا ہوں ...... خدا کے ماننے اور رسول پر یقین کرنے کے لیے ان کو کسی منطقی دلیل اور فلسفی برہان کی حاجت نہیں، کیسی ہی کوئی بات خارج از عقل و ناقابل یقین صحیح یا غلط ان کے سامنے یہ کہہ کر کہ "خدا اور رسول نے فرمایا ہے" بیان کیجائے۔ وہ فوراً اُس پر یقین کریں گے۔ پس ایسے لوگ ہماری بحث سے بالکل خارج ہیں۔ میں ان کو یقین کا ستارہ اور اسلام پر یقین کرنے کا نمونہ سمجھتا ہوں اور ٹھیک مسلمان جانتا ہوں۔"

"مگر اُن کے سوا ایک اور فرقہ بھی ہے جو ہر چیز کی صداقت کے لیے دلیل چاہتا ہے اور اس بات کا خواہشمند ہے کہ اسلام کے عقائد فلسفی دلائل سے اُس کو بتائے جائیں اور اُس کے دل کے شبہے مٹائے جائیں تاکہ اُسکے دل کو تشفی ہو....... وہ یہ نہیں چاہتا کہ دل میں تو ڈھکڑ پکڑ ہوا ور وہ زبان سے لوگوں کے ڈر یا سوسائٹی کے دباؤ سے ہاں ہاں کہا کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہمارے مخاطب ہیں اور جن سے ہم کو بحث ہے۔"

"جس زمانہ میں خلفائے عباسیہ کی سلطنت رونق پر تھی...... اُسوقت

مسلمانوں میں فلسفۂ یونانی اور علم نے کثرت سے رواج پایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مسائل میں جو اسلام سے متعلق تھے لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کیونکہ جو لوگ اُن مسائل فلسفۂ علم طبیعی کو صحیح جانتے تھے اور اُن میں اور اسلام کے مسائل میں اختلاف پاتے تھے اُن کو اسلام کی نسبت شبہ پیدا ہوتا تھا.....

وہ زمانہ اسلام پر ایسا سخت تھا کہ اسلام کے سخت سے سخت دشمن کے حملہ سے بھی اُس سے زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ علما کو اُس وقت اسلام کی حمایت کی ضرورت پڑی اور انھوں نے اُس کی حمایت اور نصرت میں کوشش کی۔ خدا اُن کی کوششوں کو قبول کرے ........ پس میرا خیال ہے کہ جس زمانہ میں اسلام کی ایسی حالت ہوا اور اُس پر ایسا ہی حملہ ہو جیسا کہ اس زمانہ میں ہوا تھا تو ہم کو بقدر اپنی لیاقت کے ویسی ہی کوشش کرنی چاہیے۔

"اے دوستوں تم خوب جانتے ہو کہ اس زمانہ میں جدید فلسفہ و حکمت نے شیوع پایا ہے جس کے مسائل اُن اگلے مسائل سے بالکل مختلف ہیں اور وہ مروجہ مسائل اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسے کہ اس زمانہ میں تھے........

اس زمانہ کی تحقیقات اور یونانی حکمت کے مسائل میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اُس زمانہ کے مسائل حکمیہ زیادہ تر عقلی اور قیاسی دلیلوں پر مبنی تھے ...... ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی مسائل کو عقلی براہین سے توڑ دیں اور اُن کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانہ میں ...... مسائل علم طبیعی تجربہ سے ثابت کیے جاتے ہیں اور وہ دکھلا دیے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ قیاسی دلائل سے اٹھا دیے جائیں یا اُن تقریروں اور اصولوں سے جو اگلے زمانہ کے عالموں نے قرار دیے ہیں ہم اُن کا مقابلہ کر سکیں۔"

اسلیئے اس زمانہ میں ....... ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم

علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں، یا مشتبہ ٹھہرا دیں یا اسلامی مسائل کو اُن سے مطابق کر دکھائیں اس وقت جو بزرگ اس جلسہ میں موجود ہیں میں اُن سب سے واقف نہیں ہوں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ یہاں بہت سے ذی علم لوگ بھی موجود ہیں، میں سچ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا اُن کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے وہ سب گنہگار ہیں اور یقیناً گنہگار ہیں۔

"میں ایک شخص ہوں جس کا یہ یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علم طبعی سے بخوبی واقف ہو اور اُن تمام اسلامی مسائل پر جو اس زمانہ میں اسلامی مسائل کہلاتے ہیں یقین رکھتا ہو۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کریں گے ہیں تے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہو گیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانے کے مروجہ مسائل اسلام پر ہو میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی اُن کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں، اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی بلکہ رو گردانی ہوتی جائے گی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ اُن غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر لگ گئی ہیں یا ناواقفیت لگا دی ہیں یہ

"میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ پر سے اُن غلطیوں کے سیاہ دھبوں کے چھڑانے کا دعوے کروں یا حمایت اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں، یہ منصب اور یہ فرض دوسرے مقدس و باعلم لوگوں کا

ہے۔ مگر جب کہ میں مسلمانوں میں اُن علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اُس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اس کے اصلی نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس مجھ سے کہتا تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار ہوں گا:

"تلے میرے دوستو! میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے مگر جب مجھکو بجز اس کے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کروں، اور چارہٗ کار نہ تھا تو مجھکو ضرور وہی کرنا تھا جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خالص خدا کے ساتھ ہے۔ اگر میں نے بُرا کیا ہے وہ چاہیگا معاف کرے گا چاہے گا نہ کرے گا، اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اس کا صلہ کسی بندہ سے نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر یا نیچری کہنے سے ڈرتا ہوں اور نہ بُرا مانتا ہوں۔ جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب بُرا کہتے ہیں کافر تبلاتے ہیں میں اُن سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں اور نہ ہوں گا۔ جو بھلا یا بُرا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے یا آیندہ ہوگی خدا سے مجھے امید ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے گا۔"

الغرض سرسید نے مذکورۂ بالا مقصد کے پورا کرنے کے لیے اول اسلام کی سچائی ثابت کرنے کا ایک ایسا معیار قرار دیا جو ہر مذہب کی سچائی دریافت کرنے کا پیمانہ قرار پا سکے یعنی یہ کہ اس میں کوئی بات قانون فطرت کے برخلاف نہ ہو کیونکہ قانونِ فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا پس اُس کے فعل اور اُس کے قول میں مطابقت ہونی ضرور ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اس امر پر غور کی کہ اسلام جس کی نسبت ہمارا

دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی بات علم وحکمت وصداقت کے برخلاف نہیں اور وہ بالکل قانون فطرت کے مطابق ہے اُس سے کیا مراد ہے؛ اور اُس کی حد کیا ہے اور اُس کے ثبوت کی بابت ہم کہاں تک ذمہ دار ہو سکتے ہیں؛ اس امر کے متعلق انھوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے متعارف مجموعہ میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عند اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزماں کے دل میں القا ہوا ہے اُسی طرح بے کم وکاست نبی سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے، صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اُس میں جو بات مسائل فلسفہ وحکمت کے خلاف معلوم ہوا اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کیجائے یا مسائل حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے پس انھوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ "حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ" اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا، اور اُس کے سوا تمام مجموعۂ احادیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علماء ومفسرین کے اقوال وآرا اور تمام فقہا ومجتہدین کے قیاسات واجتہادات کو اس بنا پر کہ اُن کے جوابدہ خود علما ومفسرین اور فقہا ومجتہدین ہیں نہ اسلام، اپنی بحث سے[1] خارج کر دیا۔

---

[1] سرسید کا دعویٰ اسلام کی حمایت کے موقع پر صرف اس قدر ہے کہ کوئی اعتراض سائنس کی رو سے قرآن مجید پر وارد نہیں ہو سکتا اس لیے انھوں نے اپنی بحث کا موضوع محض قرآن مجید کو قرار دیا ہے اور مجموعۂ احادیث وغیرہ کو اس بحث سے الگ رکھا۔ لیکن جو لوگ مذہب اسلام کا اطلاق مجموعۂ کتاب وسنت واجماع وقیاس پر کرتے ہیں اُن کو اسلام کی حمایت کے لیے ضرور ہے کہ وہ اس تمام مجموعہ کو سائنس کے حملہ سے بچائیں، عام اس سے کہ اس کو سائنس کے مسائل پر منطبق کریں، یا اُس کے مقابلہ میں سائنس کے مسائل کا بطلان ثابت کریں یا اُن کو غیر محقق ٹھیرائیں ۱۲ ۔

یہ دونوں اصول ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اول اول جب تک کہ تہذیب الاخلاق جاری رہا کبھی کبھی بلا لحاظ ترتیب کے وہ متفرق آیتوں کی تفسیریں بطور آرٹیکل کے تہذیب الاخلاق میں چھاپتے رہے۔ مگر جب تہذیب الاخلاق کا پرچہ پہلی دفعہ بند ہو گیا اور سرسید سرکاری خدمات سے سبکدوش ہو کر بنارس سے علیگڑھ چلے آئے تو انھوں نے ابتدا سے قرآن مجید کی تفسیر ترتیب وار لکھنی شروع کی اور اس وقت سے اخیر دم تک جب کبھی ان کو اور کاموں سے فرصت ملی برابر اس کے لکھنے میں مصروف رہے اور قریب دو خمس کے تفسیر لکھنی باقی تھی کہ پیغام اجل آ پہنچا۔

جس اصول پر سرسید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی تھی یہ ایک ایسا مشکل کام تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا کام شروع کرتا تو چند روز بعد اس کا خیال بالکل چھوڑ دیتا۔ یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ اسلام میں کوئی بات قانون فطرت کے خلاف نہیں ہے مگر اس کی تمام جزئیات کو قانون فطرت پر منطبق کرنا خصوصاً اس حالت میں جب کہ سلف کی تصنیفات میں کوئی ایسا نمونہ موجود نہ ہو نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اس کے سرسید نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور باوصف سخت مخالفتوں کے جو قوم کی طرف سے ہوئیں اور باوجود ان بیشمار مشکلات کے جو تفسیر لکھنے وقت ان کو پیش آتی تھیں نہایت استقلال کے ساتھ اس کام کو اپنے مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

اس تفسیر کے مضامین پر ہم دوسرے حصہ میں بحث کریں گے یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔

با اینہمہ اس تفسیر کو ہم اُن کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور ہمدردی کے علاوہ اُن کی لٹریری لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے برخلاف اکثر مولویوں نے تفسیریں لکھی ہیں جن میں تفسیر حقانی سب سے زیادہ مشہور ہے مگر اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لکھنے والوں میں سے ایک شخص بھی یہ نہیں سمجھا کہ سید احمد خاں نے کس غرض سے یہ تفسیر لکھی ہے اور کس بنا پر انھوں نے اکثر جگہ تمام مفسرین سے اختلاف کیا ہے جس طرح بعض چالاک وکیل کسی حیلہ سے جج کو فریق مخالف پر افروختہ کر کے اپنا کام نکال لیتے ہیں اسی طرح ان مولویوں نے اپنی تفسیروں کے خریدار پیدا کرنے کا یہ گر نکالا ہے کہ سرسید کو کہیں شیطان کا منکر، کہیں فرشتوں کا منکر، کہیں معجزات کا منکر، کہیں نبوت کا منکر، کہیں جنت و دوزخ کا منکر قرار دے کر مسلمانوں کو ان سے اور اُن کی تفسیر سے نہایت بدگمان اور متنفر کر دیا ہے۔ اگر یہ لوگ فی الواقع حمایت اسلام کی نظر سے سرسید کی تفسیر کا جواب لکھتے تو اُن کو سب سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ انگریزی تعلیم مذہب کے حق میں فی الواقع کوئی خطرہ کی چیز ہے یا نہیں اور اگر ہے تو آیا اُس کا علاج یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کو قوم میں رواج نہ دیا جائے یا یہ کہ تعلیم سے جو شبہات اسلام کے حق میں پیدا ہوتے نظر آتے ہیں اُن کا جہاں تک ممکن ہو استیصال کیا جائے۔ اس کے بعد اُن کو یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ سرسید نے جو طریقہ شبہات کے استیصال کرنے کا اختیار کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر ٹھیک ہے تو انھوں نے کہاں تک قرآن کی تفسیر اُس طریقہ کے موافق کی ہے اور کہاں کہاں اُس سے انحراف کیا ہے اور اگر وہ طریقہ ٹھیک نہیں

ہے تو پھر کونسا طریقہ ہے جس کو اس مقصد کے لیے اختیار کرنا چاہیے اور کس طرح اس طریقہ سے اُن شبہات کا جو علوم جدید کی تعلیم یافتہ گروہ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں استیصال کیا جائے مگر افسوس ہے کہ انھوں نے مراتب مذکورۂ بالا میں سے ایک بات کا بھی اپنی تفسیروں میں لحاظ نہیں کیا بلکہ اپنی تمام ہمت اس بات میں صرف کی ہے کہ سرسید کی نسبت لوگوں کے تعصبات کو اور زیادہ بھڑکائیں تاکہ اُن کی تفسیروں کی زیادہ قدر ہو اور لوگ اُن کو بہت بڑا حامیِ دینِ اسلام سمجھیں۔

لطیفہ: ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کر دیجیے۔ میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اُس کے واسطے سفارش کر دیں"۔ سرسید نے اُن کو لکھ بھیجا کہ میری عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگیٔ معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔"

چھٹا باب :

# ۱۸۷۸ء سے ۱۸۹۸ء تک

وائسرائے کی کونسل کی ممبری، ایجوکیشن میں شہادت، محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن، محمڈن ایسوسیئیشن علیگڑھ، محمدن ایجوکیشنل کانفرنس، پبلک سروس کمیشن کی ممبری، انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت، پیٹریاٹک ایسوسیئیشن، کے سی ایس کا تمغہ ملنا، ایل ایل ڈی کی ڈگری، ٹرسٹی بل پر اختلاف، کالج کے روپیہ میں غبن ہونا، سرسید کی وفات۔

---

۱۸۷۸ء میں سرسید کو لارڈ لٹن نے وائسریگل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا اور اُن کے بعد دوسری دفعہ لارڈ رپن نے اُن کو ممبری کونسل کے لیے انتخاب کیا۔ قانونی کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک کرنے کی تحریک جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے سب سے اول سرسید ہی نے کی تھی۔ انھوں نے اپنے رسالہ اسباب بغاوت میں سب سے بڑا سبب بغاوت کا کونسل میں ہندوستانیوں کے بھرتی نہ ہونے اور انتظام سلطنت سے بالکل بےخبر رہنے کو قرار دیا تھا۔ پس جس عزت و امتیاز کا دروازہ انھوں نے اپنے ہموطنوں کے لیے کھولا تھا اس کا استحقاق فی الواقع سرسید سے زیادہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ بمبئی گزٹ میں اُن کے انتخاب کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ اُن نقصوں کے پورا کرنے سے

جو سید احمد خاں نے اسباب بغاوت میں ظاہر کیے تھے غافل نہیں تھی خود ان کو لارڈ لٹن اور لارڈ رپن کا ممبری کے لیے منتخب اور نامزد کرنا اس بات کی عمدہ ضمانت تھی کہ گورنمنٹ اپنی رعایا کے ایک عمدہ حصہ کی ضروریات اور خواہشات سے آگاہ ہو۔"

ہندوستانیوں میں سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ہندوستان کی بھلائی کے لیے قانون بنایا۔ وہ چار برس متصل وائسریگل کونسل کے ممبر رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے دو مسودے کونسل میں پیش کیے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے پاس ہو گئے۔ اور اُس سے آج تک اُن کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔

# قانون ٹیکہ چیچک

چیچک کے ٹیکے کا قانون جس کا مسودہ ستمبر ۱۸۷۹ء میں کونسل میں پیش ہوا اس غرض سے بنایا گیا تھا کہ ٹیکے کا قاعدہ اضلاع شمال مغرب۔ اودھ، ممالک متوسط، برٹش برہما، آسام، اجمیر اور کورگ میں، اور نیز فوجی چھاؤنیوں میں لازمی کر دیا جائے۔ چونکہ ایسا جبری قانون جاری کرنے سے رعایا کی شخصی آزادی میں ایک نوع کی مداخلت کرنی پائی جاتی تھی اس لیے سرسید نے مسودہ پیش کرتے وقت جو اُس پر ایسا لمبا ریمارک کیا تھا، اُس میں اُس قانون کے جاری کرنے کی ضرورت بہت خوبی سے ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ شخصی آزادی کی رعایت اُس مضرت کو جائز نہیں رکھ سکتی جو مرض چیچک کے متعدی ہونے سے اوروں کو پہنچتی ہے اور نیز چیچک کا ضرر بالخصوص اُن بے گناہ بچوں کو

پہنچتا ہے جو ایسی جانوں کی خود حفاظت نہیں کر سکتے. پس ٹیکے کے لازمی کر دینے سے جس طرح بڑی عمر کے آدمی ہمسایوں کی لاپروائی کے مضر نتائج سے محفوظ رہیں گے اسی طرح معصوم بچوں کی جانوں کی حفاظت اُن کے والدین کی بیوقوفی کے نتائج سے عمل میں آوے گی" پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ "جس طرح پہلے زمانے میں لوگ عموماً ٹیکے سے ڈرتے تھے اب ایسا حال نہیں رہا۔ اب ملک میں ایک بہت بڑی جماعت تعلیم یافتہ لوگوں کی ایسی موجود ہو گئی ہے جو ٹیکے کا لازمی ہونا پسند کرتے ہیں"

مع ذلک ٹیکا لگانے کے قواعد میں جہاں تک کہ ممکن تھا ہر طرح کی آسانی اور نرمی کا لحاظ رکھا ہے. اولاً لوکل گورنمنٹوں کو اُس میں اختیار دیا گیا ہے کہ جس میونسپلٹی سے مناسب سمجھیں اس کو متعلق کریں، اس کے سوا ٹیکا لگوانے والوں کو اور بہت طرح سے آسانیاں دی گئی ہیں. مثلاً یہ کہ بچوں کے مکانوں پر جا کر ٹیکا لگایا جائے. میونسپل کمشنروں میں سے کوئی ممبر خود جا کر اپنے سامنے ٹیکا لگوائے. پولیس کی دست اندازی جہاں تک ممکن ہو نہ ہونے پائے، اطفال غیر محفوظ کی تحقیقات اور اُن کے رجسٹر کی ترتیب میونسپل کمشنروں اور سپرنٹنڈنٹ ویکسینیٹروں سے متعلق رہے تاکہ بچوں اور اُن کے مربیوں کو مجسٹریٹ کے روبرو جبراً حاضر کرانے کی ضرورت نہ رہے، کسی بچہ کے بازو سے مادہ نہ لیا جائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو حیوانی مادہ سے ٹیکا لگایا جائے اور قانون کی خلاف ورزی کی سزائیں صرف جرمانہ پر محدود رہیں۔

باوجود ان سب باتوں کے یہ بل اختلاف رائے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خصوصاً نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب اس کے سخت مخالف تھے. مگر کونسل کے اکثر لیجسلیٹو ممبر اُس سے اتفاق رکھتے تھے آخر ایک آدھ دفعہ کی جزوی

ترمیم کے بعد ۱۸۷۹ء میں پاس ہوگیا۔

# قانون تقرر قاضیان

قاضیوں کے تقرر کا قانون بھی ۱۸۸۰ء میں کسی قدر اختلاف کے بعد مجارٹی سے پاس ہوگیا۔ اس قانون کے بنانے کا منشا یہ تھا کہ گو عہدۂ قضا کی وہ حیثیت جو اہل اسلام کے عہد میں ایک جج یا مجسٹریٹ کے برابر تھی، انگریزی عملداری میں باقی نہ رہی تھی، مگر پھر بھی انگلش گورنمنٹ نے اپنے عہدِ حکومت میں اس عہدہ کو بالکل موقوف نہیں کر دیا تھا بلکہ بعض قوانین کے ذریعہ سے جو ۱۸۷۳ء سے ۱۸۲۷ء تک وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہے، بنگالہ، اڑیسہ، بہار، بمبئی اور مدراس میں ایک عدالتی اختیارات کے سوا باقی تمام کام جو قاضیوں سے متعلق چلے آتے تھے قائم رکھے تھے، جیسے دستاویزات کا تیار اور تصدیق کرنا۔ نکاح خوانی اور طلاق کی مجلسوں میں صدرنشین ہونا، انواع واقسام کے آداب و رسومات مذہبی کا انجام دینا، قرق شدہ جائیداد کے نیلام کی دیدبانی، زرِ خیرات و پنشن و وظائف کا تقسیم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ پھر رفتہ رفتہ حسب مقتضائے وقت ان کی خدمات محدود ہوتی گئیں، یہاں تک کہ ۱۸۶۴ء میں جملہ قوانین جو قاضیوں کے تقرر اور ان کے کاموں سے متعلق تھے منسوخ کیے گئے اور یہ قرار پایا کہ قاضیوں کا تقرر بذریعہ گورنمنٹ کے عمل میں آنا قرینِ مصلحت نہیں ہے اور قاضیوں کو اجازت دی گئی کہ جس وقت لوگ ان سے کسی رسم مذہبی وغیرہ کے انجام دینے کے خواستگار ہوں تو وہ بطور خود اُس کو انجام دیں۔

مگر جس طبقہ کے لوگوں کو ایسے کاموں کے لیے قاضیوں کی ضرورت ہوتی تھی اُن کے ذریعہ سے عموماً اور مسلمانانِ صوبۂ مدراس کے ذریعہ سے خصوصاً

بارہا گورنمنٹ کی اطلاع میں آچکا تھا کہ بغیر ایسے قاضیوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوں لوگوں کے کاموں میں جرج واقع ہوتا ہے اس لیے سرسید نے یہ مسودہ تیار کیا جس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ گورنمنٹ نے جو قاضیوں کے تقرر کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا اس کو وہ پھر اپنے ہاتھ میں لے اور اول صوبۂ مدراس میں اُس کو نافذ کرے اور تمام لوکل گورنمنٹوں کو اختیار دے کہ جس صوبہ کے مسلمان اس قانون کو اپنے صوبہ میں جاری کرانا چاہیں وہاں اس قانون کو جاری کریں۔ امید ہے کہ جہاں جہاں یہ قانون جاری ہو چکا ہے یا آیندہ جاری ہوگا وہاں کے قدیم قاضیوں کے خاندان جو سرکاری عہدہ دار نہ ہونے کی وجہ سے ایک کس مپرسی حالت میں تھے اُن کی قدر و پرشش زیادہ ہونے لگے گی اور خاص خاص طبقوں کے مسلمانوں کو نکاح خوانی وغیرہ میں اُن سے مدد ملے گی۔

# قانون وقف خاندانی

ان دونوں قانونوں کے علاوہ سرسید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ایک اور نہایت مفید خدمت اپنی قوم کی کرنی چاہی تھی مگر افسوس ہے کہ بعض موانع کے سبب وہ تدبیر پوری نہ ہو سکی۔ اُنھوں نے ایک مسودہ قانون وقف خاندانی کے نام سے تیار کیا تھا جس سے مسلمان خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانا مقصود تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے اور جو امیر اور ذی مقدور خاندان تھے اُن کی اولاد مفلس ہوتی جاتی ہے۔ اور جن میں ابھی کچھ جان باقی ہے دو تین پشتوں کے بعد اُن کی جائیدادیں اور ریاستیں بھی سب برباد اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضہ

میں فروخت ہوجائے گی، اس لیے اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے مسلمانوں کے معزز خاندان بنے رہیں اور اُن میں کچھ ایسے ذی مقدور اور رئیس دکھائی دیں جن سے مسلمانوں کی قوم کی عزت اور امتیاز قائم رہے۔

اول انھوں نے نہایت محنت و جانفشانی سے سنی اور شیعہ دونوں کی فقہی کتابوں سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی جائداد کو اپنے لیے اور اپنے بعد اپنی اولاد اور اپنی نسل کے لیے ہمیشہ کو وقف کر دے جس کی رو سے وہ جائداد نہ کبھی بیع ہو سکے اور نہ وراثت میں تقسیم ہو سکے اور ہمیشہ قائم و برقرار رہے۔ پھر جہاں جہاں ہندوستان میں مسلمان رئیسوں نے اپنی جائدادیں اس طرح اپنے خاندان کے لیے وقف کی تھیں اُن کی بہت سی مثالیں بہم پہنچائیں تاکہ مسلمانوں کے عمل درآمد سے مسئلہ شرعی کو اور زیادہ تقویت ہو، اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ جو لوگ خانگی طور پر بلا مداخلت سرکار اپنی جائدادیں اپنے خاندان کے لیے وقف کرتے ہیں ایسے وقف سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو یہ امید نہیں کہ وہ جانشینی کا ایسا قاعدہ کلیہ مقرر کر سکیں جس میں آخر کار خانشیں پیدا نہ ہوں اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے دوسرے اس صورت میں ہمیشہ وقف کے فرضی اور فریبی ہونے کا الزام لگا کر اُس کی منسوخی کے دعوے، جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے، عدالت میں دائر ہو سکتے ہیں۔ تیسرے چونکہ اکثر جائدادیں دیہات مالگذاری سرکار ہوتے ہیں اس لیے جب کوئی نالائق متولی یا جانشین زر مالگذاری سرکار ادا نہیں کرتا تو امر شرعی یا قانونی اس بات کا مانع نہیں ہوتا کہ وہ جائداد بعلت باقی نیلام ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے ضروری سمجھا کہ یہ مسئلہ شرعی بذریعہ ایک

قانون کے گورنمنٹ کی منظوری سے استحکام پا جائے۔

اس غرض سے انھوں نے ایک مسودہ نہایت لیاقت کے ساتھ تیار کیا اور کونسل میں پیش کرنے سے پہلے وائسرائے سے پرائیویٹ طور پر اس کے مشتہر کرنے اور مسلمانوں کی رائیں اس کی نسبت دریافت کرنے کی اجازت لے کر تہذیب الاخلاق، علیگڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات میں مشتہر کرایا بہت سے مسلمانوں نے خطوں کے ذریعے سے اُس کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا۔ بعض شہروں میں وہاں کے رئیسوں اور متانت لوگوں نے جلسے کیے اور اس تجویز کو نہایت پسند کیا بعض نہایت مستند عالموں نے وقف خاندانی کے مسئلہ کو تسلیم کیا اور اس کے جواز پر فتویٰ لکھدیا۔ مگر بہت سے مسلمانوں نے اور خاصکر مولوی ابو سعید عظیم آبادی اور اُن کے پیروؤں نے سخت مخالفت کی، چنانچہ وقف خاندانی کے عدم جواز پر فتوے لکھے گئے اور گورنمنٹ میں اُس کے برخلاف عرضیاں اور میموریل بھیجی گئی۔

جس زمانہ میں اس مسودہ کے برخلاف مولویوں کے فتوے شائع ہو رہے تھے کسی انصاف پسند مسلمان نے ان فتووں کے خلاف ایک آرٹکل لکھا تھا جس کا پہلا فقرہ یہ تھا " انگلستان کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ " جو شخص اپنے ملک یا اپنی قوم کا بدخواہ ہو اُس کی زیارت کرنی چاہیے کیونکہ وہ دنیا میں ایک عجائب چیز ہے " ہم کہتے ہیں کہ یہ مصنف چونکہ یورپ میں پیدا ہوا تھا اس لیے شاید اُس نے عمر بھر میں کوئی قوم کا بدخواہ نہ دیکھا ہوگا۔ اور اسی لیے وہ قوم کے بدخواہ کو ایک عجیب چیز سمجھتا تھا۔ لیکن اگر وہ ہماری قوم میں پیدا ہوتا تو بجائے اس قول کے شاید یہ جملہ اُس کی زبان سے نکلتا کہ جو شخص مسلمان مولوی ہو کر اپنی قوم کا بدخواہ نہ ہو اُس کی زیارت کرنی چاہیے کیونکہ دنیا میں کوئی چیز اس

سے زیادہ عجیب نہیں ہے۔"

بہرحال سرسید نے یہ تدبیر مسلمان رئیسوں کے لیے نہایت عمدہ سوچی تھی مگر افسوس ہے کہ وہ اس مسودے کو کونسل میں پیش نہ کر سکے۔ نہ اس لیے کہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ وہ قانون لازمی نہ تھا اور اس کی پابندی محض مالک جائیداد کی مرضی پر منحصر تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ اصول قانون کی رو سے پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ قانون بالکل فریقین کی روایات فقہیہ کے مطابق بنایا گیا تھا اور فقہ کی رو سے ضرور تھا کہ جو وقف اس طرح اولاد کے لیے کیا جائے وہ وقف دوامی ہو نہ میعادی، مگر ولایت کے مقننوں کی یہ رائے قطعی طور پر قرار پا چکی تھی کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کے لیے ناقابل انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ پس سرسید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے اُن کو یہ صلاح دی کہ موجودہ صورت میں مسودۂ قانون پیش کرنا عبث ہے کیونکہ اُس کے منظور ہونے کی امید نہیں۔ ہاں اگر وقف کی کوئی میعاد مقرر کر دی جائے جس سے جائداد ایک مدت معین تک ناقابل انتقال رہے اور اُس کے بعد موجودہ وارثوں میں تقسیم ہو جائے تو البتہ یہ قانون پاس ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ایسے وقف کو میعادی قرار دینا شرعاً جائز نہ تھا اس لیے لاچار اُس سے دست بردار ہونا پڑا۔

## کونسل میں اسپیچیں

سرسید نے ان تینوں مسودوں کے تیار کرنے کے سوا اور اکثر موقعوں پر جب تک کہ وہ کونسل میں ممبر رہے غیر معمولی لیاقت ظاہر کی ہے۔ باوجود انگریزی نہ جاننے کے ہر ایک اہم معاملہ پر جو کونسل میں پیش ہوتا تھا وہ

گفتگو کرتے تھے اور اس لیے اُن کو تمام کاغذات جو اس معاملہ سے متعلق اور بالکل انگریزی میں ہوتے تھے سمجھنے پڑتے تھے اور اس طرح کافی اطلاع حاصل کرنے کے بعد وہ کونسل میں اسپیچ کرتے تھے۔ اکثر چھوٹی چھوٹی اسپیچیں وہ اول خود اُردو میں لکھ کر اُن کا انگریزی میں ترجمہ کراتے تھے اور پھر انگریزی الفاظ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر خود کونسل میں اسپیچ دیتے تھے اور بڑی بڑی اسپیچیں جو وہ تیار کر کے لیجاتے تھے ان کو اکثر کونسل کا سکرٹری پڑھ کر سناتا تھا۔ اُن کی ایک اسپیچ پر جو فارسی حرفوں میں لکھ کر دی تھی لارڈ لٹن نے بڑا تعجب ظاہر کیا تھا۔ سر سید کہتے تھے کہ "جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سُنی تھی" یہ اسپیچ غالباً مسودۂ قانونِ مزارعانِ دکن پر تھی جس کا انتخاب کرنل گریہم نے سر سید کی لائف میں چھاپ دیا ہے۔

ایک اور اسپیچ مسودۂ قانونِ انتقالِ جائیداد کی رپورٹ پیش ہونے پر سر سید نے ۲۶ جنوری سنہ ۷۷ء کو بل کی تائید میں کی تھی۔ اُس بل پر انگلشمین میں ایک لمبا آرٹیکل چھپا تھا جس میں سر سید کی اسپیچ کی نسبت لکھا تھا کہ "کسی ہندوستانی جنٹلمین نے اب تک اس مسئلہ کی تائید کہ ملک کا قانون کوڈیفکیشن (یعنی مجموعہ احکام بنانے) کا محتاج ہے اور اس میں کوڈیفکیشن کی گنجائش ہے، اور ملک کے دونوں فرقوں کی تاریخ اور لٹریچر ایک قومی ضرورت کی طرف بڑے استحکام کے ساتھ اشارہ کرتی ہے ایسی صراحت کیساتھ نہیں کی ہے جیسی کہ آنریبل سید احمد خاں نے کی ہے۔"

اسی طرح قانون حقوق استفادہ اور قانون ترمیم مجموعہ ضابطۂ فوجداری جو ہندوستان میں ہمیشہ یاد رہے گا اور نیز دیگر قوانین پر انھوں نے بہت باوقعت

اسپیچیں کی ہیں۔ خصوصاً وہ اسپیچ جو قانون لوکل سلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسط پر ۱۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو لارڈ رپن کے زمانہ میں کی تھی وہ خاص توجہ کے لائق ہے۔ قانونِ مذکورہ میں جو کہ خاص اضلاع متوسط کے لیے بنایا گیا تھا اس صوبہ کی حالت کے لحاظ سے لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث گورنمنٹ کے انتخاب سے مقرر ہونے تجویز کیے گئے تھے مگر لارڈ رپن کی پالیسی سے اس بات کا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں کل ممبر الکشن سے مقرر ہوا کریں گے چونکہ سرسید کی رائے اس کے برخلاف تھی اور اُن کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اُس وقت تک جبکہ ان صوبوں کے لیے قانون بنایا جائے گا کونسل میں ممبر رہیں گے اس لیے انھوں نے اپنی اسپیچ میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں اسی اصول کے موافق دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث نومینیشن سے مقرر ہوا کریں چنانچہ انھیں کی اسپیچ پر لارڈ رپن نے شمالی ہندوستان میں ایک ثلث ممبروں کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رکھا اور دو ثلث کے لیے الکشن کا قاعدہ مقرر کیا۔

یہ اسپیچ سرسید کی اور اسپیچوں اور لکچروں کے ساتھ ایک مجموعہ میں چھپ گئی ہے اس لیے اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اُس کے بعض فقرات ہم اس موقع پر نقل کریں گے جہاں انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کا مفصل ذکر کیا جائے گا۔

لارڈ رپن کے عہد میں جس قدر زمانہ کہ سرسید کے کونسل میں شریک رہنے کا تھا اُس کے پورا ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے اور اُن کے پورا کرنے کے لیے کلکتے جانے میں مدرسہ وغیرہ کے کاموں میں حرج واقع ہوتا تھا اس لیے انھوں نے بذریعہ تار کے کونسل سے استعفا بھیج دیا مگر اُس کے بعد سنہ ۱۸[illegible] میں جب کہ اضلاع شمال مغرب میں کونسل قائم ہوئی ان کو لوکل گورنمنٹ نے اپنی کونسل کے لیے پھر انتخاب کیا اور اس وقت سے لے کر سنہ ۱۸[illegible] تک وہ

برابر اُس میں ممبر رہے۔ آخر پھر اُن کو مدرسہ ہٰذا کے کاروبار کی ضرورت اور نیز ضعیفی کی وجہ سے استعفا دینا پڑا۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں اُن کی ممبری کونسل کی نسبت لکھتے ہیں کہ ،، جب سرجان مسٹلکم کو بورڈ آوف ڈائرکٹرز نے عہدۂ گورنری پر مقرر کیا تو اس تقریب میں گریٹ ڈیوک اوف ولنگٹن نے سرجان مسٹلکم کو ایک ڈنر دیا تھا اس موقع پر جو تقریر یہ ڈیوک نے کی تھی ، اگر اس تقریر میں بجائے انگلستان کے ہندوستان اور بجائے انگریز کے مسلمان کا لفظ بنا دیا جائے تو وہ تقریر سید احمد خاں کے ممبر کونسل ہونے پر خوب چسپاں ہوتی ہے اور وہ فقرہ یہ ہے " ایک ایسا تقرر جیسا کہ یہ ہے عمل کرنے والا ہے۔ انگلستان کے تمام عرض و طول پر ، ادر کم سے کم عمر کا نوجوان انگریز اس میں ایک مثال پاتا ہے جس کی وہ تقلید کرے ۔ اور ایک کامیابی پاتا ہے جس کو وہ حاصل کرے اور ایسے فیلنگز کے جوش سے جو بھلائی ملک کو حاصل ہوتی ہے ۔ اس کی کچھ انتہا نہیں ،،

# ایجوکیشن کمیشن میں شہادت

۱۸۸۲ء میں جب کہ سرسید لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے اُن کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیشن میں لی گئی تھی ۔ اُن کا طولانی اظہار علیگڑھ گزٹ کے متعدد پرچوں میں چھپا ہوا موجود ہے جس سے اُن کا ایک بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

سرسید اول کمیشن مذکور کے ممبر مقرر ہوئے تھے ، مگر جو طریقہ کمیشن کی کارروائی کا تھا وہ اُن کی رائے کے خلاف تھا ، اول تو ممبروں کو کسی کارروائی کی اطلاع

پہلے سے نہیں دیجاتی تھی تمام رزولیوشن دفعتہً پیش کیے جانے تھے اور ممبروں
کو اُن پر کافی غور اور بحث کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ دوسرے جو مباحثہ
ہر ایک رزولیوشن پر ہوتا تھا وہ قلمبند نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے
ایک آدھ اجلاس کے بعد پریسیڈنٹ سے کہا کہ میرے نزدیک ممبروں کو
پہلے سے اطلاع ہونی چاہیے کہ کونسی تاریخ کیا کارروائی ہوگی تاکہ ان کو غور
کرنے کا موقع ملے دوسرے جو مباحثہ کمیشن میں ہو وہ بالکل قلمبند ہونا چاہیے
مگر پریسیڈنٹ نے ان دونوں باتوں کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ موجودہ حالت

---

(لہ حاشیہ بعد متن کے) "سید محمود نے اپنی ممبری کے زمانہ میں ۱۸
رزولیوشن کمیشن میں ایسے پاس کرائے تھے جو خاص مسلمانوں کی
ترقی تعلیم اور بہبودی سے علاقہ رکھتے تھے مگر گورنمنٹ سے اُن کی
نسبت یہ حکم ہوا کہ اُن کے اجرا یا عدم اجرا کا اختیار لوکل گورنمنٹوں
کو ہونا چاہیے جس تجویز کو وہ اپنے صوبہ میں مناسب سمجھیں جاری
کریں اور جس کو مناسب نہ سمجھیں جاری نہ کریں وہ رزولیوشن یہ ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کی تعلیم کی خاص تقویت اور ترقی کا بار لوکل میونسپل اور
پروونشل فنڈوں پر جائز سمجھا جائے۔

۲۔ جو دیسی مدرسے مسلمانوں کے ہیں اُن کو ترغیب دیجائے کہ اپنے ہاں
کی خواندگی میں خاص دنیوی تعلیم میں اضافہ کریں۔

۳۔ مسلمانوں کے پرائمری اسکولوں کے واسطے خاص ہیڈماسٹر مقرر کیے جائیں۔

۴۔ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں سوائے اُن مقامات کے جہاں اسلامی
جماعتیں کسی اور زبان کی خواہش کریں اصل زبان مسلمانوں کی تعلیم

میں بھی کام کی کثرت بہت ہے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو کام بہت بڑھ جائے۔ گا سرسید نے کہا کہ اس صورت میں کمیشن کی شرکت سے مجھکو معاف رکھا جائے، جب لارڈ رپن کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے سرسید سے کہا کہ اگر

---

کے لیے اُردو ہونی چاہیے۔

۵۔ جہاں دفاتر کی زبان اُردو نہیں ہے وہاں بطور اختیاری مضمون کے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو مسلمانوں کے لیے پبلک فنڈ سے قائم ہیں دفاتر کی زبان خواندگی میں پڑھائی جائے اور نیز حساب اور سیاق اسی زبان میں سکھایا جائے۔

۶۔ جن مقامات میں مسلمانوں کی نسبتی تعداد بلحاظ آبادی کے معتدبہ ہے وہاں پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو کہ پبلک فنڈ سے قائم ہیں ایسا انتظام کیا جائے کہ اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم دیجائے۔

۷۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیے خوب اچھی طرح ترغیب عمل میں لائی جائے، کیونکہ یہ ایسی تعلیم ہے جس میں اس جماعت کو خاص مدد کی ضرورت ہے۔

۸۔ جہاں جہاں ضرورت ہو ایک درجہ وار طریقہ خاص اسکالرشپوں کا مسلمانوں کے واسطے جاری کیا جائے جو انعام میں دیے جائیں یعنی (ا) جو پرائمری اسکولوں کی کامیابی پر مڈل اسکولوں میں دیئے جائیں (ب) جو مڈل اسکولوں کی کامیابی پر ہائی اسکولوں میں دیئے جائیں (ج) جو انٹرنس اور ایف اے کے امتحانات کے نتائج پر کالجوں میں دیئے جائیں۔

۹۔ ہر قسم کے اسکولوں میں جو پبلک فنڈ سے قائم ہیں ایک خاص نسبتی

آپ ممبری سے علیحدہ ہوتے ہیں تو سید محمود کو اپنی جگہ ممبری قبول کرنے پر راضی کر دیجیے اور آپ خود کمیشن میں شہادت دیجیے۔ چنانچہ سید محمود[1] اُن کی جگہ مقرر کئے گئے اور سرسید نے شہادت دی۔

---

تعداد وظیفوں کی بالتخصیص مسلمان طلبہ کے لیے رکھی جائے۔

۱۰- جن مقامات میں تعلیمی اوقاف مسلمانوں کے فائدے کے واسطے ہیں اور گورنمنٹ کے زیر انتظام ہیں وہاں اوقاف کی آمدنی صرف مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں صرف ہونی چاہیے۔

۱۱- جہاں مسلمانوں کے اوقاف پرائیویٹ لوگوں یا جماعت کے زیر انتظام ہیں وہاں فیاضی سے گرانٹ ان ایڈ دی جائیں اور (پرائیویٹ لوگوں کو) ترغیب دی جائے کہ گرانٹ ان ایڈ کے قاعدے کے موافق انگریزی تعلیم کے لیے اسکول اور کالج قائم کریں۔

۱۲- جہاں ضرورت ہو نورمل اسکول یا کلاسیں مسلمان معلموں کی تربیت کے لیے قائم کی جائیں۔

۱۳- جن مسلمانی مدرسوں میں (جو اوقاف سے قائم ہیں) اُردو میں درس ہوتا ہو وہاں کوشش کی جائے کہ حتی الامکان مسلمان معلم تعلیم دیں۔

۱۴- افسران معائنہ جو مسلمان ہوں وہ ان پرائمری اسکولوں کا معائنہ جو مسلمانوں کے لیے ہیں موجودہ دستور سے زیادہ کیا کریں۔

۱۵- ترقی تعلیم مسلمانان کے واسطے جو ایسوسی ایشن ہیں، اُن کو تسلیم کیا جائے اور ان کی ہمت بڑھائی جائے۔

۱۶- پبلک انسٹرکشن کی سالانہ رپورٹوں میں ایک خاص باب مسلمانوں کی تعلیم پر ہوا کرے۔

سرسید کے اظہارات میں سے چند دلچسپ جواب جو انھوں نے بعض عام سوالات یا جرح کے سوالات پر کمیشن میں دیے اس مقام پر بطور خلاصہ کے نقل کیے جاتے ہیں تاکہ تعلیم کے متعلق جو اہم سوالات ہیں ان کی نسبت ان کی اصلی رائے جو انھوں نے ہر ایک موقع پر نہایت آزادی سے ظاہر کی ہے ناظرین کو معلوم ہو جائے۔

انھوں نے اس سوال کے متعلق کہ آیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی زبان کے زیادہ مفید ہوگی؛ اس طرح جواب دیا کہ " ان ورنیکلر و انگریزی پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جن کا مقصد طالب علموں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم کے واسطے تیار کرنے کا نہیں ہے۔ مغربی علوم کا جہاں تک کہ وہ ان میں پڑھائے جاتے ہیں ورنیکلر زبان میں پڑھایا جانا بے شک ملک کے حق میں بہتر ہوگا۔ مگر انگریزی ابتدائی اسکولوں میں جو اس غرض سے قائم کیے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے بطور ایک زینہ کے کام دیں ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے یورپین علوم کو پڑھانا تعلیم کو برباد کرنا ہے میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یوروپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سود مند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ مکالے

---

۱۷- لوکل گورنمنٹوں کی توجہ اس نسبت کی طرف مائل کرائی جائے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے لوگوں میں نوکریاں تقسیم کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

۱۸- اصول مذکورۂ بالا جو سفارش میں بیان کیے گئے ہیں وہ دیگر اقوام پر بھی جو حالات مذکورہ میں مسلمانوں کے برابر ہوں، عائد ہوں ۱۲"

کے منٹ ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی تھی کہ انھوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی، اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبانوں کی وساطت سے یورپین علوم کی اشاعت اہل ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں؟ میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی، بہت سے مباحثے بہت سے جلسوں میں کیے، اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضامین لکھے، لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور اسی غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ قائم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا، مگر انجام کار میں اپنی رائے کی غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا۔ مجھ کو ایک مشہور لبرل شخص کے قول کو تسلیم کرنا پڑا جس نے کہا تھا کہ "جو کچھ ہمارے زمانہ کے ہندوستانیوں کو درکار ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، وہ یہ ہے کہ وہ اُس علم و حکمت پر نظر ڈالیں جو اُن کے زمانہ کی اور اُس قومی قوم کی جان ہے اور جو اُس کے نزدیک تمام علوم اور تمام طاقت کا مخزن ہے۔" میں لارڈ ولیم بنٹنک کی اس پالسی کی صحت اور سچائی کو سمجھ گیا کہ "ہندوستان کی قوموں میں یورپ کے علم و حکمت کو ترقی دینا گورنمنٹ کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیے۔"

دو خیال کیا جاتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم خود اُس ملک کی زبان میں نہ آ گیا ہو، مگر اس دلیل میں ایک بڑے جزو کو جسے اُس کی جان کہنا چاہیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ درحقیقت نہایت موزونیت کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم اس زبان میں نہ آ گیا ہو جو اُس ملک پر حکمراں ہے، ہندوستان میں جو زبان حکمراں ہے وہ ورنیکلر نہیں ہے بلکہ انگریزی زبان ہے، اسلیے اس ملک میں ورنیکلر کے ذریعہ سے کسی علم کو ترقی نہیں

ہوسکتی۔ تاریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو۔"

پھر اس سوال پر کہ کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلاف نوعی محفوظ رکھا جاسکتا ہے، اس طرح جواب دیا کہ "تعلیم کی آزادی اور اُس کے اختلاف نوعی کا محفوظ رکھنا اس طریقہ پر منحصر ہے جو کسی ملک کی یونیورسٹی نے مختلف علوم میں ڈگریاں عطا کرنے کے لیے قرار دیا ہو پس ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس ملک کی یونیورسٹیوں نے اس باب میں کیا کیا ہے۔ میں یہاں صرف کلکتہ یونیورسٹی کی نسبت جو اس ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے گفتگو کروں گا۔ یہ یونیورسٹی انجینرنگ میڈیسن اور آرٹس میں ڈگریاں عطا کرتی ہے اور ہر شخص کو اس بات کی بالکل آزادی ہے کہ اُن میں سے جس مضمون کو چاہے اختیار کرے۔ وہ بلاشبہ تعلیم کی آزادی اور اختلاف نوعی کو لوگوں کے حق میں جہاں تک کہ اس کو علم کی ان چار مختلف شاخوں سے تعلق ہے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن آرٹس کا سبجکٹ ایک وسیع سبجکٹ ہے اور آزادی و اختلاف نوعی کو جواب تک اس میں محفوظ نہیں رکھا گیا، یا نہایت محدود کر دیا گیا ہے اُس کا محفوظ رکھنا نہایت ضرور ہے۔ جو کورس آرٹس کے امتحان کے واسطے ہماری یونیورسٹی نے اختیار کیا ہے وہ لندن کی یونیورسٹی کی ایک نامکمل تقلید پر قرار دیا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے گریجویٹ کسی سبجکٹ میں ایک کامل علم حاصل نہیں کرتے ہیں۔ پس میں طریقۂ مروجہ کے برخلاف ہوں۔ مگر چونکہ یہ بحث کمیشن کے احاطۂ تحقیقات سے خارج ہے اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ کو اُس کی نسبت کچھ زیادہ بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں صرف ہز اکسیلنسی وائسرائے کی اسپیچ میں سے جو کلکتہ یونیورسٹی کے پچھلے سالانہ جلسہ میں حضور ممدوح نے ارشاد فرمائی تھی انتخاب مندرجہ ذیل کمیشن کی اطلاع کے واسطے پیش کرتا ہوں "جس بات کی سب سے اول

تعلیم میں ضرورت ہے وہ علم کی تکمیل ہے۔ قوائے عقلیہ کو چیزوں کے کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ بہت سی باتیں بالائی طور پر سیکھی جائیں زیادہ تر عمدہ طور پر تربیت ہوتی ہے۔" اس کے بعد فرمایا کہ "ایک مضمون کو کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ سو علم ناکامل طور پر سیکھے جائیں زیادہ تر اصلی عقلی تربیت حاصل ہوتی ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم میں تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے، اس طرح جواب دیا کہ "اس امر کی نسبت جو میری خاص رائے ہے وہ پبلک فیلنگ کے برخلاف ہے۔ میں نے اس معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کامل کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے کہ جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ملک کے لیے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ مگر پبلک کی رائے اس رائے کی مؤید نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ گورنمنٹ کا اس تعلیم سے علیحدہ ہونا واجب ہو۔ ایک نہایت لائق ہندوستانی نے جس کا میں دل سے ادب کرتا ہوں مجھ سے کہا کہ "یہ خیال کہ ہم کو آپ اپنی تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے بالکل ایک غلط خیال ہے، اور لفظ "اپنے آپ" کا کسی قومی معنوں میں ہندوستان کے باشندوں کی نسبت استعمال کرنا بیجا ہے۔ کوئی قوم بڑا کام نہیں کر سکتی جس میں اعلیٰ اور ادنیٰ تمام فرقوں کے لوگ شریک نہ ہوں۔ ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کا پولیٹکل اور انتظامی اقتدار گورنمنٹ اور اس کے یورپین عہدہ داروں کو حاصل ہے اور جو شخص ہندوستان میں تجارت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں وہ بھی یورپین ہیں اور اس وجہ سے وہ

فی الحقیقت ہندوستان کی آبادی میں سب سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔ مگر جب کبھی ان عہدہ داروں سے کسی کالج یا اسکول کیلیے جو اس ملک میں ہندوستانیوں کے فائدہ کے واسطے قائم کیا جاتے زر نقد کی امداد کی درخواست کی گئی ہے تو وہ علی العموم اس سے اس طرح پر علیحدہ رہے ہیں کہ گویا ان کو اُس سے مطلق کچھ سروکار نہیں تھا۔"

اس کے بعد سرسید نے کہا کہ " اس مقام پر میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خود میرے ساتھ گذرا ہے۔ یعنی جس زمانہ میں کہ محمدن اینگلو اورنٹیل کالج علیگڑھ میں قائم ہوا تو میں نے ایک نہایت معزز یوروپین افسر سے اُس کی امداد کی درخواست کی اس نے جواب دیا کہ " ہم پر اُس کی امداد کرنا کچھ فرض نہیں ہے۔ وہ تمہارا بچہ ہے، ہمیں اس کو دھکا دیدینا چاہیے۔ اگر ہمارا بچہ ہوتا تو ہم البتہ اُس کو والدینی شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے۔ پس پبلک اُپنین کے لحاظ سے میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے واسطے اس بات کا کہنا کچھ آسان نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنی تعلیم کا خرچ اپنے آپ برداشت کرنا چاہیے اگر ہم ہندوستان کی حالت موجودہ پر ذرا غور کریں تو اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اگر لوگ اس قسم کا کوئی ارادہ کریں گے تو اُس میں ایسی بے انتہا مشکلات ہیں جن کے سبب سے اس میں سراسر ناکامی کے ہونے کا اندیشہ ہے۔"

اس کے بعد اسی سوال کے متعلق انھوں نے کہا کہ " اکثر لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ اس ملک میں ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے ........ پس اگر گورنمنٹ موجودہ کالجوں میں سے کسی کالج کو برخاست کرے گی تو گو وہ کیسی ہی واجبی اور معقول دلیل پر کیوں نہ ہو، لوگوں کو یہی خیال ہوگا کہ اس سے گورنمنٹ کا مقصد ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کا ہے۔"

پھر کہا کہ "گو میرے نزدیک مشنری اسکولوں اور کالجوں میں بائیبل پڑھنا کسی طرح پر مذہب اسلام کے برخلاف نہیں ہے، مگر مسلمانوں کی عام فیلنگ بالیقین میری اس رائے کے خلاف ہے اور اگر کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائے گا تو غالباً اُس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ پس گورنمنٹ کو اس باب میں کسی کارروائی کے کرنے سے پہلے پبلک فیلنگ کی اصلی حالت دریافت کرنا مناسب ہے۔"

پھر کہا کہ "جہاں مشنری کالج اور اسکول ہیں اگر وہاں رعایا کا کوئی فرقہ اُن میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا پسند نہ کرتا ہو تو لوگوں کو لازم ہے کہ آپ اپنے لیے علیحدہ اسکول یا کالج قائم کریں اور گورنمنٹ بھی اُن کو بغیر لحاظ اس بات کے کہ وہاں مشنری اسکول یا کالج پہلے سے قائم ہیں اور اس صورت میں اور مدرسوں کی ضرورت نہیں، کسی قدر مدد عطا فرمائے۔ اِس کے علاوہ گورنمنٹ اس بات کی بھی خبر گیری کرے کہ حکام ضلع اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور اپنی حکومت اور رعب داب کو اُن کے برخلاف عمل میں نہ لائیں۔ جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے۔"

پھر اس سوال پر گرانٹ اِن ایڈ کا قاعدہ جو بالفعل مروج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؛ اِس طرح جواب دیا کہ "ایک ہائی اسکول کا اسٹاف جب تک کہ اُس میں ایک یورپین ہیڈ ماسٹر اور اُس کے ماتحت ماسٹر یونیورسٹی کے گریجویٹ اور سکنڈ لینگویج یعنی عربی، فارسی اور سنسکرت کے تین لائق ٹیچر نہ ہوں کافی خیال نہیں کیا جاسکتا۔ اور ایسا اسکول بغیر نو سو روپیہ ماہوار خرچ کے قائم نہیں ہوسکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ قواعد مروجہ کے موافق اس قسم کے مدرسوں میں کس قدر گرانٹ اِن ایڈ دیا جاتا ہے۔ اُن قواعد میں یہ شرط ہے کہ لڑکوں کی

اوسط حاضری پر جو انگریزی پڑھتے ہوں فی طالب علم ڈیڑھ روپیہ ماہوار سے
زیادہ گرانٹ ان ایڈ کا اوسط نہ پھیلے بس ایسے اسکول میں جس کا اوپر ذکر ہوا
جب تک کہ اوسط حاضری انگریزی پڑھنے والوں کی کم سے کم تین سو نہ ہو گورنمنٹ
سے اس قدر گرانٹ ان ایڈ کے ملنے کی بھی توقع نہیں ہو سکتی جو اُس کے
نصف خرچ کے برابر ہو۔ بہ شرط علاً اُس کے مساوی ہے کہ کبھی کوئی شخص
گورنمنٹ سے مناسب گرانٹ کے ملنے کی توقع پر ایک عمدہ ہائی اسکول قائم
کرنے کا قصد نہ کرتے ...... میرے نزدیک گرانٹ ان ایڈ طالب علموں کی تعداد
کے لحاظ سے نہیں بلکہ جو تعلیم دیجائے اُس کی عمدگی کے لحاظ سے تجویز کرنا چاہیے
...... محدود لڑکوں کو ایک عمدہ تعلیم دینا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ بہت سے لڑکوں
کو ناقص تعلیم دیجائے ؂

پھر سوال متعلقہ اسکالر شپ پر اس طرح جواب دیا کہ " میں اسکالر شپوں کے
قاعدہ کا طرفدار ہوں اور اس رائے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ اسکالر شپ دے
کر پڑھانا گویا تعلیم کیلیے رشوت دینا ہے ...... بالتخصیص ہندوستان میں اور
زیادہ تر مسلمانوں کے واسطے اسکالر شپوں کی نہایت ضرورت ہے۔ اسکالر شپوں
سے اُن غریب طلبہ کو جو اپنی حالت کی وجہ سے اپنی تعلیم کسی خاص جماعت سے
آگے جاری نہیں رکھ سکتے نہایت مدد پہنچتی ہے۔ اگلے زمانہ کے مشہور و معروف
شخصوں میں جنھوں نے سائنس کو بڑی ترقی دی ہے، یا اپنی عمدہ تصنیفات
سے لٹریچر کو رونق دی ہے، مسلمانوں اور نیز اور قوموں میں اکثر وہ لوگ تھے
جو غریب اور نہایت مفلس شخصوں کی اولاد میں سے تھے اب بھی اس قسم کے
لوگوں سے بڑی بڑی امیدیں کیجا سکتی ہیں ...... اگر میری معلومات میں غلطی نہ ہو
تو میں خیال کرتا ہوں کہ اب بھی انگلستان میں اُن غریب آدمیوں کے لیے جو

"سیزر" کہلاتے ہیں کوئی طریقہ جاری ہے. مگر اُن کے زیادہ خوش حال اسکول فیلو اُن کو کسی قدر حقیر سمجھتے ہیں. محمڈن کالج علیگڑھ میں بھی مینیجنگ کمیٹی نے اس قسم کے سیزر طالب علموں کی امداد کا ایک طریقہ جاری کیا ہے. لیکن وہ اُس کو ایسے مخفی طور پر امداد کرتی ہے کہ اور طالب علموں کو اس قسم سیزر کے موجود ہونے کی اطلاع نہیں ہوتی اور وہ اُس حقارت سے بچ جاتے ہیں جو اور طرح پر کیجاتی ہے۔"

پھر ایک سوال کے جواب میں کہا کہ "گورنمنٹ کی تعلیم اس اثر کے پیدا کرنے سے اس لیے قاصر رہی ہے کہ مضامین تعلیم بشمار ہیں اور کسی ایک مضمون میں کافی لیاقت نہیں ہوتی...... اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی واقعی عمدہ مصنف یا خیالات کے ہادی پیدا نہیں ہوئے جن کا نام غالباً باقی رہتا. یا جن کا اثر قوم پر پڑتا مورل اور سوشل ترقی کے لیے یہ ایک بڑی مصیبت ہے. اس ملک کے عام لوگوں کی رائے کثرت مضامین تعلیم کے برخلاف ہے، اگر اُس کا مقصد عمیق علم حاصل کرنے کا نہ ہو. ہمارے ہاں ایک فارسی مثل مشہور ہے کہ "نیم حکیم خطرۂ جان و نیم مُلا خطرۂ ایمان" اور میں نے سنا ہے کہ پوپ کا بھی کوئی شعر اسی کے مطابق ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کرسکتی ہے اور اُس کی کامیابی کی کیا توقع ہے؟ مفصل جواب دینے کے بعد کہا کہ "گورنمنٹ عملاً کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کرسکتی جس سے اشراف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے واسطے گورنمنٹ اسکولوں میں بھیجنے پر مائل ہوں اور نہ کوئی ایسا اسکول قائم کرسکتی ہے جو کہ ان لڑکیوں کے مربیوں کی طمانیت کے لائق ہو. ہیں مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ اپنی لڑکیوں

کو ان اسکولوں میں نہیں بھیجتے اور یقیناً کوئی اشراف یوروپین بھی، گو وہ کیسا ہی تعلیم نسواں کا شوقین ہو، مسلمانوں پر ایسا الزام نہیں لگا سکتا بشرطیکہ وہ اس ملک کے مدرسوں کی حالت سے واقف ...... جس حیثیت اور وقعت کے مدارس نسوان ہندوستان میں ہیں اگر ایسے مدرسے انگلستان میں فرض کیے جائیں تو کیا اشراف خاندانوں کے انگریز اپنی لڑکیوں کو اُن مدرسوں میں تعلیم کے لیے بھیجنا پسند کریں گے؟ ہرگز نہیں... عورتوں کی تعلیم کا معاملہ اُس فلاسفر کے سوال سے نہایت مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا؟ جن شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیے وہ غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اُس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں عائلی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست کے جانب کافی توجہ کرے۔ جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اُس کا ضرور بالضرور ایک زبردست گو خفیہ اثر پہنچے گا۔ تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ مند عورتوں کی تعلیم کے خواہشمند ہوں گے ...... اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص میں اُس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیہ اور محنت ضائع جائے گی۔"

مسٹر پیرسن نے سوال کیا کہ "آیا ہندوستان کے مزدوری پیشہ لوگ اس

بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو تعلیم سرکاری مدرسوں میں دی جاتی ہے وہ اُن کے بچوں کے لیے مناسب ہے یا نہیں ؛ سرسید نے اس کے جواب میں کہا کہ " اُن کو اس قسم کے سوال پر غور کرنے کی فرصت نہیں ۔"

پھر انھوں نے یہ سوال کیا کہ " تعلیم کی ترغیب کے لیے ایجوکیشنل درباروں کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے ؛ سرسید نے کہا کہ " یہ دربار بجز نمائش کے اور کچھ نہیں ۔"

مسٹر وارڈ نے سوال کیا کہ " کیا آپ کوئی ایسا یورپین اسٹیشن ہندوستان میں بتا سکتے ہیں جہاں اہلِ یورپ کسی مشن اسکول یا اور پرائیویٹ اسکول کے مصارف کے واسطے جو ہندوستانیوں کے لیے ہو، کنٹری بیوشن یعنی چندہ دیتے ہوں ؛ سرسید نے اس کا یہ جواب دیا کہ " یہ سوال پیچیدہ ہے ...... اس سے متضمناً یہ تسلیم کر لینا نکلتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک یورپین اسٹیشن میں انگریز ہندوستان کی تعلیم کے لیے کنٹری بیوشن دیتے ہیں ۔ میں اس ضمنی تسلیم کو جو سوال سے نکلتی ہے تسلیم نہیں کرتا ۔ باقی سوال دو جداگانہ امور سے متعلق ہے ۔ اول مشنری اسکولوں سے ۔ سواس کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے یورپین سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی مشنری اسکول کنٹری بیوشن کے ذریعہ سے مقرر ہوا ہو اور انگریز اس کی مدد نہ کرتے ہوں ۔ دوسرے یہ سوال پرائیویٹ اسکولوں سے متعلق ہے ۔ اس حصہ سوال کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے اسٹیشن سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی ہندوستانی اسکول قائم ہوا ہو اور اس کی امداد انگریز بذریعۂ کنٹری بیوشن کے کرتے ہوں ، سوائے محمڈن کالج علیگڑھ کے جس میں فی الحال صرف ایک کنٹری بیوشن یورپین کی طرف سے مقرر ہے ...... " اس کے بعد لارڈ نارتھ بیروک ، لارڈ لٹن اور دیگر جلیل القدر حکام اور ارکان سلطنت

کے عطیات کی شکر گذاری کے بعد کہا کہ " مگر اسٹیشن کے یورپین عہدہ داروں میں سے کسی نے ہمارے کالج کو کوئی ماہواری یا سالانہ کنٹری بیوشن اور سوا ئے ایک کے کسی نے اس کو یکمشت چندہ بھی نہیں دیا "

مسٹر وارڈ نے سوال کیا کہ " محمڈن کالج کے پروسپکٹس میں کیا فی الواقع اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ صرف مسلمانوں پر چندہ کا محدود رکھنا مناسب ہے؛ اس کا جواب سر سید نے اس طرح پر دیا کہ " کمیٹی نے تجویز کی تھی کہ انگریزی قوم سے جو ہمارے حاکم ہیں اس کام میں شریک ہونے کی درخواست کی جائے کیونکہ کمیٹی کے نزدیک ایسے کالج کو قائم کرنا جو انگریزوں کی ہمدردی سے جدا ہو پولٹکل مصلحت کے برخلاف تھا پس اس نے یہ تجویز کی تھی کہ مسلمان انگریزوں سے بھی امداد کی درخواست کریں "

پھر مسٹر وارڈ نے پوچھا کہ " کیا فی الواقع سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کے قائم کرنے میں انگریزوں نے روپئے اور ہمدردی کے لحاظ سے آپ کی بڑی مدد کی تھی؛ اس کا جواب سر سید نے یہ دیا کہ " سوائے مسٹر برایلی کے جنھوں نے مجھ کو ایک ہزار روپیہ دیے تھے اور کسی سے مجھے کچھ مدد نہیں ملی مگر انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے تعلیم کی جانب توجہ نہیں کی تھی۔ "

# محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن

۱۸۸۳ء میں سر سید نے " محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسیئیشن " قائم کی۔ اول اُن کو ۱۸۶۸ء میں جب کہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے چند سال گذرے تھے یہ خیال ہوا تھا کہ عام ہندوستانیوں کو خواہ ہندو ہوں اور خواہ مسلمان، تعلیم کی

غرض سے یورپ کے سفر پر آمادہ کرنے کے لیے ایک ایسوسیئشن قائم کی جائے اور اس کے ممبر دو روپیہ ماہوار چندہ دیا کریں جو بطور ایک فنڈ کے یورپ کے سفر کے لیے جمع ہوتا رہے۔ مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندو اس وقت یورپ کے سفر کو مذہب اور ذات کے قواعد کے برخلاف جانتے تھے اور مسلمان بھی اسی قسم کے توہمات رکھتے تھے اس کے سوا یورپ کا سفر اس زمانہ میں مشکل بھی معلوم ہوتا تھا۔ مگر ۱۸۸۳ء میں یورپ کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا اور ہندوستانیوں کے لڑکے تعلیم کے لیے ولایت جانے لگے تھے۔ لیکن خاصکر مسلمانوں کے لیے حالت موجودہ میں سول سروس کا امتحان ولایت جا کر پاس کرنا جیسا کہ سرسید نے علیگڑھ گزٹ مورخہ ۱۱۔ اگست ۱۸۸۳ء میں مفصل بیان کیا ہے ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ کسی قوم کی جب تک کہ وہ گورنمنٹ میں کچھ حصہ نہ رکھتی ہو، عزت نہیں ہوسکتی۔ دولتمند مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کو اپنی اولاد کی تعلیم کا مطلق خیال نہیں اس وقت سول سروس کے قاعدہ کے موافق ۱۹ برس کی عمر میں ولایت جا کر سول سروس کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا، حالانکہ امرا کے لڑکے ۱۹ برس کی عمر تک بچے سمجھے جاتے تھے اور سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بقول سرسید کے اس وقت تک تعویذوں کی ہیکل بھی ان کے گلے سے نہیں اترتی ہاں متوسط درجہ کے لوگوں کو بلاشک اولاد کی تعلیم کا خیال تھا اور خیال ہے مگر ولایت کے سفر کا پورا خرچ وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے سرسید نے ایسوسی ایشن خاص مسلمانوں کے لیے اس غرض سے قائم کی کہ اگر کم سے کم پانسو مسلمان ممبر دو دو روپیہ ماہوار دینے والے پیدا ہو جائیں تو اس سے ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو جائے گی جو بطور فنڈ کے جمع ہوتی رہے گی تاکہ جن

مسلمانوں کے لڑکے ولایت کا تمام خرچ اپنے پاس سے ادا نہیں کر سکتے اُن کی اس فنڈ سے امداد کیجائے اور مدرستہ العلوم میں ایک خاص کلاس قائم کی جس کی تعلیم کا طریقہ ایسا مقرر کیا گیا تھا جس سے اُس کلاس کے طالب علموں کو ولایت پہنچ کر سول سروس کے امتحان میں مدد ملے۔

اگرچہ اس کلاس کا نام سول سروس کلاس رکھا گیا مگر درحقیقت اُس کے طالب علموں کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا تھا کہ وہ انگلستان پہنچ کر مندرجہ ذیل کورسوں میں سے کوئی کورس اختیار کریں:

۱۔ سول سروس کا امتحان مقابلہ۔
۲۔ کسی مضمون میں ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنی۔
۳۔ کسی پیشہ میں مثل بیرسٹری، ڈاکٹری یا انجنیری کے ڈپلومہ حاصل کرنا۔

پھر اس ایسوسی ایشن کے کام کو زیادہ وسعت دینے کے لیے انھوں نے شمالی ہندوستان کے ہر ایک ضلع میں سب کمیٹیاں قائم کرنے کا ارادہ کیا تاکہ ممبروں کی تعداد زیادہ ہو اور سب کمیٹیوں کے لیے قواعد مقرر کر کے شائع کیے۔ مگر اس تمام کوشش کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ ایسوسئیشن میں ۲۹۹ ممبر شامل ہوئے جو کچھ عرصہ تک دو روپیہ ماہوار دیتے رہے اور کچھ لوگوں نے بطور ڈونیشن کے بھی کسی قدر روپیہ دیا آخر سب کے ارادے سست ہو گئے اور جیسا کہ ماہواری یا سالانہ چندوں کا ہمیشہ انجام ہوتا ہے، رفتہ رفتہ چندہ دینا بند ہو گیا

ایسوسئیشن مذکورہ کی آمدنی سے چار ہزار ایک روپیہ جمع ہوا تھا جس کو ممبروں کی منظوری سے سرسید نے الٰہ آباد بینک میں جمع کرا دیا تھا تاکہ جس کام کے لیے وہ جمع کیا گیا تھا جب اُس کا موقع آنے وہاں خرچ کیا جائے اور اُس وقت تک اس کے منافع سے محمڈن کالج علیگڑھ کے طلبہ کو امداد دی جائے۔

# محمڈن ایسوسی ایشن علیگڑھ

اسی سنہ ۸۲ء میں سر سید نے بہ شرکت رئیسان ضلع علیگڑھ محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی جس کے مقاصد نہایت عمدہ تھے اور اس کا چلنا بھی ایسا دشوار نہ تھا جیسا کہ سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا چلنا اور قائم رہنا دشوار تھا کیونکہ اُس کے مقاصد رؤسائے ضلع کے مذاق کے موافق تھے، مگر چونکہ سر سید مدرسہ کے کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اُس کے پیرو کار نہ تھے اس لیے وہ چند روز کے بعد بالکل مدھم پڑ گئی اور اب اُس کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔

# محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کرنا

۱۸۸۶ء میں سر سید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی محمڈن کالج کی حالت جب کسی قدر اطمینان کے قابل ہو گئی تو سر سید کو یہ خیال ہوا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہو گیا تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں۔ ہر حصہ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں اُن میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اسی بنا پر جیسا کہ سر سید

نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا یہ کانفرنس قائم کی گئی اور اس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علیگڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں منعقد ہوا۔

اِس کانفرنس کے مقاصد اولاً حسب ذیل قرار دیئے گئے تھے:

۱۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں اُن میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اُس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

۳۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جا بجا بطور خود دیتے ہیں۔ اُس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔

۴۔ جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اُس کے حالات کی تفتیش کرنا اور اُن میں جو تنزل ہو گیا ہے اُس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے اُن کے حالات کی تفتیش کرنا اور اُن کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

مذکورۂ بالا مقاصد کے سرانجام کرنے کے لیے دو طریقے تجویز کیے گئے تھے۔ ایک یہ کہ ہر سال کسی مناسب مقام پر جہاں کے ممتاز آدمی کانفرنس کے اجلاس کی خواہش کریں اور کانفرنس کا انتظام اپنے ذمہ لیں، کانفرنس کا اجلاس ہوا کرے اور اجلاس کی تاریخوں میں کانفرنس کے ممبر جو تجویزیں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے متعلق مناسب سمجھیں وہ اجلاس میں پیش کریں اور بعد غور اور مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے سے اُن کی منظوری یا نامنظوری عمل میں آئے، دوسرے جہاں تک ممکن ہو ہر شہر و

قصبہ میں کانفرنس کے مقاصد کے لیے کمیٹیاں قائم کیجائیں اور جہاں جہاں اسلامی انجمنیں قائم ہیں اگر وہ منظور کریں تو انھیں کو کانفرنس کی کمیٹیاں تصور کیا جائے تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے نواح یا ضلع یا شہر یا قصبہ کی نسبت وقتاً فوقتاً ہر قسم کے مدارس اور مکاتب وصنعت وحرفت وتجارت وزراعت وغیرہ کی ترقی وتنزل کے حالات جو مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں تحریر کرکے کانفرنس کے جلسوں میں بھیجتے رہیں اور جو تجویزیں کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں منظور ہوں ان میں سے جو تجویز ان کے علاقہ میں قابل اجرا ہو اُس کے جاری کرنے میں کوشش کریں۔

۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۶ء تک اُس کے سالانہ جلسے برابر مختلف شہروں میں ہوتے رہے مگر سال گذشتہ میں کچھ تو سرکاری روک ٹوک کے سبب جو طاعون کے انسداد کے لیے ریل کے مسافروں کے ساتھ جابجا کی جاتی تھی، اور زیادہ تر سرسیّد کی افسردہ دلی اور انقباض کی وجہ سے جس کی نوبت آخر کو مرض الموت تک پہنچ گئی اُس کا اجلاس موقوف کیا گیا۔ منجملہ گیارہ کے اول کے پانچ اجلاسوں میں پنجاب اور شمال مغربی اضلاع کے مختلف مقامات کی چھوٹی بڑی ۳۵ رپوٹیں اسلامی انجمنوں اور خاص خاص شخصوں نے لکھ کر کانفرنس میں بھیجیں یا خود آکر پیش کیں اس کے بعد ظاہرا پھر کوئی رپورٹ نہیں آئی اور تقریباً اسی رزولیوشن اتفاق یا کثرت رائے سے پاس ہوئے۔

ہر سال اجلاس کی تمام کارروائی ایک کتاب کی صورت میں چھپکر ممبروں کو تقسیم ہوتی رہی جس میں کیفیت انتظام کانفرنس، فہرست ممبران ووزیٹران، تعداد زرچندہ رپورٹ سکرٹری متضمن حساب جمع وخرچ زرچندہ وکیفیت تعمیل وعدم تعمیل تجویزات سال گذشتہ، رزولیوشن جو اجلاس میں پیش ہوکر پاس ہوئے اور ان کے متعلق ممبروں کی اسپیچیں اور مباحثے، رپورٹیں جو مختلف اضلاع سے موصول

ہوئیں، لکچر اور نظمیں جو کانفرنس میں پڑھی گئیں وغیرہ وغیرہ درج ہوتی تھیں۔

اس اجتماع کا نتیجہ براہ راست یہ ہونا چاہیے تھا کہ جو تجویزیں کانفرنس کے اجلاس میں ہر سال منظور ہو کر شائع ہوئیں اُن کے موافق ہر ضلع کی اسلامی انجمنیں اپنی اپنی بستیوں اور شہروں میں عمل درآمد کرتیں۔ جو تعلیمیں کانفرنس کے سیکرٹری سے تعلق رکھتی تھیں اُن کو سیکرٹری انجام دیتا اور عام مسلمان جہاں تک اُن کے قبضۂ اختیار میں تھا، کانفرنس کی تجویزوں کی تائید اور کانفرنس کی صلاح کے موافق اپنی اولاد کی ترقی تعلیم کا انتظام کرتے، کیونکہ کانفرنس اس کے سوا اور کچھ اختیار نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کو اُن کی واقعی حالت سے اور جو تدبیر اُن کی بھلائی کے لیے مناسب سمجھے اُس سے آگاہ کر دے۔

لیکن سوا اس کے کہ سرسید نے جو ابتدا سے اخیر دم تک سیکرٹری رہے اپنے فرائض کا پورا پورا حق ادا کیا اور انھیں کی توجہ اور کوشش سے کانفرنس کے اجلاس برابر گیارہ برس تک ترقی روز افزوں کے ساتھ ہوتے رہے، اُس کی تجویزوں پر بہت ہی کم عمل درآمد ہوا۔ سرسید ہر سال جہاں کانفرنس ہوتی تھی وہاں اجلاس کی تاریخوں سے کئی کئی دن پہلے خود پہنچتے تھے، وہاں کی لوکل کمیٹی کو ہر قسم کے انتظام میں مدد دیتے تھے۔ انھیں کی صلاح اور مشورے سے اجلاس کے لیے اکثر ہال کی تیاری اور ممبروں کی آسائش کا بندوبست ہوتا تھا، وہ خود کانفرنس کی کارروائی کے قواعد اور پروگرام بتلاتے تھے، ٹکٹ چھپواتے تھے، رزولیوشن انتخاب کرتے تھے، سال گذشتہ کا حساب اور تعلیمات کی رپورٹ کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے تیار کرتے تھے۔ کانفرنس کے اجلاس کے بعد تمام کارروائی کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرتے تھے، اُس کو چھپوا کر تمام ممبروں کے پاس بھیجتے تھے۔ منیجنگ کمیٹی جو ہر سال کانفرنس کا مقام تجویز کرنے کے لیے

مقرر ہوئی تھی، اس سے خط و کتابت کرتے تھے۔ سال بھر میں کانفرنس کے متعلق وقتاً فوقتاً اخبار میں آرٹیکل چھاپتے تھے اور جب کانفرنس کا اجلاس علیگڑھ میں ہوتا (اور زیادہ تر علیگڑھ ہی میں ہوتا تھا)، تو لوکل کمیٹی کے تمام فرائض خود انجام دیتے تھے۔ انھوں نے صرف اس غرض سے کہ ہر ایک ضلع کی رپورٹ باقاعدہ مرتب ہوکر آیا کرے، دوسرے سال کے اجلاس میں ضلع علیگڑھ کی مفصل رپورٹ بطور نمونہ کے لکھنؤ میں خود لکھ کر پیش کی تھی۔ جن رزولیوشنوں کی تعمیل بحیثیت سیکرٹری ہونے کے اُن کی ذات سے متعلق ہوتی رہی انھوں نے برابر اس کی تعمیل کی، کبھی کسی لوکل گورنمنٹ سے کبھی سررشتۂ تعلیم سے اور کبھی یونیورسٹی کے رجسٹرار سے اُن کو خط و کتابت کرنی پڑتی تھی اور تمام خط و کتابت کا خلاصہ اور اس کا نتیجہ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پیش کرنا ہوتا تھا، باوجود ان تمام باتوں کے وہ خود بھی اور ممبروں کی طرح اکثر رزولیوشن پیش کرتے اور ان پر لمبی لمبی اسپیچیں دیتے تھے۔ اس کے سوا اور بھی بہت سے کام کانفرنس کے متعلق اُن کو انجام دینے پڑتے تھے جیسا کہ کانفرنس کے گذشتہ جلسوں کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کانفرنس کے اجلاس ہوئے وہاں کی لوکل کمیٹیوں نے بھی چندہ کی فراہمی اور ممبروں کی مدارات اور اُن کی آسائش و خورد و نوش کا انتظام نہایت فیاضی اور کوشش و جانفشانی سے کیا مگر جہاں کانفرنس کا جلسہ ختم ہوا پھر سال بھر تک کسی کو اس کا خیال تک نہیں آتا تھا۔

کانفرنس میں بہت سے رزولیوشن ایسے پاس ہوئے ہیں کہ اگر اُن کے موافق عمل درآمد ہوتا تو قوم کو بہت فائدہ پہنچنے کی امید تھی، مثلاً قرآن مجید کی تعلیم کو ترقی دینا، مسلمانوں کے اوقات کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلانا، تمام شہروں

اور قصبوں میں مقاصد کانفرنس کی تائید کے لیے کمیٹیاں قائم کرنا اور اسلامی
انجمنوں سے اُس کی تائید کی خواہش کرنا۔ تمام اسلامی
انجمنوں کا اس باب میں کوشش کرنا کہ مسلمان طلبہ کی وظیفوں سے امداد کی جائے
سرکاری مدرسوں میں مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کا موقع دینے کی گورنمنٹ سے درخواست
کرنا۔ تعلیم نسواں کے لیے مذہب اسلام اور طریقۂ شرفائے اہل اسلام کے موافق
مدرسے جاری کرنے، یورپ کے مورخوں نے جو غلط الزام مسلمانوں پر لگائے
ہیں اُن کی غلطیاں دور کرنے کے لیے رسائل لکھے جانے، مسلمان بادشاہوں کے
قدیم فرامین جمع کر کے اُن کو محفوظ رکھنے کے لیے چھپوانا صاف اور سلیس اردو میں
خلاقی رسالے اور کتابیں لکھنا جو لڑکوں کی تعلیم میں کام آسکیں، مسلمانوں کی قدیم
در مستند کتابوں کا جو کہ اب نادر الوجود ہیں، پتا لگانا اور تا بقدور اُن کو بہم پہنچانا
س بات کی تحقیقات کرنا کہ جو علوم مسلمانوں نے یونان وغیرہ ملکوں سے
اصل کیے تھے اُن پر کس قدر اضافہ انھوں نے خود کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ مگر افسوس
ہے کہ اُن میں سے کسی تجویز پر الاماشاء اللہ کوئی معتد بہ توجہ قوم یا قومی انجمنوں کی طرف سے نہیں ہوئی
با اینہمہ کانفرنس سے جو نتائج بالذات یا بالغرض پیدا ہوئے وہ بھی اُمید
اور توقع سے زیادہ تھے۔ سب سے بڑا فائدہ جو اس مجلس کے انعقاد سے ہوا وہ
یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں
ہزار ہزار سے متجاوز ہو گئی، نہ کسی سیر اور تماشے کی غرض سے۔ نہ کسی حاکم کے
حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لیے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی
بھلائی کے ارادے سے ہوتا ہے اُس میں شریک ہوں، دور دراز سفر کی تکلیف اور
آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے
تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ایک جگہ کھانا کھاتے تھے۔ ایک جگہ

رہتے تھے۔ قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔ ہنستے تھے، بولتے تھے انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا، دوستوں میں خلوص بڑھتا تھا، اور اس طرح ایک مردہ اور پراگندہ قوم کے اجزا میں روز بروز التیام پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اس کے سوا جب سے کانفرنس قائم ہوئی مسلمانوں میں علی العموم تعلیم کا خیال زیادہ ہوگیا خصوصاً جس شہر میں کانفرنس کا اجلاس ہوتا تھا وہاں کے باشندوں پر بالخصوص اس کا اور بھی زیادہ اثر پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ صرف کانفرنس کی بدولت گذشتہ برسوں میں غریب مسلمان طلبہ کی امداد بہت زیادہ ہوتی رہی۔ کئی سال تک خود کانفرنس کے چندہ میں سے بعد منہائی اخراجات کے جس قدر روپیہ بچا وہ وظائف میں صرف ہوتا رہا۔ نیز پنجاب کی اکثر اسلامی انجمنوں نے کانفرنس کی صلاح سے بہت سے طالب علموں کی امداد کی۔ کانفرنس ہی کی تحریک یا اقتضا سے بہت سے عمدہ اور نہایت عمدہ رسالے، مضامین، اور لکچر ایسے تیار ہو گئے جن سے اُردو لٹریچر میں ایک معقول اضافہ ہُوا ہے جیسے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم الجزیہ بمضمون کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین، مسلمانوں کی ترقی وتنزل کے اسباب الوریحان بیرونی کی لائف، کتاب کلیلہ ودمنہ کے تاریخی حالات اشاعت اسلام بلا استعانت حسام، شمس العلما مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک اور آنریبل سید محمود کے لکچر اور اسپیچیں وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور ضمنی فائدہ کانفرنس سے یہ ہوا کہ پبلک سپیکنگ کی لیاقت میں کانفرنس کے مباحثوں سے بہت ترقی ہوگئی جن لوگوں کی طبیعت میں اس کی خداداد قابلیت موجود تھی، مگر اُس کے ظاہر ہونے کا کوئی موقع نہ تھا ان کو کانفرنس میں گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا اور اُن کا ایک مخفی جوہر ظاہر ہوتا تھا اور چونکہ ممبروں کی تمام اسپیچیں کانفرنس کی روئداد میں ہر سال چھپتی تھیں اس سے اُردو لٹریچر میں

ایک مفید اور بکار آمد اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اسی کانفرنس کی تحریک سے الہ آباد یونیورسٹی نے "کاکس ہسٹری"، کو جس میں مسلمانوں کی توہین کے مضامین مندرج تھے، ہائی اسکولوں کے کورس سے خارج کیا اور جب کہ یونیورسٹی میں نہایت زور شور سے اس بات کی تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کی تعلیم سے خارج کیجائے تو اسی کانفرنس کے ذریعہ سے یونیورسٹی کو مسلمانوں کی ایک با وقعت جماعت کے خیالات سے مطلع ہونے کا موقع ملا اور اس کو معلوم ہوگیا کہ فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کی جائے گی تو اُس سے مسلمانوں کی دل شکنی ہی نہ ہوگی بلکہ ہندوستان کی تہذیب، اُس کے علم مجلس اور اُس کی ملکی زبان یعنی اردو کو سخت صدمہ پہنچے گا نیز کانفرنس ہی کی تجویز کے موافق نواب وقار الملک کو گورنمنٹ میں اس بات کی تحریک کرنے کی جرأت ہوئی کہ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ گورنمنٹ اضلاع شمالی مغرب نے بعض شرائط پر اُسکی اجازت دیدی جس کا شکریہ گیارھویں اجلاس میں ادا کیا گیا۔

سب سے عمدہ اور نتیجہ خیز تجویز جو کانفرنس کے اجلاس واقع ۱۸۹۲ء میں بمقام دہلی مسٹر تھیوڈر بک پرنسپل علیگڑھ محمڈن کالج نے پیش کی تھی وہ تعلیمی مردم شماری کی تجویز تھی، یعنی یہ کہ ہندوستان میں جو مسلمان اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم نہیں دلواتے اُن کا اندازہ کیا جائے کہ وہ کس قدر ہیں؛ اور کیوں وہ اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلواتے؟ آیا مذہبی خیالات سے، یا اس وجہ سے کہ تعلیم کے اخراجات کا مقدور نہیں رکھتے، یا محض اپنی بے پروائی اور سہل انگاری کے سبب؟ اور جن کی نسبت تیسری وجہ معلوم ہو اُن کو اولاد کی تعلیم پر متوجہ کیا جائے، ان سے اس غرض کے لیے خط و کتابت کی جائے اور ان کے سمجھانے کے لیے لائق آدمی بھیجے جائیں۔ چنانچہ اس تجویز میں مسٹر بک کی توجہ سے بہت

کامیابی ہوئی ہے اور اگر اسی طرح کوشش برابر جاری رہے تو اُس سے عمدہ نتیجے پیدا ہونے کی اُمید ہے۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں جو کانفرنس کے نتائج میں شمار ہو سکتے ہیں مگر ایسے مجمعوں کے مفید یا غیر مفید ہونے کا اندازہ اِن باتوں سے نہیں ہوتا بلکہ صرف اس بات سے ہوتا ہے کہ قوم اُس کو برابر ترقی رہنا فزوں کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے یا نہیں! اگر قوم میں اُس کے تھامنے اور ترقی دینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے تو اُس کی نسبت نہایت وثوق کے ساتھ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی قوم میں جان ڈالنے والی اور اُن کو قومیت کے درجہ تک پہنچانے والی ہوگی۔ لیکن اگر اُس کا مدار کسی خاص شخص کی ذات پر ہو تو اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ کیونکہ اس قسم کے سالانہ جلسوں کے نتائج اُن ملکوں میں بھی جو صدیوں سے اُن کے عادی چلے آتے ہیں اور ان سے بے شمار فائدے اٹھا چکے ہیں، مدت دراز کے بعد ظہور میں آتے ہیں پس ہندوستان جیسے ملک میں جہاں محض یورپ کی تقلید سے ایسی مجلسیں انعقاد پاتی ہیں جہاں نہ قومی بندش ہے نہ عملی طاقت اور جہاں قومی مجلسیں پبلک پر کسی قسم کا رعب و داب نہیں رکھتیں یہ امید رکھنی فضول ہے کہ کوئی کانفرنس یا کانگرس قوم کو چند سال میں کوئی معتدبہ فائدہ پہنچا سکے جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس نے آج تک کوئی کار نمایاں نہیں کیا وہ گویا اس کو کمہار کا آوا سمجھتے ہیں جس میں برتن بہت جلد پک کر تیار ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ کمہار کا آوا نہیں بلکہ چینی کا خمیر ہے جس کے تیار ہونے کا سالہا سال تک انتظار کرنا چاہیے۔

اگرچہ سال گذشتہ میں جو سرسید کی افسردہ دلی کے سبب کانفرنس

کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا اس سے بہت بڑی مایوسی ہوگئی تھی اور لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سرسید کے بعد کانفرنس کا قائم رہنا مشکل ہے لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوش مسلمانوں میں اٹھا ہے اُس سے کانفرنس میں پھر جان پڑتی نظر آتی ہے۔ نواب محسن الملک نے سرسید کی زندگی ہی میں کئی سال سے کانفرنس کی ترقی پر کوشش کرنی شروع کر دی تھی خصوصاً ۱۸۹۶ء میں جیسا کہ گیارھویں اجلاس کی رپورٹ میں مفصل مذکور ہے جو کوشش اور جانفشانی اُنھوں نے کانفرنس کی اصلاح اور ترقی میں کی وہ گذشتہ دس سال میں کبھی کسی سے بن نہیں آئی تھی اور اب بھی جس سرگرمی کے ساتھ کہ وہ محمڈن کالج کی ترقی پر متوجہ ہوئے ہیں اُسی طرح اُنھوں نے کانفرنس کی طرف توجہ کی ہے چنانچہ اس سال زندہ دلانِ پنجاب نے کانفرنس کو لاہور میں مدعو کیا ہے جس سے اس بات کی امید بندھتی ہے کہ مسلمان اس قومی میلے کو ہمیشہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

## پبلک سروس کمیشن کی ممبری

۱۸۸۷ء میں سرسید کو لارڈ ڈفرن نے سول سروس کمیشن کی ممبری کے لیے انتخاب کیا۔ اس کمیشن میں سرسید کے سوا کوئی ہندوستانی ممبر ایسا نہ تھا جو انگریزی کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت نہ رکھتا ہو۔ صرف سرسید ہی ایک ایسے ممبر تھے جو انگریزی میں سوا اس کے کہ اپنا نام لکھ سکتے تھے یا بقدرِ ضرورت انگریزی سمجھ سکتے تھے، اور ٹوٹی پھوٹی میں معمولی بات چیت کر سکتے تھے، اور کچھ نہ جانتے تھے۔ باوجود اس کے، جیسا کہ سنا گیا ہے۔ ممبری کمیشن کے فرائض انھوں نے نہایت عمدگی سے ادا کیے جس طرح وائسریگل کونسل کی ممبری میں انھوں نے ہر ایک قانون پر جو ان کی موجودگی میں پیش ہوا بڑی بڑی لیگل اسپیچیں کیں اور قانونی لیاقت کا بہت بڑا ثبوت دیا اسی طرح سول سروس کمیشن میں تمام سوالات کے زیر

بحث نے نہایت قابلیت کے ساتھ بحث کی۔

افسوس ہے کہ کمیشن مذکور کی رپورٹ میں ممبروں کے مباحثے اور انکی اسپیچیں جن سے ہر ایک سوال کے متعلق ہر ایک ممبر کی رائے معلوم ہو، بالکل درج نہیں کی گئیں اور اس لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات کا ایسا نہیں جس سے سرسید کی کارگزاری اور ان کی رایوں کا، جو کمیشن میں اُنھوں نے ظاہر کیں سُراغ لگ سکے۔ صرف ایک خط سرسید کا جو راقم کے خط کے جواب میں انھوں نے اسی امر کے متعلق لکھا تھا موجود ہے، اُس میں سے چند سطریں جو اس مقام کے مناسب ہیں نقل کی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

"سول سروس کمیشن کا حال دریافت کرنے کے لیے جو آپ رپورٹ طلب کرتے ہیں اُس سے آپ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اُس میں بجز اس کے کثرت رائے فلاں امر کی طرف ہوئی اور کچھ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اُن ممبروں کا جن کی رائے مخالف یا موافق تھی، نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اگر آپ کو میری نسبت کچھ لکھنا ہے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن میں میں اس بات پر ساعی تھا کہ سٹیٹیوٹری سول سروس جو جاری ہے اور جس سے ہندوستانیوں کا انتخاب یوروپین کے عہدوں پر ہوتا ہے وہ منسوخ نہ ہو، اور جو قواعد اُس کی نسبت گورنمنٹ سے جاری ہوئے ہیں اگر ضرورت ہو تو اُن میں کچھ اصلاح کی جائے۔ کثرت رائے اس کے برخلاف تھی اور وہ چاہتے تھے کہ قانون مذکور منسوخ ہو اور اُس کی جگہ دوسرا قانون پارلیمنٹ سے جاری ہو اور اُس میں جدید قواعد مرتب کیے جائیں۔ اسی کثرت رائے کے مطابق یہاں سے رپورٹ گئی۔ مگر ولایت

ہیں یہ تجویز ہوئی کہ سٹیٹیوٹری سول سروس کے قانون کو منسوخ
کرنا ضروری نہیں اور جدید قانون کے بھی جاری کرنے کی حاجت
نہیں مگر ولایت سے اسی تجویز کے مطابق جو کہ کثرت رائے سے
جدید قانون بنانے کے لیے لکھی گئی تھی، کچھ قواعد بن کر آئے
جن کے بموجب اب عمل درآمد ہے اور جن کو میں پسند نہیں کرتا۔
زیادہ تفصیل اس کی بغیر آپ کی ملاقات کے بیان نہیں ہو سکتی۔"

سرسید کا یہ خط ۲۲، نومبر ۹۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس خط کے آنے کے بعد کئی دفعہ اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر اس خیال سے کہ جب کمیشن مذکور کی ممبری کا حال لکھنے کا وقت آئے گا اُس وقت اُس کی مفصل کیفیت دریافت کر لی جائے گی، اُن سے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی گئی۔ کیا خبر تھی کہ جب پوچھنے کا وقت ہوگا تو اس وقت وہ دنیا میں نہ ہوں گے۔ لاچار اسی مختصر بیان پہ اکتفا کیا گیا۔

## انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت

سرسید کی لائف میں کانگرس کی مخالفت کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا اثر ہندوستان سے لے کر انگلستان تک ایک نہایت تعجب انگیز صورت میں اور مختلف قوموں پہ مختلف طور سے ظاہر ہوا ہے۔ اس لیے ہم اس واقعہ کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

مئی ۱۸۸۴ء میں بابو سرندرو ناتھ بینرجی نے ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس غرض سے دورہ کیا تھا کہ ہندوستان کی تعلیم یافتہ جماعتوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ سول سروس کے امیدواروں کی عمر جو ۲۱

برس سے گھٹا کر ۱۹ برس کی قرار دی گئی ہے اُس کی گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ۲۱ کی عمر کا قاعدہ جو امتحان مذکور کے لیے پہلے مقرر تھا وہی اب پھر جاری کیا جائے اور تمام ہندوستانی مل کر ایک فنڈ بنام نیشنل فنڈ جمع کریں جب کبھی ان کو گورنمنٹ ہند یا گورنمنٹ انگلستان میں کوئی درخواست یا شکایت پیش کرنے کی ضرورت ہو اُس فنڈ کی آمدنی میں سے خرچ کیا کریں۔

اس دورہ میں انھوں نے ایک مقام علیگڑھ میں بھی کیا تھا اور جو جلسہ اس مقصد کے لیے علیگڑھ میں ہوا تھا اُس میں سرسید صدر انجمن تھے نیز جو درخواست سول سروس کی عمر بڑھانے کے لیے ولایت بھیجی گئی تھی اُس کے بھیجنے میں بھی سرسید شریک تھے۔

غالباً اسی سنہ میں بنگالیوں نے کلکتہ میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام اول بنگال نیشنل لیگ رکھا گیا تھا اور جس کا مقصد مختصر لفظوں میں یہ تھا کہ گورنمنٹ نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستانیوں سے وعدہ کیا ہے اُن کا مطالبہ کیا جائے ۱۸۷۵ء کے شروع میں نیشنل لیگ کی طرف سے انگریزی میں ایک گمنام پمفلٹ شائع ہوا جس کا نام "دی سٹار ان دی ایسٹ" یعنی ستارۂ شرقی تھا۔ اس پمفلٹ کے شروع میں جو چند انگریزی اشعار تھے اُن کا یہ مضمون تھا "اے آسمان! کیا امید اور انصاف مر گئے! کیا کوئی نیا دن کبھی نمودار نہ ہوگا! آہ اے بچو تمہاری ماں (ہندوستان) ہمیشہ اسی طرح عبث منتوں پر منتیں کیے جائے گی! ایک ستارہ (نیشنل لیگ) مشرق کے شفاف افق پر چمک رہا ہے اور (اے ہندوستان) تیرے بچے جادو کے زور سے ایک مدت سے سوتے پڑے خواب دیکھ رہے تھے تیری جگانے کی آواز ان کے کان تک پہنچ گئی ہے۔"

پھر انھیں دنوں میں ایک رسالہ بطور سوال وجواب کے اور ایک اور رسالہ جس میں مولوی فرید الدین اور رام بخش دو فرضی شخصوں کا مکالمہ چھپا تھا شائع ہوئے، ان تینوں رسالوں کی پچاس ہزار جلدیں ہندوستان کی بارہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر ہندوستان کے تمام اطراف وجوانب میں مشتہر کی گئیں ازاں جملہ اُس کا ایک ترجمہ اُردو میں بھی شائع ہوا تھا جس میں گورمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقۂ انتظام کی برائی ایسے طور پر ظاہر کی گئی تھی جس سے خاص کر جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے دل پر بُرا اثر ہوتا تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ انھیں رسالوں کی نسبت لارڈ ڈفرن نے ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ "کانگرس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور زود اعتقاد شخصوں کے درمیان اُن رسالوں کے تقسیم کرنے کے جوابدہ ہوئے جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے اور جن کا مقصد صریح سرکاری افسروں کے برخلاف لوگوں کی عداوت کا برانگیختہ کرنا تھا"۔ اسی طرح اُنھوں نے ولایت جانے سے پہلے اہل کلکتہ کے الوداعی ایڈریس کے جواب میں بنگالی اخبار نویسوں کی نسبت کہا تھا کہ "گورنمنٹ کے برخلاف رعایا کے بھڑکانے کے لیے کوشش مت کرو جیسا کہ تیس برس کا عرصہ ہوا اسی قسم کی غلط بیانیاں زبردست باعث اس بات کا ہوئیں کہ اس ملک میں خون کی ندیاں بہنے لگیں"۔

۱۸۸۸ء کے شروع میں جب کہ سر سید سول سروس کمیشن کے ساتھ لاہور گئے تھے اُن اشعار کے مضمون پر جو ستارۂ شرقی کے شروع میں چھپے تھے بہت سے مسلمانوں کے مجمع میں خود راقم کے سامنے نہایت افسوس کرتے تھے اور بنگالیوں کے ساتھ شریک ہونے کو مسلمانوں کے حق میں مضر بتاتے تھے، پھر جب مولوی فرید الدین اور رام بخش کا مکالمہ مشتہر ہوا اور اُنھوں نے دیکھا

کہ اُس میں ایک فرضی نام مسلمان مولوی کا ہے اُن کو زیادہ خوف ہوا کہ مبادا مسلمان جو پہلے ہی سے بدنام ہیں اس مجمع میں شریک ہو جائیں۔

ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ یہ رسالے فی الواقع بدنیتی سے اور ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کی غرض سے لکھے گئے تھے، مگر اس میں شک نہیں کہ سرسید کا خوف بالکل بجا تھا۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات صرف آنکھ ہی سے نہیں دیکھے تھے بلکہ خود اُن کو بھگتا تھا اور جو مصائب انگریزوں اور ہندوستان پر گذرے اُن میں وہ خود اور اُن کے اکثر عزیز اور رشتہ دار شریک تھے کلکتہ اور بمبئی میں جس آگ کا دُھواں تک نہیں پہنچا تھا وہ خود سرسید کے گھر میں لگی ہوئی تھی۔ وہ خوب جانتے تھے اور اپنی کتاب اسباب بغاوت میں بدلائل ثابت کر چکے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت جس نے ہزاروں مسلمان خاندانوں کو تباہ کر دیا وہ محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا، نہ کسی ملکی سازش یا پولٹکل نفرت کا۔ پس گو یہ رسالے بُری نیت سے نہ لکھے گئے ہوں مگر نہایت قرین تھا کہ جاہل اور ناواقف لوگ اُن کا مضمون سُن کر گمراہ ہو جائیں، یا گورنمنٹ اُن کو بغاوت کی ایک تحریک سمجھے۔

سرسید تیس برس سے جیسا کہ اُن کی لائف علی الاعلان شہادت دیتی ہے۔ برابر کوشش کر رہے تھے کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں موانست اور دوستی پیدا ہو اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے پر زیادہ بھروسا اور زیادہ اعتماد ہو۔ اس لیے اُن سے زیادہ کسی کو اس بات کا خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمان کہیں پھر انگریزوں کی بدگمانی کا نشانہ نہ بن جائیں۔ وہ غدر میں یہ تماشا اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ کارتوس کی مخالفت جو بغاوت کی بنیاد تھی ہندوؤں سے شروع ہوئی اور مسلمانوں پر تھپ گئی۔ اُن کو اب بھی یہی خوف تھا کہ جو چیز بنگالیوں کی لبرٹی سمجھی جاتی ہے، وہ مسلمانوں میں آ کر مبوشنی نہ بن جائے۔ چنانچہ

گورنر مدراس نے صاف ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں کی کچھ پروا نہیں کرتا لیکن باز یا جرہ اُس کے آگے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً اُس کی گردن توڑ ڈالتا ہے۔" وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمان اور ہندوستان کی اکثر قومیں عموماً تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں اور آزادی کے مفہوم اور برٹش حکومت کے اصول سے محض بے خبر ان میں غالب حصہ اُن لوگوں کا ہے جن کے نزدیک تمام ملک کا متفق ہو کر گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجیٹیشن پھیلانا بعینہٖ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا پس اُن کی اور خاص کر مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایجیٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں اور ایسی ہدایتوں سے جو ناواقفوں کی گمراہ کرنے والی ہوں اپنے کان بند کر لیں۔ اُن کو یقین تھا کہ ۵۷ء کی بغاوت نے ہندوستانیوں کے اعتبار کو سو برس پیچھے ہٹا دیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ " اگر یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سیکڑوں جوان والنٹیر ہوتے، ایکٹ اسلحہ کبھی وجود میں نہ آتا اور ہم میں بہت سے لوگ فوج کے کپتان اور کرنیل و جرنیل نظر آتے" پس اس بات کا خوف کرنا کچھ بیجا نہ تھا کہ مبادا جو صفائی اور اعتبار ہندوستانیوں نے تیس برس میں از سر نو حاصل کیا ہے یا کرتے جاتے ہیں وہ پھر اسی بے اعتباری کے ساتھ بدل جائے جو تیس برس پہلے گورنمنٹ کو اُن کی طرف سے ہو گئی تھی۔

باوجود ان تمام باتوں کے سر سید نے علی الاعلان کانگرس کی مخالفت ظاہر کرنے میں جلدی نہیں کی۔ وہ ابتدا سے ہندو مسلمانوں میں قومی اتحاد اور سوشل یگانگت پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔ انھوں نے ملکی معاملات میں ہندوؤں سے کبھی مغایرت کا خیال نہیں کیا۔ ملازمت کے زمانہ میں اُن کا

برتاؤ ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ یکساں رہا۔ ایام غدر میں بجنور کے ہندو
رئیسوں نے خود درخواست کر کے ضلع کا انتظام اُن کے سپرد کرایا۔ سائنٹفک
سوسائٹی کے قائم کرنے سے اُن کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں اور
انگریزوں میں میل جول اور اتحاد کو زیادہ ترقی ہو۔ اگرچہ ۱۸۶۷ء میں جب کہ شمال
مغربی اضلاع کی اکثر ہندو سبھاؤں اور انجمنوں نے اُردو زبان اور فارسی حرفوں
کے برخلاف نہایت سخت کوشش کی تھی، سرسید کی طبیعت ہندوؤں کی طرف
سے کھٹک گئی تھی، اور اُن کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندو مسلمان مثل ایک قوم کے
مل جل کر کوئی کام کریں گے۔ اس کے سوا بنگالی اخباروں کی نکتہ چینیاں اور اعتراضات
جو کہ وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی اُن جزوی رعایتوں پر کرتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی
مسلمانوں کے ساتھ اُن کی حالت کے لحاظ سے کی جاتی ہیں اور اُن کی وہ مخالفانہ
اور دلشکن تحریریں جو مسلمانوں کے برخلاف اُن میں ہمیشہ چھپتی رہی ہیں۔ اور بھی
مایوس کرنے والی تھیں، مگر پھر بھی جہاں تک ممکن تھا وہ دونوں قوموں میں
اتحاد قائم رکھنے کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے بارہا اپنی پبلک اسپیچوں
میں ظاہر کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ سب اپنے تئیں
ایک قوم سمجھیں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے مغایرت پائی جائے یہاں تک
کہ گائے کی قربانی کی نسبت جیسا کہ انھوں نے ایک آرٹکل میں ظاہر کیا تھا
ہمیشہ اُن کی یہ رائے رہی ہے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے
تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں
کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔ محمڈن کالج علیگڑھ میں انھوں نے
کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا جس سے مسلمانوں طالب علموں کی ہندوؤں پر ترجیح
لازم آئے چنانچہ اب تک تقریباً دو سو ہندو طالب علم اس کالج سے مختلف

امتحانوں میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

پس اگرچہ وہ کانگرس کے طریق عمل کو ناپسند کرتے تھے مگر اس خیال سے کہ دونوں قوموں میں زیادہ اختلاف نہ پیدا ہو جائے، دو برس تک اُنھوں نے کانگرس کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ نہایت صبر و خاموشی کے ساتھ اس بات کے منتظر رہے کہ کانگرس میں کیسی تجویزیں پیش ہوتی ہیں۔ اور کس قسم کے حقوق وہ گورنمنٹ سے طلب کرتے ہیں؛ یہاں تک کہ کانگرس کی رپورٹیں شائع ہوئیں اور اُس کے مقاصد اُن کو معلوم ہوئے تو ان کو سخت یقین ہو گیا کہ اگر بالفرض کانگرس کی کارروائیوں پر گورنمنٹ کو کچھ اعتراض نہ ہو اور اُس کے مطالب بھی سراسر ادب اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو بھی مسلمانوں کا اور اُن تمام قوموں کا جو تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں۔ کانگریس میں شریک ہونا اور اس کی تائید کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ کانگرس کے اصلی اور مقدم مقاصد ایسے ہیں کہ اگر وہ پورے ہو جائیں تو مسلمانوں کی پولٹکل حالت کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً مقابلہ کا امتحان جو متعہد عہدوں کے لیے ولایت میں ہوتا ہے اس کا ہندوستان میں ہوتا یا تمام متعہد عہدوں کا مقابلہ کے امتحان کے ساتھ مشروط ہونا، یا لیجس لیٹو کونسل میں رعایا کی طرف سے اور رعایا کے انتخاب سے ممبروں کا مقرر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسی کے ساتھ اُن کو معلوم ہوا کہ مدراس میں جو عنقریب کانگرس کا اجلاس ہونے والا ہے اس میں بعض تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے اُن کو ضروری معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ان نتائج سے آگاہ کر دیں جو اُن کے نزدیک کانگرس کی شرکت سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے۔

۲۸۔ دسمبر ۱۸۸۷ء کو جب کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا، مسلمانوں کے عام جلسہ میں سرسید نے انڈین نیشنل کانگرس کے خلاف ایک نہایت مفصل اور سرزور لکچر دیا جو اُن کی اسپیچوں کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے اور اس لیے اُس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ مگر جو بحث کہ اس میں کونسل کے الکشن اور امتحان مقابلہ پر کی گئی ہے اُس کا لُب لباب ہم اس مقام پر لکھتے ہیں۔ کونسل کے الکشن کے متعلق اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ " اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے۔ اور اگر بفرض محال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے جس کی رو سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے ممبر برابر رہیں تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ نکلے گا جو وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو۔" اِس موقع پر انھوں نے صاف یہ بات کہی کہ میں نے کونسل میں چار برس کام کیا ہے۔ مگر ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ مجھ سا ذلیل اور نالائق اور مجھ سے بدتر کوئی ممبر نہیں ہو سکتا" اس کے بعد جو تقریر انھوں نے کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ " اگر بالفرض کوئی ایسا مسلمان نکل بھی آئے تو ہرگز یہ امید نہیں کہ وہ اپنے کاروبار چھوڑ کر، سفر کی تکلیف گوارا کر کے، تمام اخراجات جو ایک ممبر کونسل کے لیے زیبا ہیں اپنے پاس سے برداشت کر کے یا قوم سے چندہ کر کے کلکتہ اور شملہ میں حاضر رہے گا۔ مقابلہ کے امتحان کی نسبت اُن کی تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ " اس امتحان کے لیے ہمارا ملک تیار نہیں ہے انگلستان میں مقابلہ کا امتحان ہر شخص ڈیوک سے لے کر

ایک ادنےٰ درزی کے بیٹے تک دے سکتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ ولایت سے مقابلہ کا امتحان دے کر یہاں آتے ہیں اُن میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ خاندان کے لوگ ہوتے ہیں مگر یہ لوگ جو انگلستان سے حاکم مقرر ہو کر آتے ہیں وہ ہماری نظر سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کسی لارڈ کے بیٹے ہیں یا درزی کے۔ اس لیے یہ امر کہ ہم پر ایک ادنےٰ حکومت کر رہا ہے ہماری آنکھ سے چھپا رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کا حال اس کے برخلاف ہے، ہندوستان کی شریف قومیں اپنے ملک کے ایک ادنےٰ درجہ کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں کبھی اپنی جان اور مال پر حاکم ہونا پسند نہ کریں گی۔ اس کے سوا مقابلہ کا امتحان اس ملک میں ہو سکتا ہے جہاں اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک سب ایک قوم کے آدمی ہوں یا مختلف قومیں بسبب تعلیم و تربیت کے مل جل کر ایک ہو گئی ہوں مگر ہندوستان میں جہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے بالکل الگ ہے کسی طرح مقابلہ کا امتحان قرین مصلحت نہیں پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی حالت اس قدر مختلف اور متفاوت ہے کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان، راجپوت، سکھ اور جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلہ کے امتحان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بلکہ ہندوستان کی کوئی قوم بنگالیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پس اگر ہندوستان میں تمام متعہد اور غیر متعہد عہدوں کے لیے مقابلہ کا امتحان مقرر کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی ٹکڑا ملک کا ایسا نہ رہے گا کہ سوائے بنگالیوں کے یا کسی قدر تعلیم یافتہ ہندوؤں کے اور کسی کی صورت حکومت یا عدالت کی کرسی پر دکھائی دے۔"

سر سید کا یہ لکچر اردو اور انگریزی میں بذریعہ اخبارات کے بہت جلد ہندوستان میں شائع ہو گیا، اور نیز انگلستان کے اکثر نامور اخباروں نے اس

سے نوٹس لیا اور اس پر عمدہ ریمارکس کیے۔

اس کے بعد ۱۶۔ مارچ ۸۸ء کو بمقام میرٹھ انھوں نے دوسرا لکچر اسی قدر طولانی جیسا کہ لکھنؤ میں دیا تھا مسلمانوں کے عام جلسہ میں دیا۔ اس لکچر کا بڑا مقصد اس بات کا ثابت کرنا تھا کہ کانگرس والوں نے جو اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ سے یہ مشہور کیا ہے کہ مسلمان عموماً کانگرس میں شریک ہیں یہ بالکل غلط ہے اور معدودے چند مسلمان جو اُس میں شریک ہوئے ہیں انھوں نے غلطی کی ہے۔ اور اُن کے شریک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمان من حیث القوم کانگرس میں شریک ہیں۔ یہ لکچر بھی نہایت پُر زور اور مؤثر تھا۔ ان دونوں لکچروں میں بڑی بات یہ تھی کہ پُرانے خیالات کے مسلمان جو ہمیشہ سرسید کی ہر ایک رائے اور ہر ایک تجویز کی مخالفت یا اُس سے نفرت ظاہر کرتے تھے انھوں نے بالاتفاق ان کی رائے کو تسلیم کر لیا، اور باستثنائے معدودے چند تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اُس پر پورا پورا عمل کیا، نیز پُرانے خیالات کے اکثر ہندوؤں نے اور تقریباً کل تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور رئیسوں نے عام اس سے کہ ہندو ہوں یا مسلمان اُن کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

## پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

اس کے بعد اگست ۸۸ء میں سرسید نے بمقام علیگڈھ "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگرس میں شریک نہیں ہیں اُن کی رائیں اور خیالات اور خط کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہل انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے ولایت کو بھیجی جائے اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان

اور انگلستان میں عام طور پر شائع کیجائے۔

اس ایسوسئیشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی، ممالک متوسط اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگرس کے برخلاف جلسے کیے گئے، تمام تعلقہ داران اودھ، مہاراجہ بنارس، ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا اور جس قدر کارروائیاں کانگرس کے برخلاف تمام ملک میں ہوئیں اُن کی روئدادیں ایسوسئیشن کے ذریعہ سے وقتاً بعد وقت چھپ کر ولایت کو روانہ ہوتی رہیں اور پارلیمنٹ کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ کانگرس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاصکر مسلمان شریک نہیں ہیں۔

بنگالی اخباروں میں سرسید کی اس کارروائی سے سخت ناراضی ظاہر کی گئی اور اُن کے برخلاف بڑے بڑے تلخ آرٹکل لکھے گئے۔ سب سے بڑا اعتراض اُن پر یہ کیا گیا کہ وہ ابتدا سے ریپرزنٹیٹو اصول کے بڑے طرفدار رہے ہیں اور اُن کی تمام اگلی تحریروں اور اسپیچوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ رعایا کی آزادی کے بہت بڑے حامی ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس پر جو ہندوستان میں ریپرزنٹیٹو اصول کے موافق عمل درآمد چاہتی ہے معترض ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ ریپرزنٹیٹو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اور اس باب میں اُن کی اب بھی وہی رائے تھی جو ہمیشہ اپنی تحریروں میں ظاہر کرتے تھے۔ انھوں نے خود لکھنؤ کے لکچر میں اقرار کیا تھا کہ "میں کنسر وٹو نہیں ہوں بلکہ بہت بڑا لبرل ہوں" اُنھوں نے کونسل میں جب کہ لارڈ رپن کے سامنے سلف گورنمنٹ کا قانون پیش تھا۔ اپنی اسپیچ میں صاف کہا تھا کہ "میں اس بات کے خیال کرنے سے خوش ہوں کہ میں اس قدر عرصہ تک

زندہ رہا کہ میں نے اُس دن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سلف ہیلپ اور سیلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنھوں نے انگلستان میں ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشن پیدا کیے ہیں اور اُس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنادیا ہے۔"

لیکن اسی اسپیچ میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "انگلستان سے ریپرزنٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں ان سوشل اور پولیٹکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان فی نفسہٖ ایک براعظم ہے اور اُس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں۔ مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے۔ ذات کا قاعدہ بہت شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے باشندے ہوں اور ایک گروہ دولتمند اور تجارت پیشہ ہو تو دوسرا گروہ ذی علم اور ذی رعب ہو؛ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہوا ور روشن ضمیری کے جس درجہ تک وہ گروہ پہنچ گیا ہو وہ درجہ باقی باشندوں کے درجہ سے بہت اعلیٰ ہو ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں اُن کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پروا نہ ہو۔ پس اِن صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہو کہ ہندوستان میں ریپرزنٹیٹو انسٹیٹیوشنوں کے جاری کرنے سے بڑی بڑی مشکلیں اور سوشل اور پولیٹکل خطرات پیدا ہوں گے۔ ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان ہے۔ جہاں قومی امتیاز

اب باقی نہیں رہا اور جہاں مذہبی معاملات میں تطرفہ اور اختلافات تحمل کی ترقی
کے سبب کم ہو گئے ہیں، وہاں ایسے معاملہ میں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں
آئیں قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہو گئے ہیں اور
تعلیم کی ترقی سے خفیف اختلافات جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق ہیں بالکل
ناچیز ہو گئے ہیں، عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطالب کی حمایت کرنے
کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ عذر نہیں ہوتا اور درحقیقت
سوشل اور پولیٹیکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی
ایک ہی قوم ہے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے۔ جہاں
ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں، جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں
ہوئی ہیں، جہاں مذہبی اختلافات اب تک زور شور پر ہیں اور جہاں تعلیم
نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی
مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی، مجھ کو یقین کامل ہے کہ لوکل بورڈوں اور
ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الکشن کے خالص
اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے بہ نسبت محض تمدنی خیالات کے زیادہ
خرابیاں پیدا ہوں گی جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات
اور ذات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل اور پولیٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم
رہے گا اور اُن معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے بیشتر متعلق
ہیں اُس کے باشندوں پر اثر ڈالے گا، اُس وقت تک الکشن کا خالص قاعدہ
طمانیت کے ساتھ جاری نہیں ہو سکتا، بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر
بالکل غالب آویگی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر کے جاری کرنے
کا جوابدہ سمجھیں گے جن کے باعث سے قوم اور مذہب کے اختلافات یہ

نسبت سابق کے اور بھی سخت ہو جائیں گے۔"

یہ اسپیچ سرسید نے ۱۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو یعنی اُس لکچر سے جو کانگرس کے خلاف لکھنؤ میں دیا پانچ برس پہلے لارڈ رپن کے سامنے کی تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ جس طرح ہمیشہ ریپرزنٹیٹو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اُسی طرح وہ ہندوستان کو موجودہ حالت میں اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُس میں ریپرزنٹیٹو اصول کے موافق عمل درآمد کیا جائے۔ انگلستان میں ہوم رول بل پر جو سب سے بڑا اعتراض مخالف پارٹی کا تھا اور جس نے آخر اُس کو پاس نہ ہونے دیا وہ یہی تھا کہ آئر لینڈ میں رومن کیتھولکس کی تعداد بمقابلہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے بہت زیادہ ہے۔ پس اگر یہ بل پاس ہو جائے گا تو پروٹسٹنٹوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ جب آئرلینڈ جیسے ملک میں جہاں قومی اور مذہبی اختلافات یقیناً ہندوستان سے بہت کم ہیں، ایک فرقہ کی مجارٹی دوسرے فرقہ کے حق میں اس قدر مضر خیال کیجاتی ہیں تو ہندوستان میں جہاں برخلاف تمام دنیا کے مذہبی اور قومی تعصبات ترقی تعلیم کے ساتھ روز بروز بڑھتے جاتے ہیں ریپرزنٹیٹو اصول سے کیا بھلائی کی امید ہوسکتی ہے؟

سرسید پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ کانگرس کے قائم ہونے سے پہلے جب کہ بابو سرندرو ناتھ بنیرجی علیگڑھ میں آئے تھے اور انھوں نے نیشنل فنڈ جمع کرنے کی تحریک کی تھی اُس وقت سرسید نے کیوں اُن کے ساتھ اتفاق رائے کیا تھا؟ اور کیوں اُس جلسہ میں صدر انجمن بنے تھے جو نیشنل فنڈ جمع کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا؟ اور جب کہ وہ فنڈ اسی لیے جمع کیا جاتا تھا کہ تمام ہندوستان کی طرف سے پارلیمنٹ میں جو درخواستیں بھیجی جائیں یا جو استغاثے پیش کیے جائیں اُن کے اخراجات میں صرف کیا جائے تو پھر نیشنل

کانگرس ہے جس کے لیے وہ فنڈ جمع کیا جاتا تھا کس لیے مخالفت کی گئی؟

اس کا جواب نہایت صاف ہے۔ جس جلسہ کا ذکر کیا جاتا ہے اُس میں صرف ایک مقصد کی تصریح کی گئی تھی یعنی یہ کہ ایک عرضداشت ولایت میں اس غرض سے بھیجی جائے کہ سول سروس کے امتحان کی عمر بجائے ۱۹ برس کے ۲۱ برس کی قرار دیجائے۔ اس کے سوا جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے اور کسی خاص مقصد کی تصریح نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس مقصد کے متعلق جس کے لیے وہ جلسہ منعقد ہُوا تھا سرسید کی رائے میں کبھی فرق نہیں آیا۔ سول سروس کمیشن میں انھوں نے برابر اُس کی تائید کی اور وہ مقصد اُسی طرح حاصل بھی ہو گیا جس طرح کہ ہندوستانیوں کی خواہش تھی اور اگر وہ تجویزیں جو آخر کو کانگرس میں پیش ہوئیں اور جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا یقین کیا جاتا ہے اگر اُس علیگڑھ والے جلسہ میں اُن کی تصریح کی جاتی تو ہرگز قیاس میں نہیں آتا کہ سرسید اُن تجویزوں سے اتفاق کرتے کیونکہ جو اسپیچ انھوں نے پانچ برس پہلے قانون سیلف گورنمنٹ پر کونسل میں کی تھی اُس کا سارا نچوڑ اس بات پر ہے کہ ہندوستانیوں کو ایسے حقوق دینے جن سے ہندوستان کی تمام معزز قومیں برابر مستفید نہ ہو سکیں کسی طرح مناسب نہیں۔

اس کے سوا جو طریقہ کانگرس نے گورنمنٹ پر دباؤ ڈالنے کا اختیار کیا سرسید اُس طریقہ کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت" میں گورنمنٹ پر اعتراض کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا مگر اس کی ایک کاپی بھی اس طرح جیسے کہ پچاس ہزار رسالے کانگرس نے تمام ملک میں تقسیم کیے ہندوستان میں شائع نہیں کی بلکہ جس قدر جلدیں چھپوائیں اُن میں سے ایک آدھ جلد گورنمنٹ ہند کے ملاحظہ کے لیے اور

باقی کل جلدیں پارلیمنٹ میں بھیجدیں وہ اس قسم کے ایجیٹیشن کو جیسا کہ کانگرس نے ہندوستان میں شروع کیا تھا تمام ملک کے حق میں عموماً اور مسلمانوں کے حق میں خصوصاً نہایت مضر سمجھتے تھے۔ وہ ایک چٹھی میں جو بدرالدین طیب جی کے نام اُنھوں نے لکھی تھی ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "امریکا میں اول اسی قسم کا ایجیٹیشن شروع ہوا تھا اور آخر کو یہاں تک نوبت پہنچی کہ آخری لفظ جو ان کے مُنہ سے نکلا وہ یہ تھا کہ " نو ٹیکسیشن وداؤٹ ریپریزنٹیشن " بس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے کی طاقت ہو وہ اس کانگرس کے ایجیٹیشن میں شریک ہوں ورنہ ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجاتی ہیں " پھر آگے چل کر اسی چٹھی میں لکھتے ہیں کہ " غدر کیا ہُوا - ؟ ہندوؤں نے شروع کیا مسلمان دل چلے تھے۔ وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

اگرچہ کانگرس سے علیحدہ رہنے میں مسلمانوں نے عموماً سرسید کے کہنے پر عمل کیا اور چند مستثنےٰ اشخاص کے سوا کوئی مسلمان کانگرس میں شریک نہیں ہوا لیکن بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان سرسید کی اس پالسی کو مدت تک نہایت تعجب سے دیکھتے رہے۔ چنانچہ ایک نہایت لائق تعلیم یافتہ مسلمان نے ہم سے کہا کہ "جب گورنمنٹ نے اول ہی اول ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تھی اُس وقت ہندوؤں نے اُس کو خوشی سے قبول کر لیا تھا مگر مسلمانوں نے نہایت سختی کے ساتھ اُس سے انکار کیا تھا لیکن آخر کار مسلمان اپنے انکار سے پشیمان ہوئے اور مجبور ہو کر اُن کو انگریزی تعلیم اختیار کرنی پڑی۔ اسی طرح اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کو کہیں نیشنل کانگرس کی علیحدگی سے بھی آخر کو پہلے کی طرح پشیمان ہونا نہ پڑے " مگر سال گذشتہ میں جو

افسوسناک واقعات پونا میں گذرے اور جو عبرت انگیز نتیجے اُن پر مترتب ہوئے اُن کو دیکھ کر غالباً سب کی آنکھیں کھل گئیں ہوں گی اور معلوم ہو گیا ہوگا کہ سرسیّد کی رائے اس باب میں کس قدر صائب تھی اور کانگرس سے علیحدہ رہنا ایک ایسی قوم کے لیے جیسے کہ مسلمان ہیں کس قدر ضروری تھا۔

اگرچہ بنگالیوں کی طرف سے سرسید پر بے انتہا لے دے ہوئی، اُن کو خوشامدی، زمانہ ساز، ٹائم سرور اور کیا کیا اور کیا کہا گیا۔ اُن کی پچھلی تحریروں کا حال کی تحریروں سے مقابلہ کر کے دکھایا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں مگر سرسید نے جس بات کو اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھ لیا تھا اخیر دم تک اُسی پر قائم رہے اور کسی کے کہنے سننے پر مطلق التفات نہیں کیا۔ یہاں تک کہ نکتہ چینیوں کے ترکش خالی ہو گئے اور سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔ ؎

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چُپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

## کے۔سی۔ایس۔آئی کا تمغہ ملنا

۱۸۸۸ء میں سرسید کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلیٰ ستارۂ ہند" سے ممتاز کیا گیا۔ ۲۸ مئی روز دوشنبہ کو اس تقریب سے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ کے بڑے ہال میں ضلع اور شہر علیگڑھ کے رئیس اور سرسید کے مسلمان ہندو اور یورپین دوست جو باہر سے اس رسم میں شریک ہونے کو آئے تھے اور تمام اسٹیشن کے انگریز جمع ہوئے۔ ہال کی دیواریں علاوہ دیگر معمولی آرائشوں کے مشرقی وضع کی تلواروں اور مغربی وضع کی بندوقوں سے سجائی گئیں۔ مسٹر کریڈک ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ

پولیس، مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر اور راجہ جیکشنداس سی. ایس. آئی اپنے اپنے تمغے پہنے ہوئے سرسید کو ہال کے اندر لائے، تمام حاضرین اُن کے آنے پر کھڑے ہو گئے اور تعظیمی گارڈ نے جس کو ضلع کی پولیس نے ماسور کیا تھا ہتھیاروں سے سلامی ادا کی۔ اس کے بعد مسٹر ای. ایچ ریڈیچی اسسٹنٹ مجسٹریٹ نے فرمان شاہی حسب ذیل پڑھ کر سنائے:

## ( اول )

( دستخط ) وکٹوریا آر آئی

وکٹوریا بذظلہ متحدہ گریٹ برٹن و آئرلینڈ۔ ملکہ حامی دین قیصر ہند فرمان روائے

طبقہ اعلائے ستارۂ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقۂ اعلائے موصوف ممبر کونسل نواب

لفٹینٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی بہ سلامتی و مبارک باد آنکہ

چونکہ یہ مدنظر ہوا کہ آپ کو ایک ایسا نشان خسروانہ عطا کیا جائے جس سے وہ قدر منزلت آپ کی نمایاں ہو جو اس سلطنت اور آپ کی ذات اور اُن خدمات کے شایاں ہو جو آپ سے اس سلطنت کے لیے ظاہر ہوئیں، لہٰذا یہ مناسب اور زیبا ہے کہ آپ کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند" سے ممتاز و سربلند کیا جائے۔ اس لیے بذریعہ اس تحریر کے آپ کو اعزاز نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلائے ستارہ ہند عطا ہو کر اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اس اعزاز سے سرفراز و مفتخر ہو کر حقوق جزو کل متعلقہ طبقۂ اعلائے موصوف ہوں۔

عدالت عالیہ مقام آسبورن بذریعۂ مہر طبقۂ موصوف
آج یکم جنوری ۱۸۹۸ء اور سنہ ۶۱ جلوسی کو جاری ہوا
(دستخط) کراس (وزیر ہند)

## (دوم)

(دستخط) وکٹوریا آر آئی۔

وکٹوریا مدظلہ متحدہ گریٹ برٹن آئرلینڈ، ملکہ حامی دین، قیصر ہند فرماں روائے
طبقہ اعلائے ستارۂ ہند
بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقۂ اعلائے موصوف ممبر کونسل قانونی نواب
لفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی بہ سلامتی و مبارکباد آنکہ
آپ کو اعزاز طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند سے ممتاز و نامور کیا گیا ہے از انجاکہ ہم کو حسب
اختیارات قوانین طبقۂ اعلائے موصوف اختیار حاصل ہے کہ آپ کی حاضری
ولایت کی بغرض استفادۂ اعزاز طبقہ اعلیٰ کے معاف کریں لہذا حسب اختیارات
حسروانہ طبقۂ موصوف ہم آپ کو پورے اختیارات پہننے و استعمال کرنے
ستارۂ موصوف کی بجانب چپ بالائے پوشاک بیرونی عطا کرتے ہیں۔ اور
نیز نشان خاص و بندش متعلقہ نائٹ کمانڈر موصوف پہنیں اور استعمال کریں۔
اور حسب محوائے اختیارات مذکور آپ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ تمامی حقوق جزو
کل متعلقۂ طبقۂ نائٹ کمانڈر موصوف مع استعمال ایک نشان خاص نائٹ بیچلر
سلطنت موصوف سے مستفید و بہرہ یاب ہوں اور یہ اسی طریقہ اور مراسم
سے منصور ہے جیساکہ آپ اس نائٹ ہڈ سے ہم سے یا بجائے ہمارے
نائب سلطنت اور گورنر جنرل ہند سے جو گرینڈ ماسٹر طبقۂ موصوف

ہیں اعزاز حاصل کرتے۔

عدالت عالیہ مقام آسبوھن بذریعۂ مہر طبقۂ موصوف

آج ۱۱ فروری ۱۸۸۸ء عیسوی اور ۵۱ء جلوسی کو جاری ہوا

(دستخط) کراس (وزیر ہند)

اس کے بعد صاحب کلکٹر مسٹر کینیڈی اپنی کرسی پر سے اٹھے۔سب لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور تعظیمی گارڈ نے پھر سلامی ادا کی۔ صاحب ممدوح نے حضور ملکۂ معظمۂ کوئین وکٹوریا کی طرف سے ستارہ ہند سر سید کے سینہ پر لگا دیا اور فیتہ مع بیج کے جو اس کے ساتھ تھا ان کے گلے میں ڈال دیا۔سب لوگ پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور صاحب کلکٹر نے اردو میں ایک لمبی تقریر کی جس میں سر سید کی بہت تعریف کی تھی اور جس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔انھوں نے کہا کہ "اہل فرنگ اور اہل ہند نے سید صاحب کی وسیع عقل اور روشن حب الوطنی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان میں نوجوانی سے دو وصف برابر پائے گئے ہیں ایک علم کی محبت دوسرے وطن کی محبت کہ یہ دونوں ایک جگہ بہت کم پائی جاتی ہیں۔" "لبرل نے ان کو کنسرولٹو خیال کیا کیوں کہ انھوں نے رسومات مغربی کی بالکل نقل نہیں کی اور کنسرولٹو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح اپنے ملک کے باہر کوئی عمدہ چیز پا سکیں گے انھوں نے اہل فرنگ اور اہل ہند کے درمیان معقول واقفیت پیدا کرنے کے لیے وہ مدد دی جو بہت کم لوگوں نے دی ہے۔" "سید صاحب وسیع ہمدردی دانشمندانہ صلاح، تجربہ کاری، سرگرمی، مستعدی، مستقل مزاجی اور حب الوطنی کی مثال ہیں اور نیز وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے واسطے کبھی کچھ تلاش نہیں کیا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی اور اس لیے ان کے ملک کے لوگ اور

ملکہ معظمہ اُن کی عزت کرتی ہیں اور ہم لوگ محبت اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

اس کے بعد سرسید نے اس مضمون کے معمولی اقرارنامہ پر کہ وہ طبقہ مذکور کے قوانین کی اطاعت کریں گے دستخط کیے اور جلسہ برخاست ہو گیا اور مسٹر کینڈی نے اسی تقریب میں چند انگریزوں اور مسلمانوں کی اپنے ہاں حاضری پر دعوت کی۔

اس واقعہ کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ رؤسائے ضلع علیگڑھ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ سرسید کو تمغہ مذکور ملنے والا ہے تو انھوں نے سرسید کو اور یوروپین افسروں کو اسی خوشی میں ایک بہت بڑا ڈنر دینا چاہا اور کچھ لوگ رئیسوں کی طرف سے مع ایک خط کے سرسید کے پاس آئے کہ آپ اس ڈنر میں آنا منظور کریں۔ سرسید نے اس کے جواب میں بعد شکریہ رؤسائے ضلع کے یہ لکھ بھیجا کہ "چونکہ قوم کی حالت ابتر ہے اور اُس کو بہم رسانی تعلیم کی بہت حاجت ہے اس لیے میں ایسے فضول اخراجات کا سخت مخالف ہوں۔ پس اس ڈنر اور جلسہ سے آپ مجھے معاف رکھیں" اور اخبار میں ایک آرٹیکل لکھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ "کسی خوشی یا تقریب میں ڈنر دینے محض فضول ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت اس وقت مسلمانوں کی تعلیم میں خرچ کرنے کی ہے۔ ہمارے لیے جو ڈنر تجویز ہوا تھا اُس کے لیے بارہ سو روپیہ کا تخمینہ ہوا تھا اگر وہ روپیہ تعلیم مسلمانان کے اخراجات میں صرف ہوتا تو کس قدر مفید ہوتا۔"

سرسید کے واسطے اس اعزاز کے ملنے کی بہت دن سے تجویز ہو رہی تھی مگر چونکہ اس تمغے کے پانے والوں کی تعداد محدود ہوتی ہے یعنی کبھی ۲۷ سے زیادہ نہیں ہوتے پاتی اس لیے جب تک ناشٹ کمانڈر کا عہدہ

خالی نہیں ہوتا دوسرے شخص کو نمبر نہیں مل سکتا۔ چنانچہ لارڈ ڈلٹن نے دربار قیصری کے بعد اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ بسبب خالی نہ ہونے کسی نائٹ کمانڈر کے عہدہ کے اس وقت سر سید کو یہ اعزاز نہ مل سکا۔

# ڈاکٹر آوف لاز کی ڈگری

۱۸۸۹ء میں سر سید کو اڈنبرا یونیورسٹی سے بحیثیت ایک اعلیٰ مصنف اور حامیٔ علوم ہونے کے ایک بڑا علمی امتیاز دیا گیا۔ انگلستان میں دستور ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے ملک میں امتیاز حاصل کرتے ہیں یا علم کی روشنی پھیلانے میں کوشش کرتے ہیں اُن کو اہل علم کے عام مجمع میں کسی یونیورسٹی کی طرف سے ایک خاص اعزاز دیا جاتا ہے جس کو "ڈگری اوف ڈاکٹر اوف لاز" کہتے ہیں۔ سر سید کی شہرت، خطبات احمدیہ اور دیگر تصنیفات و تحریرات کے سبب سے انگلستان میں بحیثیت ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف کے ہندوستان سے کچھ کم نہ تھی۔ اس کے سوا مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کے رواج دینے سے وہ علوم جدیدہ کے بہت بڑے حامی سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے بغیر اس کے کہ سر سید کو اطلاع ہو ۱۸۸۹ء میں اڈنبرا کی مشہور یونیورسٹی سے اُن کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری ملنی تجویز ہوئی۔

۱۸ اپریل کو ایک شہر اڈنبرا کے سب سے بڑے ہال میں جو سائنڈ ہال کے نام سے مشہور ہے گریجویشن کی رسم ادا کی گئی۔ یہ جلسہ جیسا کہ علیگڑھ گزٹ مطبوعہ ۲۸ مئی ۱۸۸۹ء میں بحوالۂ اخبارات و چٹھیات ولایت مفصل مذکور ہے۔ بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا تھا۔ تمام گیلریاں اور ہال کا ایک

عام لوگوں سے جو مدعو کیے گئے تھے بھرا ہوا تھا اور دوسرا حصہ یونیورسٹی کے گریجویٹس سے مزین تھا۔ اس جلسہ میں دو تہائی لیڈیاں تھیں جن میں لیڈی میور صاحبہ جنھوں نے مدرسۃ العلوم علیگڑھ کی "میور پارک" میں سب سے پہلا پودا اپنے ہاتھ سے لگایا تھا، موجود تھیں اور ان کے معزز شوہر سر ولیم میور بھی جن کو ہندوستان کے لوگ عموماً جانتے ہیں بحیثیت پرنسپل یونیورسٹی لارڈ چانسلر کے ہمراہ جو جلسہ کے پریسیڈنٹ تھے تشریف لائے تھے جس وقت لارڈ چانسلر کے سامنے سر سید کا ذکر کیا گیا اور حاضرین نے اس پر تحسین و آفرین کا نعرہ بلند کیا تو سر ولیم میور اور لیڈی میور صاحبہ خوشی سے باغ باغ ہو گئیں۔ اس موقع پر بارہ آدمیوں کو جن میں سے چھ حاضر اور چھ غیر حاضر تھے یہ ڈگری ملنی تجویز ہوئی تھی۔ پروفیسر کرک پیٹرک نے سر سید کو لارڈ چانسلر سے انٹروڈیوس کرتے وقت کہا کہ "میں سب سے پہلے آپ سے یہ اجازت چاہتا ہوں کہ سر سید احمد خاں بہادر کے۔سی۔ایس۔آئی کو ان کی غیر حاضری میں ڈاکٹر اوف لاز کی آنریری ڈگری عطا کی جائے" اس کے بعد سر سید کی تاریخ ولادت، خاندان سلطنتِ مغلیہ کا قدیم توسل سرکاری ملازمت، ایامِ غدر کی خدمات اور تمیں انگریزوں کی جان بچانے میں نہایت شریفانہ ہیروئزم ظاہر کرنا، پولیٹیکل پنشن اور خطابات کا ملنا، وائسریگل کونسل کی ممبری، ملکی اور قومی خدمات، آثار الصنادید اور دیگر تصنیفات خصوصاً خطبات احمدیہ کا لکھنا سپیکنگ کی اعلیٰ لیاقت، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو مقرر ہونا، محمڈن کالج قائم کرنا اور بڑے بڑے ارکانِ سلطنتِ ہند کا اس میں مدد دینا، یہ سب باتیں بیان کیں اور کہا کہ "سر سید سب سے زیادہ نامور مسلمان سبجکٹ حضور ملکۂ معظمہ قیصرِ ہند کے ہیں اور اس لیے خصوصیت

کے ساتھ یونیورسٹی کے اس اعزاز کے مستحق ہیں" اس کے بعد تمام حاضرینِ جلسہ نے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیے اور سرسید کو ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ افسوس ہے کہ جو سند اڈنبرا کی یونیورسٹی نے سرسید کو بھیجی تھی وہ اس کتاب کے لکھتے وقت ہم کو دستیاب نہیں ہوئی۔ اس لیے ہم یہاں اس کے نقل کرنے سے معذور ہیں۔

اگرچہ سرسید اڈنبرا یونیورسٹی کی اس قدرشناسی کے نہایت شکرگذار تھے اور جو اعزاز کہ اُس نے اُن کو دیا تھا اُس پر فخر کرتے تھے لیکن انھوں نے ایسی آنریری ڈگریوں کو ڈگری پانے والوں کی اصلی لیاقت کا معیار کبھی نہیں سمجھا بلکہ وہ یونیورسٹی کی ہر ایک ڈگری کو اُس قوم کے حق میں جس کے ہاتھ میں اُس یونیورسٹی کی باگ نہ ہو ایک بھیک کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک ایڈریس کے جواب میں جو اہلِ پنجاب نے ۱۸۹۴ء میں اُن کو بمقام جالندھر دیا، صاف کہا تھا کہ "یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام جیسی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں، اُس کے ہاتھ کیے ہوئے ہیں جو ٹکڑا علم کا وہ دیتی ہے اُسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو ہماری پوری تعلیم اُس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف نچر بناتی ہے۔ اے دوستوں میں خود بھی انھیں میں ہوں کیونکہ مجھ کو بھی ایک یونیورسٹی

نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جبھی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"

# ٹرسٹی بل پر اختلاف

کالج کا انتظام ابتدا میں صرف ایک کمیٹی سے جو کالج فنڈ کمیٹی کہلاتی تھی متعلق تھا۔ لیکن جوں جوں کالج ترقی کرتا گیا نئی نئی ضرورتیں پیش آتی گئیں چنانچہ ۱۸۸۹ء میں پہلے قواعد کی ترمیم ہوکر نئے بائی لاز بنائے گئے اور کالج فنڈ کمیٹی کے ماتحت چار اور کمیٹیاں مقرر ہوئیں۔

۱۔ کمیٹی ڈائرکٹران تعلیم السنۂ مختلفہ و علوم دنیویہ۔

۲۔ کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت۔

۳۔ کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اثنا عشریہ۔

۴۔ مینجنگ کمیٹی جس کا کام بورڈنگ ہاؤس کا انتظام اور بورڈوں کی ہر طرح کی نگرانی تھا۔

اس کے بعد جب کالج کی حالت اور اس کی جائیداد بہت ترقی کر گئی اور اس پر لوگوں کا اعتماد زیادہ ہوگیا یہاں تک کہ لوگ ہزارہا روپیہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے پیشگی طور پر کمیٹی میں امانت رکھوانے لگے تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اب کالج کا ایک معمولی کمیٹی کے سپرد رہنا مناسب نہیں۔ اس خیال کو پیدا ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اتفاق سے سرسید سخت بیمار ہوگئے جب صحت یابی ہوئی تو انھوں نے اس بات کو بہت ضروری سمجھا کہ ان کی زندگی میں سرکاری قانون مروجہ وقت کے موافق کالج اور اس کی جائداد کے لیے ٹرسٹی (امین) مقرر ہو جائیں اور ایسے قواعد اور رگیولیشن بنائے جائیں جو تمام ضروری جزئیات

کالج پر حاوی ہوں اور جہاں تک ممکن ہو ایسا انتظام کیا جائے کہ جن اصول پر کالج کی بنیاد رکھی گئی ہے انھیں اصول پر وہ ہمیشہ قائم رہے سرسید کے معزز یوروپین دوستوں نے بھی دور اندیشی کی راہ سے یہی صلاح دی اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی یہ ایما پایا گیا کہ جب تک اطمینان کے قابل آیندہ انتظام نہ ہوگا گورنمنٹ اور حیدرآباد کی امداد جاری نہیں رہ سکتی۔

پس سرسید نے ۱۸۸۹ء میں حسب ضابطہ ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر انتظامات کے لیے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس رائے کے لیے بھیجیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی نے اس کی بعض دفعات سے اختلاف کیا جن میں سے ایک وہ دفعہ تھی جس کی رو سے آنریبل سید محمود کو جائنٹ سکرٹری مقرر کیا گیا تھا، اور ان کے ساتھ ان کے اکثر دوست بھی جن میں زیادہ تر ضلع علیگڑھ اور بلند شہر کے رئیس تھے اس اختلاف میں شریک ہو گئے۔ اگر یہ اختلاف اختلافِ رائے کی حد سے متجاوز نہ ہوتا اور ٹرسٹی بل کے پاس ہو جانے پر بالکل رفع ہو جاتا تو ہم اس کو خدا کی رحمت سمجھتے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ آخر کار مخالفت کی صورت میں بدل گیا۔ باوجودیکہ مسودہ ممبران کمیٹی کے بھرے جلسہ میں مجارٹی کی رو سے پاس ہو گیا مگر ان کی مخالفت رفع نہ ہوئی۔ چنانچہ مولوی سمیع اللہ خاں اور تقریباً ان کی تمام پارٹی کالج سے بے تعلق ہو گئی۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی رائے اس باب میں خطا پر تھی تو بھی جب کہ ٹرسٹی بل قاعدہ کے موافق پاس ہو چکا تھا تمام کالج کے ہواخواہوں کو اسے سر پر رکھنا چاہیے تھا۔ یہی وہ مستحکم بنیاد ہے جس پر تمام شائستہ ملکوں میں قومی جماعتیں اور قومی انسٹی ٹیوشن قائم ہیں اور روز بروز ترقی کرتے جاتے

ہیں جب تک کوئی تجویز کثرت رائے سے پاس نہیں ہوتی اس سے نہایت زور شور کے ساتھ اختلاف کیا جاتا ہے اور ایک پارٹی دوسری پارٹی پر غالب آنے کے لیے تمام وسائل جو اُس کی قدرت میں ہوتے ہیں کام میں لاتی ہے مگر جہاں ایک پارٹی کثرت رائے سے غالب آئی فوراً دوسری پارٹی نے ہتھیار ڈال دیئے اور اختلاف اتفاق کے ساتھ بدل گیا۔ چنانچہ انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین نے کہ وہ بھی اس اختلاف میں شریک تھے بل پاس ہوجانے کے بعد اس کو بسر و چشم قبول اور منظور کر لیا اور کالج کے پہلے سے زیادہ حامی و مددگار بن گئے مگر اور صاحبوں نے قانون ٹرسٹیان کو ہرگز تسلیم نہیں کیا اور کالج سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔

اگرچہ سرسید چالیس برس برابر طرح طرح کی مخالفتیں جھیلتے رہے مگر کوئی مخالفت ان کو ایسی شاق نہیں گذری جیسی کہ مولوی سمیع اللہ خاں اور اُن کی پارٹی کی مخالفت جس سے فی الواقع اُن کا حوصلہ تنگی کرنے لگا تھا اور صبر و تحمل کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اول تو مولوی سمیع اللہ خاں کو وہ اپنا قوت بازو سمجھتے تھے جن سے کالج اور بورڈنگ کے انتظام اور نگرانی میں اُن سے بے انتہا تقویت پہنچی تھی اور ایسے عزیز دوست اور مددگار سے ایسی سخت مخالفت کا ظہور میں آنا فی الواقع ناقابل برداشت تھا۔ دوسرے اُن کی مخالفت اُنھیں کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ کالج کے بہت سے معاون اُن کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لیے سرسید کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں کالج کی چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹک جائے چنانچہ اُنھیں دنوں میں جو اُنھوں نے ایک نہایت پُرجوش آرٹکل علیگڑھ گزٹ میں شائع کیا تھا اور جس میں فرانس چل کر ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا گیا تھا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرسید

کے دل کی اُس وقت کیا حالت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈسپاٹک طبیعت کے آدمی تھے۔ اس خصلت کو چاہو اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد سمجھو اور چاہو اُن کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو بہرحال یہ خصلت اُن میں ضرور تھی، گو وہ جزوی اور فروعی باتوں میں اختلاف رائے سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے مگر جن اصول پر انھوں نے کالج کی بنیاد رکھی اُن سے وہ ہرگز دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے اور جس بات کو ان میں مخل سمجھتے تھے اُس کو جہاں تک کہ اُن کے امکان میں تھا چلنے نہیں دیتے تھے۔ اُن کا مقصد محمڈن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدم مقصد جو ۵۷ء سے لیکر اخیر دم اُن کے پیش نظر رہا، یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں یک جہتی، میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اسی لیے انھوں نے یوروپین اسٹاف کو کالج کا جزو غیر منفک قرار دیا تھا اور انگلستان سے چیدہ چیدہ آدمی بلوا کر کالج میں جمع کیے تھے مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ یوروپین اسٹاف مولوی صاحب ممدوح کی طرف سے کھٹک گیا تھا اور اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر سرسید نے اپنی زندگی میں آیندہ کے لیے سکرٹری شپ کا کوئی انتظام نہ کیا تو ان کے بعد ضرور ہی مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری ہوں گے۔ انھوں نے اور نیز بعض اور یوروپین افسروں نے سرسید کو صلاح دی کہ سید محمود کو جائنٹ سکرٹری مقرر کر دیں تاکہ یوروپین اسٹاف کا جس کو معاہدہ کر کے انگلستان سے بلایا گیا ہے سرسید کے آیندہ جانشین کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہو جائے، اگرچہ سرسید کو یقین تھا کہ سید محمود کو جائنٹ سکرٹری مقرر کرنے سے لوگوں کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوں گی اور ایسی بدگمانیوں سے، جیسا کہ

اس کتاب کے صفحات میں جا بجا مذکور ہے۔ وہ سو سو کوس بھاگتے تھے۔ اس کے سوا سید محمود کی نسبت معتبر ذریعوں سے سنایا گیا ہے کہ وہ جائنٹ سکرٹری یا سکرٹری بننے کو پسند نہیں کرتے تھے مگر چونکہ یوروپین اسٹاف کو اس بات پر سخت اصرار تھا اور اُن کو کالج کی آیندہ حالت کی نسبت مطمئن کرنا ضرور تھا اس لیے سرسید کو ٹرسٹی بل میں ایک خاص دفعہ سید محمود کے جائنٹ سکرٹری مقرر کرنے کے لیے داخل کرنی اور سید محمود کو بہ جبر اس تجویز پر راضی کرنا پڑا۔

جو لوگ کالج کے خیر خواہ تھے اُن کا فرض تھا کہ اول تو اس تجویز سے اختلاف ہی نہ کرتے کیونکہ وہ ہر ایک ایسی مصلحت پر مبنی تھی جس کو سرسید نے ہمیشہ نظام کالج میں سب سے زیادہ مقدم سمجھا ہے، یہاں تک کہ اگر بالفرض کثرت رائے سرسید کی طرف نہ ہو جاتی تو سرسید قطعاً کالج کو چھوڑ بیٹھتے اور یوروپین اسٹاف یقیناً کالج کو خیرباد کہہ کر چلا جاتا اور پھر کوئی یوروپین جنٹلمین یہاں آنے کی ہامی نہ بھرتا اور انیگلو انڈین افسروں اور حاکموں کو جو ہمدردی کہ اب کالج کے ساتھ ہے وہ ہرگز باقی نہ رہتی۔ اور اگر انھوں نے اختلاف ہی کیا تھا تو بل پاس ہو جانے کے بعد لازم تھا کہ اُس کو خوشی سے منظور کر لیتے اور سمجھ لیتے کہ اگر اس تجویز کے نتائج خاطر خواہ نہ نکلے تو ہر وقت اس تجویز کا تدارک اور دفعۂ مذکور کی ترمیم ہو سکتی ہے لیکن اگر اُس مخالفت پر باوجود پاس ہو جانے بل کے برابر اصرار کرتے رہے تو کالج کو سخت صدمہ پہنچے گا اور مسلمانوں کی پھوٹ اور نااتفاقی پر سارا زمانہ ہنسے گا۔ یہ کہنا کہ ہم حق پر تھے اور اس لیے ہم کو غلط مجارٹی کا اتباع کرنا ضرور نہ تھا، بالکل ایسی بات ہے جیسے دو فریق قرعہ اندازی پر فیصلہ کا

انحصار کریں اور جب قرعہ کسی فریق کے خاطر خواہ نہ نکلے تو یہ عذر کرے کہ اس میں میری حق تلفی ہوتی ہے اس لیے میں اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا۔

الغرض بل پاس ہو جانے کے بعد اگرچہ مولوی صاحب اور اُن کی پارٹی کالج سے بالکل بے تعلق ہو گئی تھی مگر مدت تک اُن کے نام ٹرسٹیوں کی جماعت میں بدستور قائم رکھے گئے اور مثل تمام ٹرسٹیوں کے سرسید اُن سے بھی کالج کے معاملات میں برابر مشورہ اور رائے طلب کرتے رہے لیکن چونکہ وہ تمام کارروائی کو جو جدید قواعد کے بموجب کی جاتی تھی۔ غلط سمجھتے تھے اس لیے اُنھوں نے کبھی کچھ جواب نہیں دیا اور آخر ایک عرصہ کے بعد مجبور ہو کر اُن کا نام ٹرسٹیوں کی جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد نواب سر وقار الامرا بہادر مدار المہام ریاست حیدرآباد نے جبکہ وہ کالج کے ملاحظہ کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے ہوئے تھے، بنظر سرپرستی کالج و خیر خواہی اہلِ اسلام سرسید اور مولوی صاحب ممدوح کے درمیان صفائی کرا دی تھی چنانچہ سرسید نے سالانہ اجلاس ٹرسٹیاں میں مولوی صاحب اور اُن کی پارٹی کے نام پھر ٹرسٹیوں میں داخل ہونے کی تحریک کی اور تمام حاضرین جلسہ نے بہت خوشی سے اُس کو منظور کیا، مگر بعض معقول وجوہات پر جن کی تفصیل طولانی ہے اُنھوں نے ٹرسٹی بننا منظور نہیں کیا اور جو صفائی کہ ہز اکسیلنسی نے کرائی تھی سرسید کی زندگی میں اُس پر کوئی عمدہ نتیجہ مترتب نہ ہوا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ جولائی میں نواب لفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب نے مسلمانوں کی بدبختی پر رحم فرما کر آنریبل سید محمود اور مولوی سمیع اللہ خاں سی ام جی کے باہم پھر صفائی کرا دی ہے اور خدا کی ذات سے امید ہے کہ اس صفائی کا انجام بہتر ہوگا اور تمام

لائق اور ذی رعب مسلمان متفق ہو کر اس قومی انسٹیٹیوشن کے استحکام و دوام اور ترقی میں دل و جان سے کوشش کریں گے۔

اگرچہ قوم کے اُن دو معزز ممبروں میں صفائی ہو جانے کے بعد ہمارا ہرگز جی نہ چاہتا تھا کہ ٹرسٹی بل کے ناگوار واقعہ کا ذکر کر کے ناظرین کو وہ نامبارک زمانہ یاد دلائیں جو قومی کالج اور قومی تعلیم کے حق میں ایک سخت مصیبت کا زمانہ تھا مگر چونکہ سرسید کی بائیوگرافی میں اُن تمام واقعات کا جن سے اُن کے اخلاق پر کوئی روشنی پڑتی ہو، استقصا کرنا ضرور ہے اس لیے جو کچھ اس معاملہ کے متعلق ہم کو معلوم تھا یا ہماری سمجھ میں آیا بے کم و کاست بیان کر دیا گیا۔

# کالج کے روپیے میں غبن ہونا

عربی میں یہ مثل مشہور ہے "الهُمُوم بقدر الهِمَم" یعنی جس قدر ہمتیں عالی ہوتی ہیں اسی قدر رنج و غم زیادہ ہوتے ہیں۔ سرسید نے کالج کے عشق میں اتنے کام اپنے سر دھر لیے تھے کہ ایک آدمی کا اُن سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار تھا۔ آخر ۱۸۹۵ء میں اُن کو کالج کی بدولت ایک ایسا دھچکا لگا جس کا صدمہ اخیر دم تک فراموش نہیں ہوا۔ منجملہ اہلکاران دفتر سکرٹری کے ایک شخص شام بہاری لال جون ۱۸۸۳ء سے ہیڈ کلرک کے عہدہ پر مامور تھا جو علیگڑھ کے ایک ممتاز کایستھ خاندان کا آدمی تھا اس کا باپ پنجاب میں تحصیلدار اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا اور اب پنشن پاتا تھا اس کا دادا لفٹننٹی پنجاب میں میر منشی تھا سرسید نے اس کو ایک اشراف خاندان کا آدمی سمجھ کر اپنے انگریزی دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر کر لیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اُس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد جتایا گیا کہ یہ پنجاب میں سرکاری ملازم تھا اور وہاں سرکاری

روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزا ے قید پا چکا ہے مگر سرسید نے اس خیال سے کہ اول تو یہاں اُس کی تحویل میں کچھ روپیہ نہیں رہتا جس میں غبن کا احتمال ہو دوسرے اشراف آدمی ایک دفعہ زک اٹھا کر پھر ویسی ہی خطا نہیں کرتا اُس کو بدستور اس کے عہدہ پر بحال رکھا۔ سرسید میں ایک خاص خصلت تھی جس کو اگرچہ پُرانی سوسائٹی میں ایک نہایت شریفانہ خصلت خیال کیا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں وہ سخت اعتراض کے قابل سمجھی جاتی ہے خاصکر اُس صورت میں جبکہ اُس کا اثر ذاتی معاملات سے گذر کر قومی معاملات تک پہنچ جائے۔ اُن میں ایک خاص قسم کی مروت بدرجہ غایت تھی وہ کسی کو ملازم رکھ کر، عام اس سے کہ اُن کا ذاتی ملازم ہو یا نہ ہو، باوجود متواتر شکایتوں کے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُس کے باب میں کسی قسم کی شکایت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ کسی کی نسبت اُن کو مطلق بدگمانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں پر پورا اعتماد کر لیتے تھے اور جو کام اُن کو سپرد کر دیتے تھے اُس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتے تھے۔ اگرچہ بغیر اعتبار کے دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا۔ لیکن اس مشہور قول کے موافق کہ "الحزم سُوء الظّن" ضرور ہے کہ کبھی کبھی امتحاناً اپنے ماتحتوں کے کام کو جانچ لیا جائے تاکہ اُن کے دل میں ڈر رہے اور وہ ہر ایک بات کا اپنے تئیں جوابدہ سمجھتے رہیں، مگر سرسید کے دل میں کبھی اس قسم کے امتحان کا خیال نہ آتا تھا۔ شام بہاری لال جون ۸۳ء سنہ سے جولائی ۹۵ء سنہ تک اُن کے دفتر میں رہا اس عرصہ میں کبھی اُس نے یہ نہیں جانا کہ مجھ سے کوئی باز پرس کرنے والا ہے یا نہیں۔

کالج کا بہت سا روپیہ بنک بنگال میں بصیغۂ امانت جمع رہتا تھا جو وقتاً فوقتاً بحسب ضرورت چیکوں کے ذریعہ سے وصول کیا جاتا تھا اور کچھ پرائیویٹ

نوٹ مالیت کالج بطور کیپٹل منڈ کے بینک کی سپردگی میں تھے جن کا منافع
تقریباً دو ہزار سالانہ بینک سے ہر سال وصول ہوتا تھا چیک بک سرسید کے
پاس ایک بکس میں بند رہتی تھی اور اُس کی کنجی بھی انھیں کے پاس رہتی تھی مگر
جب چیک جاری کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو شام بہاری لال سرسید سے
کنجی لے کر چیک نکال لیتا تھا اور اس کی خانہ پُری کر کے سرسید سے دستخط
کرا لیتا تھا اور چیک جاری کر دیتا تھا۔ سرسید چونکہ انگریزی نہیں جانتے تھے اور
کلرک پر اعتماد رکھتے تھے بے تامل چیک پر دستخط کر دیتے تھے کئی سال تک تو وہ
ٹھیک ٹھیک کام کرتا رہا مگر جب اُس نے دیکھا کہ سکرٹری کو اس پر پورا اعتماد
ہوگیا ہے اس نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کیے جب چاہتا سکرٹری سے کنجی لے
کر چیک نکال لیتا اور جس قدر روپیہ چاہتا اُس میں درج کر کے کبھی خود سکرٹری
سے دستخط کرا لیتا اور کبھی آپ ان کے جعلی دستخط بنا کر چیک جاری کر دیتا۔ یہاں
تک کہ جب زر امانت جو بینک میں جمع رہتا تھا ختم ہوگیا تو اس نے ایک
نہایت دلیری کا کام کیا۔ ۲۹ ہزار کے پرامیسری نوٹ جو بطور کیپٹل فنڈ کے
بینک کی سپردگی میں تھے اور کسی کو ان کے منافع کے سوا اصل فنڈ میں تصرف
کرنے کا اختیار نہ تھا اُن پر ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے ٹرسٹیوں کی طرف
سے ایک جعلی مختار نامہ بنایا جس میں بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً
جس قدر روپیہ کی کالج کو ضرورت ہو پرامیسری نوٹوں کی کفالت پر سودی
روپیہ قرض دیتا رہے اور سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے اس کو
بینک میں بھیج دیا۔ کچھ کم ۶۴ ہزار روپیہ تو وہ زر امانت میں سے غبن کر
چکا تھا اب نوٹوں کی کفالت پر سودی قرض بینک سے وصول کرنا شروع کیا۔
یہاں تک کہ علاوہ زر امانت کے بیالیس ہزار پانسو ستر روپیہ اور بینک

سے وصول کر کے خورد بُرد کر گیا۔

سچ یہ ہے کہ ماہ جولائی ۱۸۹۵ئہ کالج کے حق میں، سرسید کے حق میں اور خود اُس ناخدا ترس کے حق میں جس نے مسلمانوں کا کوڑی کوڑی کمایا ہوا ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپیہ شراب خواری اور عیاشی میں برباد کر دیا، سخت منحوس اور نامبارک مہینہ تھا جس کے بعد کالج کی تعمیر بالکل بند اور آگے کو چندہ کی راہ مسدود ہو گئی۔ سرسید کا اس رنج میں گویا کام ہی تمام ہو گیا اور شام بہاری لال فالج میں مبتلا ہوا۔ اسی حالت میں پکڑا گیا۔ دورہ سپرد ہوا اور نہایت تلخی اور رسوائی کے ساتھ حوالات ہی میں کچھ کھا کر مر گیا۔

اگرچہ اُس صدمہ کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے جو اس غبن فاحش سے سرسید کے دل پر گذرا ہوگا انھوں نے چھینٹوں چھینٹوں تالاب بھرا تھا اور قطرہ قطرہ اوس جمع کر کے قوم کی پیاس بجھانے کا سامان مہیا کیا تھا مگر باوجود اس سخت صدمہ کے وہ نہایت غنیمت سمجھتے تھے کہ اُن کی زندگی میں یہ راز کھل گیا تھا اور شام بہاری لال کی بداعمالی سب پر ظاہر ہو گئی اگر وہ دفعتہً سخت بیمار نہ ہو جاتا تو خدا جانے یہ مادۂ فاسد اندر ہی اندر کس حد تک پہنچ جاتا اور اُس سے آخر کو کیا نتیجے پیدا ہوتے۔ سرسید نے اُنھیں دنوں میں جب کہ شام بہاری لال پر کالج کی طرف سے فوجداری میں مقدمات دائر ہو رہے تھے راقم کو ایک خط لکھا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ان دنوں میں میری طبیعت نہایت پریشان ہے اور عدالت میں حاضر ہوتے اور مقدمات میں حلفی اظہار دینے کی تکلیف نہایت سخت معلوم ہوتی ہے مگر جو امور تقدیری ہیں اُن سے کچھ چارہ نہیں ...... بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہو

گئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں، ایک دن میں مرجاؤں گا اور جو کچھ اس نے جعلسازی کی ہے وہ سب تلپٹ ہو جائے گی مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اس کی جعلسازی اور فریب کھُل گیا۔ ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپیہ میں تصرف کیا ہے۔ پس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی یہ راز کھُل گیا۔ بعض لوگ اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضہ میں تھا۔ حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے۔ قانون ٹرسٹیان میں حکم ہے کہ روپیہ بینک میں جمع کیا جائے چنانچہ کل روپیہ بینک میں جمع تھا اور بینک کے خزانے سے بذریعۂ جعلی چیکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چیکوں کو روکنا جب تک کہ اُن کا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں۔ بہرحال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ حال کھُل گیا گو کہ مجھ کو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو۔"

الغرض جب شام بہاری لال دفعتہً فالج میں مبتلا ہوگیا اور اس کی غیبت میں بینک سے چٹھیاں موصول ہوئیں تو اُن کا مضمون سُنکر سرسید کو شبہ ہوا اُنھوں نے چیک بُک نکلوا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہت سے چیکوں کے نصف ٹکڑے جو بینک میں بھیجے جاتے ہیں ندارد ہیں اور اُن کے مثنے جو چیک بُک میں لگے رہتے ہیں وہ کورے بغیر لکھے گئے ہوئے ہیں جب روزنامچہ دیکھا تو ان نمبروں کے کسی چیک کی روانگی روزنامچہ میں مندرج نہ پائی گئی اور جو ڈراکٹ کہ چیکوں کے ساتھ حسب قاعدہ بینک میں بھیجے گئے تھے اُن کی نقل بھی رجسٹر میں نہ ملی۔ آخر جب سرسید نے بینک سے خط کتابت شروع کی اور وہاں سے تمام کاغذات کی نقلیں منگوائیں تو کلرک کی تمام چوریاں اور جعلسازیاں من وعن ظاہر ہوگئیں۔ انھوں نے حسب منشائے قانون ٹرسٹیان فوراً اس واقعہ

کی اطلاع گورنمنٹ میں بھیجدی اور دس مقدمے شام بہاری لال پر فوجداری میں دائر کیے گئے یہاں تک کہ صاحب مجسٹریٹ نے اُس کو سپردِ سشن کردیا لیکن ابھی عدالتِ سشن میں روبکاری کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ وہ حوالات ہی میں غالباً کچھ کھاکر دفعتاً مرگیا۔

سرسید نے جو رپورٹ سالانہ اجلاس ٹرسٹیاں منعقدہ یکم جنوری ۱۸۹۸ء میں پیش کی تھی اُس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے ایک بات کے سوا اُن تمام فرائض کے ادا کرنے میں جو بحیثیت سکرٹری ہونے کے اُن کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ بے شک اُن سے یہ بہت بڑی فروگذاشت ہوئی کہ ایک مدت دراز تک یہ دھاڑی چور چیک بُک میں سے نکال نکال کر جعلی چیک جاری کرتا رہا اور اُن کے مثنے کور سے بغیر لکھے چیک بُک میں لگے رہے اور کبھی کسی نے چک بُک کو کھول کر نہ دیکھا کہ اُس میں دن دہاڑے کیا لوٹ مچ رہی ہے اور اُس کا سبب سرسید کی وہی نیک دلی اور ان کا حُسنِ ظن تھا جس کی وجہ سے خبثِ نفس کی طرف کبھی ان کا ذہن انتقال نہ کرتا تھا جیسا کہ کہا گیا ہے۔ "اِنَّ الکَرِیْمَ اِذَا خَادَعْتَهٗ انْخَدَعَا"، یعنی کریم النفس آدمی کو جب دھوکا دوگے وہ دھوکا کھا جائے گا۔ اس ایک الزام کے سوا کسی قسم کی گرفت سرسید پر نہیں کی جاسکتی۔ اُن کا کلرک کی انگریزی تحریروں پر بلا تامل دستخط کردینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ تمام دفاتر سرکاری وغیر سرکاری میں اسی طرح ماتحتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے کیونکہ اگر اُن پر ایسا اعتماد نہ کیا جائے اور خواہی نخواہی اُن کے کام کو مشتبہ سمجھا جائے تو ہرگز کام نہیں چل سکتا۔ اس کے سوا کلرک مذکور نے تمام جعلی چیکوں اور جعلی ڈاکٹوں پر سرسید سے دستخط نہیں کرائے بلکہ زیادہ تر اپنے ہاتھ سے جعلی دستخط بناکر چیک جاری

کیے. جو روپیہ نوٹوں کی کفالت پر بطور سودی قرض کے بینک سے وصول کیا گیا اس کا الزام بھی عائد نہیں ہوتا. کیونکہ ان کو ہر طرح سے اطمینان تھا اور اطمینان ہونا چاہیے تھا کہ کیپٹل فنڈ کی کفالت پر بینک کسی کو ایک حبہ قرض نہیں دے سکتا. اور جعلی مختار نامہ کلرک نے بینک میں بھیج کر اس کو دھوکا دیا اس کا کسی کو سان گمان بھی نہ تھا. نہ اس پر سرسید کے اصلی دستخط تھے اور نہ کسی ٹرسٹی کے، بلکہ سب کے دستخط کلرک نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے اور مختار نامہ بالا ہی بالا تیار کر کے بینک کو چلتا کر دیا تھا. مرزا عابد علی بیگ صاحب ٹرسٹی کالج اور سید ولایت حسین صاحب بی. اے سکنڈ ماسٹر اسکول ڈیپارٹمنٹ نے جو تین مہینے کی لگاتار کوشش اور محنت سے کالج کے حساب کی ابتدا سے اخیر تک جانچ پڑتال کی اور اس کا مقابلہ بینک کے حسابات سے کیا اس سے جیسا کہ سرسید کی رپورٹ میں درج ہے. صاف پایا جاتا ہے کہ بینک میں پہنچنے سے پہلے کسی طرح کا تغلب دفتر سکرٹری میں نہیں ہوا، بلکہ بینک میں پہنچنے کے بعد جعلی چیکوں کے ذریعہ سے روپیہ نکلوایا گیا. چنانچہ سرسید کی رپورٹ مذکورۂ بالا سُنکر تمام ٹرسٹیوں نے جو جلسہ میں حاضر تھے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ سرسید نے جو احتیاط کہ ممکن تھی اس میں کسی طرح کی فروگذاشت نہیں کی اور جس طریقے سے کہ غبن وقوع میں آیا اس کا احتمال بہت کم ہوتا ہے اور شام بہاری لال کے ہاتھ میں کسی رقم وصولی کا نہ رہنا اور تمام رقوم مندرجہ روزنامچہ کا بالیقین بینک میں جمع ہو جانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ سرسید کو کلرک کی نسبت کسی طرح کی بے اطمینانی نہ ہو. اسی بنا پر جملہ حاضرین نے بالاتفاق ایک ووٹ اوف تھنکس لفیٹنس اس مضمون کا پاس کیا کہ سرسید نے حساباتِ کالج میں کوئی دقیقہ احتیاط کا فروگذاشت نہیں کیا اور ہیڈ کلرک

پر اُس سے زیادہ بھروسا نہیں کیا جیسا کہ انگریزی دفتروں میں عموماً ایسے عہدہ داروں پر کیا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے اس ووٹ کے پاس ہونے کا حال سُنکر کہا کہ "ٹرسٹی اگر ایسا ووٹ پاس نہ کرتے تو اور کیا کرتے؛ وہ خود اُس الزام میں جس سے اُنھوں نے سکرٹری کو بری کرنا چاہا ہے، سکرٹری کے شریک غالب تھے۔ حق یہ ہے کہ ٹرسٹیوں کے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ہمارے نزدیک مولوی سمیع اللہ خاں نے اپنے خط موسومہ سکرٹری مورخہ ۲۵ جنوری ۱۸۹۶ء میں بالکل صحیح لکھا تھا کہ "اگر ٹرسٹی نگرانی کرتے اور سال میں دو سال میں بھی کبھی اپنے فرض کے پورا کرنے کے خیال سے حسابات کو کالج کے جانچتے تو یہ لاکھ روپیہ سے زیادہ کے تغلب کی مصیبت، جس میں مسلمانوں کا روپیہ برباد گیا، کالج پر کیوں نازل ہوتی۔ سچی بات یہ ہے کہ گو مسلمان قومی تعلیم میں روپیہ خرچ کرنا سیکھ گئے ہیں مگر روپیہ دینے کے بعد پھر اُس کی خبر لینی بالکل نہیں جانتے اور ٹرسٹیوں میں ایسے لوگ شاذونادر ہی نکلیں گے جو اپنے تئیں کالج کے کسی معاملہ کا ذمہ دار سمجھتے ہوں پس جب تک مسلمانوں میں یہ خیال پیدا نہ ہوگا کہ جو روپیہ ہم نے قوم کی تعلیم کیلئے دیا ہے وہ کیونکر خرچ ہوتا ہے اور اُسکے محفوظ رہنے کا کیا انتظام کیا گیا ہے۔ اور جب تک تمام ٹرسٹی اپنے تئیں کالج کے معاملات کا جوابدہ نہ سمجھیں گے اور اپنے فرائض کو جو قانون ٹرسٹیان میں بیان ہوئے ہیں ہمیشہ نصب العین نہ رکھیں گے اُس وقت تک کالج کا سرمایہ بدستور خطرے میں رہے گا۔ ایک سکرٹری کس کس چیز کی خبر رکھے گا اور کہاں کہاں اپنا ذہن دوڑائے گا اور ایک قحط زدہ قوم میں ایسا جامع حیثیات سکرٹری کہاں سے آئے گا جو فکر معاش سے فارغ البال اور خانگی بکھیڑوں سے بالکل آزاد ہو۔ رات دن کالج کے انتظام میں مصروف رہے اور جب روپیہ کی ضرورت ہو تو در در بھیک مانگتا پھرے۔ گورنمنٹ اور

قوم دونوں کا معتمد علیہ ہو، سیکریٹری ہو، رائٹر ہو، خزانچی ہو اور با وجود ان تمام باتوں کے ایک نہایت کار آموزہ کلرک بھی ہو جو کلرکوں کی چالاکیوں سے بخوبی آگاہ اور خبردار ہو۔

# سرسیّد کی وفات

اگرچہ غبن کے واقعہ نے سرسید کی خوش دلی کو بہت کچھ مکدّر کر دیا تھا مگر اس صدمہ سے اُن کی طبیعت ایسی مغلوب نہیں ہوئی تھی کہ اُن کی ہمت اور کوشش میں فتور آجائے وہ تمام قومی خدمات اپنی قدیم عادت کے موافق برابر انجام دیتے تھے اور غبن کے سبب سے جو نقصان کالج کو پہنچا تھا اُس کے تدارک کی فکر سے بھی غافل نہ تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس خلش سے ابھی نجات نہ ہوئی تھی کہ اُن کو ایک ایسی لاعلاج مصیبت پیش آئی جس کا اعادہ کرنا اُس سے زیادہ سخت مصیبت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء کے نصف اخیر میں اس بیٹے کی علالت اور سوء مزاج نے جس پر نہ صرف باپ کو بلکہ تمام قوم کو فخر تھا سرسید کو آرے کی طرح بٹھا دیا۔ گو بظاہر وہ اس مصیبت کو اخیر دم تک نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ اور ایسے تحمل کے ساتھ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، برابر جھیلتے رہے مگر یہ صدمہ اندر ہی اندر کام تمام کرتا جاتا تھا۔ جو تلخ اور ناگوار حالت اس زمانے میں اُن پر گزری اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرض الموت میں ایک بڑے ڈاکٹر نے اُن کے ملاحظہ کے بعد لوگوں سے کہا کہ اگر یہ صدمہ اُن کو نہ پہنچتا تو اُن کے قویٰ ایسے عمدہ تھے کہ پندرہ بیس برس تک اور زندہ رہ سکتے تھے۔ باوجود ایسی تلخ حالت کے کبھی کسی نے اس کوہ وقار شخص کی زبان سے کوئی شکایت یا افسوس کا کلمہ نہ سُنا ہو گا۔ مرنے سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے اُن کو چُپ لگ گئی تھی، بولتے بہت کم تھے اور ہاں

اور نہیں کے سوا بات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ اُن کے یارِ غار محسن الملک اور سید زین العابدین خاں گھنٹوں اُن کے پاس خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ صحبت کا لطف بالکل جاتا رہا تھا۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا کہ آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟ سرسید نے کہا "اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔"

باایں ہمہ قومی خدمات کی دُھن اور خاصکر کالج کی بہبودی کا خیال کبھی اُن کے دل سے فراموش نہ ہوتا تھا۔ اسی حالت میں انھوں نے متعدد آرٹکل تعلیم پر لکھے۔ انھیں دنوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کے خلاف جب نیسری بار جھگڑا اٹھا تو انھوں نے اس معاملہ کی نسبت پھر اپنی قدیم رائے مرنے سے آٹھ دن پہلے ظاہر کی اور گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی اور جو کمیٹی الہ آباد میں اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت کے لیے قائم کی گئی تھی اُس سے خط و کتابت کی اور باوجود ہر طرح کی معذوری کے تا بمقدور اس کی تائید کرنے کا وعدہ کیا۔ اُنھیں دنوں میں ایک عیسائی نے رسالہ اُمّہات المومنین اسلام کے برخلاف شائع کیا تھا جس میں آنحضرت صلعم کی ازواج اور آپ کے اخلاق پر نہایت دیدہ دہنی سے اعتراض لکھے تھے۔ سرسید نے اول بطور تمہید کے ایک آرٹکل اصول تنقید روایات سنن پر اسی رسالہ کو دیکھ کر لکھا اس کے بعد اُس کا جواب لکھنا شروع کیا۔ یہ جواب[1] ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۴ مارچ ۹۸ء کو احتباسِ بول کا عارضہ ہوا۔ صاحب سول سرجن علیگڑھ بڑی توجہ سے علاج کرنے لگے اور میرٹھ کے مشہور میڈیکل آفیسر ڈاکٹر موریاٹی کو بھی مشورہ کے لیے بلایا گیا مگر چونکہ

---

[1] یہ جواب جس قدر لکھا گیا تھا، کالج میگزین میں چھپ گیا ہے ۱۲-

وقت موعود آپہنچا تھا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ۲۶ کی شام کو علامات ردیّہ ظاہر ہونے لگیں۔ ۲۷ مارچ کی صبح سے نہایت سخت درد سر لاحق ہوا جو اس بات کی علامت تھی کہ یورک ایسڈ دوران خون میں شامل ہو کر جلد جلد دماغ پر اپنا اثر کر رہا ہے۔ اسی دن شام کو شدید لرزہ کے ساتھ تپ چڑھی اور تھوڑی سی دیر میں ہذیان کی صورت پیدا ہو گئی۔ اُن کی عادت تھی کہ ہمیشہ بیماری کی شدت میں "حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل" بار بار پڑھا کرتے تھے۔ اس دفعہ بھی ہذیان کی حالت طاری ہونے سے پہلے قرآن کی یہ دو آیتیں برابر اُن کی زبان پر جاری رہیں "حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۲ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" مگر تپ کی شدت اور ہذیان کی حالت میں کوئی بات جو سمجھ میں آئے اُن کی زبان سے نہیں نکلی، گویا کہ تپ کے چڑھتے ہی تھوڑی دیر بعد احتضار شروع ہو گیا تھا۔ تین گھنٹے سخت کرب اور بے چینی رہی اور رات کے دس بجے حاجی اسمٰعیل خاں کی کوٹھی میں جہاں مرنے سے دس بارہ روز پہلے حالت صحت میں وہ سید محمود کی کوٹھی سے اٹھ گئے تھے، وفات پائی۔ دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے دن کے جنازہ اٹھایا گیا۔ مدرسۃ العلوم کا کل اسٹاف اور تمام طالب علم، اسٹیشن کے یوروپین اور ہندوستانی افسر اور اہل کار، علیگڑھ کے رئیس اور ہر درجہ کے مسلمان ہندو اور عیسائی اس کثرت سے جنازہ کے ساتھ تھے کہ غالباً علیگڑھ میں اس (نوعیت کا) ازدحام کسی نے نہ دیکھا ہو گا۔ جو راج مزدور، بڑھئی اور سنگتراش ۲۵، ۲۶ برس سے کالج میں کام کرتے تھے وہ اور اُن کی عورتیں اور بچے جو دیہات سے یہ خبر سُن کر آئے تھے جنازہ کی گذرگاہ کے ایک جانب کھڑے ہوئے نہایت حسرت بھری نگاہ سے

اپنے مربی کے جنازہ کو تک رہے تھے اور اکثر طالب علم زار و قطار روتے جاتے تھے۔ الغرض ۶ بجے کے بعد کرکٹ فیلڈ میں جنازہ کی نماز ہوئی۔ نماز کے بعد جب جنازہ فیلڈ سے بورڈنگ ہاؤس کے احاطہ میں داخل ہوا تو گارڈ آف آنر نے، جو گورنمنٹ کی طرف سے مامور ہوا تھا، پریزیڈنٹ اوف آنرس کی سلامی اتاری اور قبیل مغرب مسجد مدرسۃ العلوم کے شمالی پہلو پر جو تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اس کے احاطہ کے اندر بے کار پڑی تھی، وہاں اس قوم کی امید گاہ اور پشت پناہ کو دفن کیا گیا۔

قوم را سرمایۂ مجدد علا از دست رفت
بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند

تا قیامت گو نی از تاراج ما فارغ شدند
کایں مصیبت بر سر اسلامیاں انداختند

اگرچہ سرسید کی وفات کی بے شمار تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن دو عربی مادے عجیب و غریب نکلے ہیں ایک "غُفِرَ لَہٗ" اور دوسری قرآن مجید کی یہ آیت "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ"[1]

اس شخص کے مرنے پر جس غیر معمولی طریقے سے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ غیر قوموں نے اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر ملکوں میں بھی رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا ہے، اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ تعزیت کے کچھ کم دو سو تار جن میں سے کسی قدر بذریعہ کالج میگزین کے شائع کیے گیے تھے، اطراف ہندوستان

---

[1] اس آیت میں عیسیٰ کی طرف خطاب ہے جس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھ کو موت دینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تجھکو کافروں کے الزام سے پاک کرنے والا ہوں ۱۲

سے اُن کے بیٹے کے نام پہنچے اور تمام ہندوستان میں شاید ہی کوئی اسلامی انجمن یا سوسائٹی ایسی رہ گئی ہوگی جس میں سرسید کی وفات پر ماتمی جلسہ اور رنج و ملال کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ حضور وائسرائے اور نواب لفٹنٹ گورنر کے علاوہ اکثر یورپین افسروں اور حاکموں نے بذریعۂ تار یا تحریر یا تقریر کے اس بزرگ کی موت پر رنج ظاہر کیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر نے صاحب کلکٹر علیگڑھ کو بذریعہ تار کے اطلاع دی کہ ہز آنر کی طرف سے جنازہ کی مشایعت اور دفن میں شریک ہوں۔ ملک میں کوئی انگریزی یا دیسی اخبار ایسا نہ ہوگا جس میں بار بار اس عالمگیر حادثہ پر آرٹیکل یا نوٹ نہ لکھے گئے ہوں اور بہت سے اخباروں نے تو آج تک اپنے کالم اس مضمون کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں میں (جیسے ٹائمز آف لندن، پال مال گزٹ۔ ایوننگ سٹینڈرڈ، ایکو، پیپل۔ ڈیلی میل، لا نڈنز، ایوننگ نیوز وغیرہ وغیرہ) اس واقعہ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجے کی پولٹکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا گیا اور اینگلو انڈین اور مسلمانوں دونوں کے لیے ایک عام مصیبت بیان کیا گیا۔

انگلستان میں جو ایک مسلمانوں کی سوسائٹی موسوم بہ ''مسلم پیٹریاٹک لیگ'' ہے اُس میں بھی سرسید کی وفات پر ایک ماتمی جلسہ کیا گیا جس میں مولوی رفیع الدین احمد نے ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا تھا کہ سرسید کی خدمات کا شکریہ اور ان کی وفات پر رنج و افسوس اور اُن کے وارثوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ ٹائمز آف لندن نے بھی اس جلسہ کا ذکر کیا تھا اور سرسید کی وفات پر ایک لمبا آرٹیکل چھاپا تھا جس میں لکھا تھا کہ وہ (یعنی سرسید) اپنے ہم مذہبوں کی حمایت میں اُن کو سائنس کے

حملوں سے بچانے کے لیے ہمیشہ تیار رہے ہیں اور خود ہمارے کالموں نے اور بعض بڑے بڑے میگزینوں نے اُن کی اس علمی اور منطقی لیاقت کی شہادت دی ہے۔ جو انھوں نے اپنی قوم کی حمایت میں ظاہر کی" اس کے بعد اُس میں لکھا تھا کہ "کسی شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اُن کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے ضروری معاملے کا خیال دلوانے میں اُن کے کام کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا۔ فی الحقیقت جب اس معاملے میں اُن کی عمر بھر کی لگاتار کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔ علیگڑھ کی سوسائٹی اس کا مطبع، اُس کا اخبار اور محمڈن کالج جو کیمبرج اور آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونے پر مسلمانوں کی شریف قوموں کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ سب اُن کی ہمت، عقل اور فراخ حوصلی کی شاندار یادگاریں ہیں۔"

پال مال گزٹ مورخہ ۲۹، مارچ میں سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ "سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارک باد دے سکیں جس قدر سرسید احمد خاں کی زندگی پر۔ وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اُس نے کیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔"

انگلستان کے اخباروں کے حوالہ سے یورپ کے اکثر اخباروں میں اور نیز ممالک اسلامیہ کے بعض عربی اخباروں میں بھی اس حادثہ پر افسوس کیا گیا تھا۔ چنانچہ المؤید میں انھیں کے حوالہ سے لکھا تھا کہ مسلمانوں میں سید مرحوم ایک بڑے زبردست پولیٹشن تھے اس لیے مرحوم کی وفات اسلامی دنیا میں ایک عالمگیر مصیبت خیال کی گئی ہے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور

مسلمانوں کو اُن کا نعم البدل عنایت کرے۔

پاینیر مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء میں اس واقعہ کی خبر پہنچتے ہی یہ لکھا گیا تھا کہ "سرسید احمد خاں جو ایک دور اندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا اُس کے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید بارآور اور نہایت زبردست پولٹیکل طاقت کا خاتمہ ہو گیا ہے جس نے موجودہ صدی کے اخیر ربع میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا تھا"

ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۹۔ مارچ ۱۸۹۸ء میں جو ایک آرٹیکل کسی اینگلو انڈین کا لکھا ہوا اس واقعہ کے متعلق چھپا تھا اُس میں سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ "اُس کا یہ خیال تھا کہ اسلام کو دوبارہ اس درجہ پر پہنچا دیا جائے جو بارھویں صدی عیسوی میں علم و حکمت کا مربی ہونے کی حیثیت سے اُس کو حاصل تھا"

جو اسپیچیں انگریزوں اور ہندوستانیوں نے اطراف ہندوستان کے ماتمی جلسوں میں سرسید کی وفات پر کی ہیں وہ گنتی اور شمار سے خارج ہیں۔ یہاں ہم صرف دو معزز اور لائق انگریزوں کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہیں۔ جن کو مدت دراز تک علیگڈھ میں رہنے اور سرسید سے ملنے جلنے اور اُن کے حالات پر غور کرنے کا اتفاق رہا۔

مسٹر پوپڈر کلکٹر و مجسٹریٹ میرٹھ نے جو تقریر میرٹھ کے ماتمی جلسہ واقع ماہ اپریل ۱۸۹۸ء میں کی اُس میں انھوں نے کہا "آج اس جلسہ میں ہم پر ایک غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ سرسید احمد کے انتقال سے نہ صرف ملک نے ایک شکر گزار رعایا سلطنت اور قوم کا بڑا خیراندیش کھو دیا ہے بلکہ حاضرین جلسہ میں سے اکثر کا ایک ذاتی دوست ہاتھ سے جاتا رہا ہے ..... اگر میں نے اُس کی زندگی کے مطالعہ میں غلطی نہیں کی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جہاں اُس میں اور

بڑے بڑے اوصاف موجود تھے اُن میں دو بہت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے،
اول اُس کی اعلیٰ درجہ کی حب الوطنی اور دوسری اعلیٰ درجہ کی دلیری اُس نے
گویا ابتدائے عمر ہی میں معلوم کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان مایوسانہ
جہالت میں ڈوبتے جاتے ہیں اور اُن کو روشن ضمیر بنانے کی سخت ضرورت
ہے۔ بڑی بڑی قومی ضرورتیں رفع کرنے کے لیے ہمیشہ بڑے آدمی درکار ہوتے
ہیں اور یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ایسا بڑا شخص اُن
کی ضرورت رفع کرنے کو اٹھا۔ سر سید احمد نے مجبوری کے ساتھ اپنے
تئیں تقدیر کے حوالہ نہیں کیا اور نہ اُس نے گورنمنٹ سے مدد چاہی کیونکہ وہ
جانتا تھا کہ جو کام اس کو درپیش ہے اگر اُس کو پورا کرنا ہے تو قوم ہی اس کو
پورا کرے گی اور اس لیے اس نے زندگی کے ایک ایسے زمانے میں جب
کہ ہم میں سے اکثر ہاتھ پاؤں ہلانے سے جی چُراتے ہیں اور باقی عمر کو اپنی ذاتی
آسائشوں اور ذاتی افزائشوں کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں، اپنا وقت، اپنی
طاقت، اپنا روپیہ اور سچ پوچھو تو اپنا سب کچھ ہم جنسوں کی بھلائی کے لیے
وقف کر دیا۔ ہم میں سے جو یہاں موجود ہیں کوئی شخص ان مشکلات کا جن کا
اُس کو مقابلہ کرنا پڑا اور اس عزم جزم کا جو ان مشکلات کے مغلوب کرنے
کے لیے مطلوب تھا، تصور اور اندازہ نہیں کر سکتا لیکن باوجود تمام مشکلات
اور تمام ناامیدیوں کے وہ اپنے منصوبہ پر کامل وثوق رکھتا تھا اور اُس کو اپنی
کوششوں کا ثمرہ مل گیا"

اس کے بعد مسٹر پورٹر نے کالج کی ابتدا اور اُس کی ترقیات کا ذکر
کرنے کے بعد کہا کہ "لندن کے سینٹ[1] پال کیتھڈرل میں سر کرسٹوفر رن

---

[1] یہ لندن میں ایک نہایت شاندار اور مشہور گرجا ہے جو عمارت اور نقشہ میں ضرب المثل ہے۔

کی لاش مدفون ہے اور اُس کی قبر پر لیٹن میں یہ مشہور کتبہ کندہ کیا ہوا ہے کہ اگر تم اُس کی یادگار تلاش کرنی چاہتے ہو تو اپنے چاروں طرف دیکھو، جن لوگوں نے یہ کتبہ وہاں کندہ کرایا تھا انھوں نے خیال کیا اور صحیح خیال کیا کہ اس بڑے نقاش کی سب سے عمدہ یادگار یہی نامی گرجا ہے جو اُس کے مجوزہ نقشہ پر بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جب تم سے لوگ سرسید کی یادگار پوچھیں تو تم بھی اُس عالیشان کالج کو بتا سکتے ہو جس کی بنیاد اُس نے ڈالی ہے اور کہہ سکتے ہو کہ اپنے چاروں طرف دیکھو۔ لیکن اگر تم اور تمہاری آئندہ نسلیں اپنے بڑے لیڈر کی زندگی کے سبقوں کو خوب ذہن نشین کر لیں گی تو اُس سے بھی زیادہ عالیشان یادگار اُس کے لیے قائم کریں گی۔ تم نہ صرف بے جان پتھر، اینٹ اور مسالے کو بلکہ ایک بڑے قومی کالج کی زندہ اور زندگی بخش طاقت کو اور اُس کے تعلیم یافتہ گروہ کی بے سقم تربیت، حب الوطنی، خود اعتباری اور سب سے بڑھ کر اُن کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی طاقت کو پیش کر سکو گے۔"

"صاحبو! ایک ایسے وقت میں جیسا کہ یہ وقت ہے میں جو ایک مختلف کونسل کا ممبر اور مختلف مذہب پر یقین رکھنے والا ہوں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم تمام اختلافات اور حسد اور عداوت کو جس نے تمہیں متفرق کر رکھا ہے اپنے مرحوم لیڈر کی قبر میں دفن کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ خفیف خفیف باتوں یا مذہبی خیالات میں تم سرسید کے ساتھ یا باہم کیسا ہی اختلاف رکھو مگر تم سب کو اُس عالیشان جانفشانی کی جو اُس نے اسلام کی حمایت میں ظاہر کی اور اُن اعلیٰ نتائج کی جو اس جانفشانی کی وجہ سے اُس نے حاصل کیے، قدر کرنی چاہیے۔ اگر تم صرف اُس کے کام ہی کو جاری رکھو گے تو یقیناً تم کو کامیابی حاصل ہو گی کیونکہ میں تم کو یاد دلاتا ہوں کہ دنیا میں اتفاق

اور صرف اتفاق ہی کا نام طاقت ہے۔"

مسٹر آرنلڈ نے جو انجمن اسلامیہ لاہور کے ماتمی جلسہ واقع ۲۹۔ مارچ سنہ مذکور میں سر سید کی وفات پر تقریر کی اُس کا ترجمہ ہم اول سے آخر تک نقل کرتے ہیں انھوں نے کہا، میں امید کرتا ہوں کہ اس موقع پر مجھ کو اس کا لحاظ ہے کہ دس برس تک اُس بزرگ اور شریف آدمی کی خدمت میں مجھے رہنا نصیب ہوا ہے جس کی موت پر ہم اس وقت رنج والم ظاہر کرتے ہیں چند الفاظ کہنے کی اجازت دی جائے گی۔

مجھ کو دس برس تک اس عجیب و غریب اور بالاترین شخص سے تقرب اور دوستی کی عزت حاصل رہی ہے۔ نہیں نہیں بلکہ فرزند کے شفقت بھرے لفظ سے انھوں نے مجھ کو مخاطب کیا ہے۔ اس دس برس میں سوائے زمانۂ تعطیل کے مجھ کو سر سید سے روزانہ ملنے جلنے کا اتفاق رہا۔ اُن کا مکان میرے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جس کا دروازہ ہر وقت میرے لیے کھلا رہتا تھا جس قدر سر سید سے کوئی شخص زیادہ واقف ہوتا تھا اُسی قدر اُن کی بزرگی اور عظمت کا زیادہ معترف ہوتا تھا کیونکہ حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سید احمد خاں اس کے مستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں مجتمع ہوں، وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا، اس کا اثر اس سوچنے والے عالم کا سا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اُکساتے بلکہ علانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لیے آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے۔

اگر اس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ
رہے۔ ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے
کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں
کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اُس سے پہلے کسی شخص کو بغیر
تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہوا۔ سرسید نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ کاہلی،
غفلت، جہالت اور ذلت سے جن میں وہ مبتلا تھے اپنے تئیں نکالیں اور دیکھو
اس کی پکار پر ایک نئی نسل اٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگوں نے سرسید کو چھوٹا سمجھا، ان
کی باتوں کو بدنیتی پر محمول کیا اور چاروں طرف سے اُن پر طعن و تشنیع کی بوچھار
ہوئی مگر اُس نے تمام مخالفتوں کو سامنے سے ہٹایا اور رستے کی تمام خس و خاشاک
کو صاف کرتا ہوا اس منزل کی طرف سیدھا ہو لیا جس پر پہنچنا مقصود تھا۔ جو
منصوبے وہ باندھتا تھا اُن کی طرف سے اول گورنمنٹ کو اطمینان دلانا ہوتا
تھا جو ابتدا میں اس اندیشہ سے کہ وہ کہیں سلطنت کے استحکام اور ملک
کے امن میں خلل انداز نہ ہوں، مطمئن نہ تھی اور پھر اپنے ہم مذہبوں کے
تعصبات اور اوہام سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو سرسید سے اس لیے بدگمان
تھے کہ اُس نے مذہبی مسائل میں ایک نیا اسکول قائم کیا تھا جس کی وجہ سے
وہ اس کو ملحد اور بے دین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے
جس میں ہم نہایت مضبوط شہادت سرسید کی طبیعت کی اُس مقناطیسی قوت
پر پاتے ہیں جس سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی قوم
میں جس کی قومیت کی بنیاد صرف مذہب پر قائم ہو اور ایسی حالت میں جب
کہ وہ نیچری اور کافر سمجھا جاتا ہو اپنی قوم کو مسلّم سردار مانا گیا۔ تاریخ اسلام میں
بہت سی مثالیں ایسی تحریکوں کی پائی جاتی ہیں جن کو مذہبی پیشواؤں نے

شروع کرکے تکمیل تک پہنچایا اور ہزاروں پیرو ان لوگوں میں سے جو مذہبی خیالات میں اشتراک رکھتے تھے پیدا کر لیے۔ لیکن کوئی تحریک (جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں) اسلام کی تاریخ میں ایسی نہ ملے گی جس میں ایک مسلمان شخص ایسے مسلمانوں کا سردار تسلیم ہوا ہو جو اُس کے مذہبی خیالات سے ہمدردی نہ رکھتے ہوں۔"

"جب سر آک لینڈ کالون ہندوستان سے جانے لگے تو علیگڑھ میں آئے اور اپنے دوست سید احمد خاں کے ذکر میں جن کو اُنھوں "گریٹ مین" کے لفظ سے یاد کیا تھا غدر کے اس ہولناک زمانے کا ذکر کیا جب کہ لوگوں کے دل عداوتوں سے بھرے ہوئے اور انتقام کے خیالات دلوں میں موج زن تھے اُنھوں نے کہا کہ "اس وقت کیا ہندوستانیوں میں اور کیا انگریزوں میں سر سید پہلے شخص تھے جنھوں نے اس سوال کی طرف توجہ کی کہ اس خرابی کا کیوں کر علاج ہو اور حاکم و محکوم میں کس طرح آشتی پیدا ہو۔"

"سر سید نے غدر ۵۷ء کے بعد سب سے پہلے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں دوستی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اُس وقت سے مرتے دم تک وہ اسی بات میں کوشش کرتے رہے کہ قلم سے زبان سے اور نصیحت و تنبیہ سے حاکم اور محکوم کے زخموں پر مرہم لگائیں اور ان میں ایک مضبوط اتفاق پیدا کریں۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے سر سید کی قدر و منزلت ہوئی لیکن یہ عزت اور خطاب ہمیشہ بے طلب آئے۔ دنیا کے سگ طینت لوگ اس بات پر جس قدر اُن کا جی چاہے بھونکیں لیکن میں جو برسوں سے سر سید کو جانتا ہوں اس بات کو سچ سمجھتا ہوں میں آج تک کبھی کسی ایسے شخص سے نہیں ملا ہوں جس نے سر سید سے

زیادہ شریف زندگانی بسر کی ہو جو جاہ طلبی میں اُن سے زیادہ بے غرض ہو اور جو اُن سے زیادہ سچ کا حامی اور دوسروں کی خدمت پر اپنے تئیں وقف کر دینے والا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آج ہم اُسکی موت پر رو رہے ہیں اب اُس جیسا کوئی کہاں ملے گا۔"

"ایک اور بات رہ گئی ہے جس کو میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کے یہ آنسو جھوٹے نہیں ہیں اور آپ جو سرسید کے ہم مذہب اور ثناخواں ہیں اگر آپ کا یہ غم و الم سچا ہے تو کیا آپ کو رونے کے علاوہ کوئی اور کام باقی نہیں ہے! سمجھ لیجیے کہ یہ شخص جس کو آپ رو رہے ہیں یہ اس قدر مفلس تھا کہ نہ اُس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔ لیکن پھر بھی اس نے ایک دولت آپ کے لیے چھوڑی ہے وہ آپ ہی کیلئے یہ کام چھوڑ گیا ہے کہ تعصب اور جہالت کے مقابلہ میں شریفانہ لڑائی جاری رکھو اور آپ ہی کے سپرد یہ کام کر گیا ہے کہ اپنی افتادہ قوم کو اٹھاؤ اور موجودہ فرائض زندگی جو کچھ ہیں اُن سے اپنی قوم کی مصالحت کراؤ۔ اس شخص نے آپ کے لیے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے کہ اگر آپ نے اس کی پیروی کی تو وہ آپ کے اور آپ کی اولاد کے قبضہ میں سب سے بڑی دولت ہوگی۔"

جس قدر مرثیے اُردو، فارسی اور انگریزی میں اس حادثہ پر لکھے گئے ہیں ظاہرا واقعۂ کربلا کے بعد کسی شخص کی موت پر نہ لکھے گئے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ جعفر بن یحییٰ برمکی اور معن بن زائدہ شیبانی کے مرنے پر بھی شعرائے عرب نے بے شمار مرثیے لکھے تھے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ تعداد میں سرسید کے مرثیوں سے کچھ کم نہ تھے تو بھی وہ مرثیے ان مرثیوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ ان میں شعرا اپنے ذاتی فائدوں اور شخصی منفعتوں کو روتے تھے جو اُن کی ذات کو جعفر اور معن کے بذل و عطا سے ہمیشہ پہنچتی تھیں اور ان میں اُس نقصان عظیم پر

افسوس کیا گیا ہے جو قوم کے تمام افراد کو ایک شخص کے مرنے سے پہنچا ہے۔ وہ اُن شخصوں کی شان میں لکھے گئے تھے جو لوگوں کی جیبیں درہم و دینار سے بھرتے تھے اور یہ اُس شخص کے لیے لکھے گئے ہیں جو لوگوں کی جیبیں خالی کرتا تھا۔ اُن کا موضوع ایک خاندان یا ایک قبیلہ کی تباہی پر افسوس کرنا تھا اور اِن کا موضوع تمام قوم کی مصیبت پر رنج و افسوس کرنا ہے۔ عرب کے ایک شاعر اشجع بن عمر سلمی نے جو اشعار اپنے باپ کے مرثیہ میں بطور مبالغہ کے لکھے تھے سچ یہ ہے کہ سرسید سے بہتر اُن کے مضمون کا کوئی مصداق نہیں ہو سکتا۔

"مَضَى ابْنُ سَعِيدٍ حِيْنَ لَمْ يَبْقَ مَشْرِقٌ — وَلَا مَغْرِبٌ اِلَّا لَهُ فِيْهِ مَادِحٌ
وَمَا كُنْتُ اَدْرِيْ مَا فَوَاضِلُ كَفِّهِ — عَلَى النَّاسِ حَتّٰى غَيَّبَتْهُ الصَّفَائِحُ
كَاَنْ لَمْ يَمُتْ حَيٌّ سِوَاهُ وَلَمْ تَقُمْ — عَلٰى اَحَدٍ اِلَّا عَلَيْهِ النَّوَائِحُ"

ترجمہ: ابن سعید گزر گیا جب کہ مشرق اور مغرب میں کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں اُس کا کوئی نہ کوئی مداح نہ ہو جب تک کہ وہ قبر میں دفن نہ کیا گیا میں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں پر اُس کے قدر احسانات ہیں۔ گویا اس کے سوا دنیا نہ کوئی زندہ آدمی مرا ہے اور نہ کسی پر نوحہ کیا گیا ہے۔)

منجملہ اُن بے شمار مرثیوں اور نوحوں کے جو اس حادثۂ عظیم پر لکھے گئے ہیں چند اشعار ایک یوروپین فاضل لیڈی نے بھی انگریزی زبان میں ترتیب دیئے ہیں چونکہ لٹریری دنیا میں شاید یہ پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیہ کے اپنی زبان میں لکھے اس لیے ہم اس لطیف سونٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اِس مقام پر لکھتے ہیں:

"ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اُس کی سایہ دار شاخیں

جو چاروں طرف دور تک جھومتی نصب صحت بخش شبنم اُن سے ٹپکتی تھی اور ساتھوں نے کثرت سے بیج بکھیرے تھے، ان کے سایہ میں بنجر زمین اصلاح پا گئی۔"

بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوب صورت نونہالوں نے جو طاقت اور حسن سے آراستہ تھے اس ویران ریگستان کو گلزار بنا دیا۔ روؤ! اب شاہانہ درخت کے لیے کہ اجل نے اُس کو گرا دیا ہے۔

غم کرو، مگر امید کے ساتھ، کیونکہ اس کی ہری بھری کھیتیاں جو اُس کی سالہا سال کی محنت کا ثمرہ ہیں اُس کی قبر کے گرد لہلہا رہی ہیں جن نونہالوں کو اُس نے اپنی چھاؤں میں پرورش کیا تھا وہ پھول رہے ہیں اور پھیک رہے ہیں۔ یہ نونہال بھی اُسی کی مانند زندہ رہیں گے تاکہ کسی ویرانہ کو گلزار بنا جائیں۔"

سر سید کی وفات پر لوگوں نے صرف زبانی مدح و ثنا اور مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی ہی پر بس نہیں کی بلکہ علی طور پر اس بات کا کافی ثبوت دیا ہے کہ یہ شخص اپنی راست بازی اور خلوص سے ایک عالم کے دل میں اپنی عظمت کا نقش بٹھا گیا ہے اور اپنی محبت کا بیج بو گیا ہے اور قومی ہمدردی کی چٹیک ایک ایسی مُردہ دل قوم کو لگا گیا ہے جو سرد مہری میں ضرب المثل اور نا اتفاقی میں شہرۂ آفاق تھی۔ سر سید کے مرتے ہی کچھ لوگ اُن کی ایک عظیم الشان یادگار یعنی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے جن کا اپیل مسلمانوں نے اور خاص کر پنجاب کے زندہ دل مسلمانوں نے بڑی توجہ اور نہایت ذوق شوق سے سُنا اور اس کی تائید پر فوراً کمربستہ ہو گئے۔ اہل پنجاب نے

سخت تقاضوں سے اُن کو لاہور میں بلایا اور اثنائے راہ میں اسی گرمجوشی کے ساتھ جیسی کہ سرسید کے استقبال میں ظاہر کی جاتی تھی۔ ان کی آؤبھگت اور مدارات کی گئی۔ یونیورسٹی کے لیے مالیر کوٹلہ اور لاہور میں بڑی امنگ اور چاؤ سے لوگوں نے چندہ دیا اور صرف صوبہ پنجاب سے دو لاکھ روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ لاہور کے جلسوں میں سرسید کی تصویریں جن کی آٹھ دو آنے سے زیادہ قیمت نہ تھی پانچ پانچ روپیہ کو لوگوں نے خریدیں بعض جواں مرد تاجروں نے اپنے منافع کا ایک معتد بہ حصہ سرسید کی یادگار کے لیے مخصوص کر دیا۔ اکثر تھوڑی تھوڑی تنخواہ کے ملازموں نے اپنی ایک ایک پوری تنخواہ چندے میں دیدی۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ نے بڑے شوق سے چندہ جمع کیا۔ طالب علموں کی ایک جماعت نے خاص اسی کام کے لیے دوکان لگائی تاکہ جو کچھ اُس سے فائدہ ہو اس فنڈ میں جمع کیا جائے پنجاب کے سوا اور اطراف میں بھی اس کی تحریک شروع ہوگئی ہے یہاں تک انگلستان میں جو مسلمان طلبہ کی ایک مختصر جماعت نے انجمن اسلامیہ قائم کر رکھی ہے اس میں بھی گرمجوشی سے چندہ کی تحریک ہوئی اور پہلے ہی جلسے میں حاضرین نے بیس پونڈ دینے کا وعدہ کیا اور آیندہ چندہ کے لیے کوشش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اضلاع شمال و مغرب کے بعض مقامات میں بھی معقول چندہ کیا گیا ہے اور دکن میں بھی اس کے لیے تحریک ہو رہی ہے۔ چندہ کی تعداد صرف تین مہینے میں ہی پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہے جس کی ہرگز توقع نہ تھی۔ نواب محسن الملک جنھوں نے درحقیقت سرسید کا جوا اپنے کندھے پر رکھا ہے اُن کو مسلمان اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے کہ سرسید کو دیکھتے تھے اور ہر شخص کی نظر میں اُن کی وقعت ویسی ہی ہے جیسی ان کے اُس پیشرو کی تھی۔

یہ تمام علامتیں اس بات کی ہیں کہ مسلمان قومی خدمات کی قدر کرنے لگے ہیں اور قومی ہمدردی کی آگ جو سرسید کے سینے میں مشتعل تھی اُس کو وہ اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے گئے بلکہ اُس کی آنچ دور دور پہنچ گئی ہے اور اُس ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہو گئے ہیں۔ اکثر لوگ اُن انگریزوں کی ہمدردی پر تعجب کرتے ہیں جو سرسید کی یادگار کے چندہ میں بہت خوشی سے شریک ہوئے ہیں خصوصاً لارڈ سیتلی کا انگلستان سے دو سو پونڈ بھیجنا اور مسٹر آرنلڈ کی تحریک سے لاہور میں اسی مقصد کے لیے ایک یورپین کمیٹی کا قائم ہونا، بڑے بڑے افسروں کا اس میں شریک ہونا اور معقول رقمیں چندہ میں دینا بڑے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے مگر ہم کو اس سے کچھ تعجب نہیں ہوا، ان لوگوں کا ضمیر اس سرزمین کی خاک سے ہے جہاں بنی نوع کی بھلائی کے کاموں میں لوگ اٹھ کر شریک ہوتے ہیں، انسانی ہمدردی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے قومی ریفارمروں کی کوشش سے اعلیٰ مدارج ترقی پر پہنچے ہیں اور اس لیے ہر قوم کے ریفارمر اور ہر ملک کے ہیرو کی دل سے عزت کرتے ہیں اور اُس کی یادگار قائم کرنے کو منجملہ فرائض انسانی کے سمجھتے ہیں۔ پس اُن لوگوں کا ہماری بھلائی کے کاموں میں شریک ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہاں اگر تعجب ہے تو ہم کو اپنی مردہ دل قوم کی حالت پر ہے جو اب سے تیس برس پہلے ہمدردی، قومیت اور ریفارمیشن کے مفہوم تک سے واقف نہ تھے۔ جنھوں نے سلف کے ادھورے کاموں کو پورا کرنے کا کبھی سبق نہیں پڑھا تھا۔ جو اپنی ذاتی اغراض کے سوا کسی رفاہ عام کے کام میں روپیہ خرچ کرنا مطلق نہ جانتے تھے اور بغیر حکام کے رعب وداب کے ایک پیسا ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔ ایسی قوم میں اپنے ہیرو کی یادگار قائم کرنے کا جوش، یا اُس

کے منصوبے پورے کرنے کا خیال، یا ایک قومی درسگاہ کو یونیورسٹی بنانے کا ارادہ کہاں سے پیدا ہوگیا؛ بیشک یہ تخم سرسید کے بابرکت ہاتھ کا بویا ہوا ہے جس کو اُن کی مساعی جمیلہ کا سب سے اعلیٰ اور افضل نتیجہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ اگر اُن کی کوششیں انھیں کی ذات پر ختم ہو جاتیں اور قوم میں یہ ولولہ پیدا نہ ہوتا تو ان کی تمام عمر کی جانفشانی اور محنت گویا بالکل رایگاں جاتی اور اُس گھنگھور گھٹا کی طرح جو ایک ناقابل زراعت زمین میں خوب زور شور سے برس کر کھل جائے۔ درحقیقت سرسید کی کوئی پائدار اور زندہ نشانی دنیا میں باقی نہ رہتی مگر خدا کا شکر ہے کہ اُس نے قوم میں اپنی زندہ یادگار چھوڑی ہے اور قوم کے بہت سے افراد میں وہ اپنا درد مرض متعدی کی طرح پھیلا گیا ہے۔

فَتًى عَيْشُ فِي مَعْرُوفِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ كَمَا كَانَ بَعْدَ السَّيْلِ مَجْرَاهُ مَرْتَعًا

(یعنی وہ ایک جوان مرد تھا جو مر گیا اُس کا فیض زندہ ہے جیسے رو کی گذرگاہ جب رو کا پانی نکل جاتا ہے تو مویشی کے لیے ایک سرسبز چراگاہ بن جاتی ہے)

مصر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اپنے سفر یورپ کا حال عربی زبان میں لکھا ہے۔ وہ اہلِ یورپ کی ملکی اور قومی ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اسی خصلت نے ان قوموں کو تمام دنیا کی قوموں سے بالاتر اور بزرگ تر کردیا ہے۔ یہ لوگ وطن اور قوم کی خدمت کرنے والوں کی صرف اُن خدمات کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے عام بھلائی کے لیے کی ہیں اور اُن کے عیبوں پر مطلق نظر نہیں کرتے۔" اس کے بعد اس نے اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور روس کے چند وطن دوستوں کے نام لیے ہیں اور اُن کے بڑے بڑے اخلاقی عیوب جو تاریخ میں مذکور ہیں بیان کیے ہیں اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ "اُن کے ہموطن اُن عیبوں پر بالکل نظر نہیں کرتے بلکہ اُن کے احسانات کو جو انھوں نے

قوم پر کیے ہیں یاد کر کے اُن کے نام پر سر جھکاتے ہیں، اُن کے سٹیچو جو ملک میں قائم کیے گئے ہیں اُن کی زیارت کے لیے اطراف و جوانب سے آتے ہیں اور اُن کی تعظیم کے لیے سروں سے ٹوپیاں اور تاج اُتار لیتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔"

اگرچہ ہماری قوم میں ابھی تک یہ شریف خصلت کمیاب ہے لیکن سر سید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوشِ ہمدردی لوگوں نے ظاہر کیا ہے اور جس گرمجوشی کے ساتھ سر سید کی یادگار قائم کرنے کا ولولہ قوم میں اٹھا ہے اور جس توجہ اور خوشی سے اُس کے محرکوں کا اپیل سنا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خصلت قوم میں رفتہ رفتہ ترقی کرتی جاتی ہے لوگ اپنی قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جاتے ہیں اور جو اُن ضرورتوں کے رفع کرنے پر کمر باندھتے ہیں اُن کی عظمت دلوں میں بیٹھی جاتی ہے یہی قوموں کی زندہ دلی کی علامت ہے اور یہی وہ صفت ہے کہ جس قوم میں وہ معدوم ہو جاتی ہے وہ قوم جیتے جی مر جاتی ہے۔ ؎ مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے

کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

مذکورہ بالا تحریر کے بعد معلوم ہوا کہ ۲۳، جولائی ۹۸ء کو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر اضلاع شمال مغرب محض سر سید میموریل فنڈ کمیٹی کی تائید کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے اور ایک عام جلسہ میں جس میں علیگڑھ اور اس کے گرد و نواح کے رئیس شریک تھے کمیٹی کے ایڈریس کا جواب دیتے وقت حضور لارڈ ایلگن وائسرائے کشور ہند کی چٹھی جو اس موقع پر اُن کے نام موصول ہوئی تھی، حاضرین کو پڑھ کر سنائی جس میں حضور ممدوح نے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج پر نہایت مُربیانہ توجہ اور کمیٹی کی اُن کوششوں پر جو وہ کالج کی ترقی میں کر رہی

ہے بکمال خوشنودی ظاہر فرمائی تھی اور مسلمانوں کو اور نیز غیر قوموں کو جو تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس تحریک کی اعانت پر توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا کہ "میں ہمیشہ اپنے تئیں اس وجہ سے خوش نصیب سمجھوں گا کہ سال گزشتہ میں مجھ کو علیگڑھ جانے کا موقع مل گیا اور سرسید سے ملاقات کرنے اور اس دارالعلوم کو دیکھنے کا جو سرسید کو نہایت عزیز تھا ایسی حالت میں کہ ان کی ذات کا حوصلہ بخش سایہ اُس پر چھایا ہوا تھا، امتیاز حاصل ہوا۔ اس کے بعد لکھا تھا کہ "اس دن کی یادگار میری اس خواہش کو توی کرتی ہے کہ میں بھی اپنے تئیں اُس کالج کے دوستوں کے زمرہ میں شامل کردوں اور اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جو فنڈ اب جمع ہو رہا ہے اُس میں دو ہزار کا چندہ شامل کر کے اپنی ہمدردی کا عملی اظہار کر دوں امید ہے کہ آپ ازراہ مہربانی میری اس خواہش سے کمیٹی کو مطلع کر دیں گے۔"

اس کے بعد ہز آنر کی موجودگی میں حاضرین کے سامنے چندہ کی فہرست پیش کی گئی اور اسی جلسے میں تقریباً پچیس ہزار کا چندہ جس میں حضور وائسرائے اور نواب لفٹنٹ گورنر کا چندہ بھی شامل ہے، لکھا گیا۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ "اچھے دوست کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گنجان میوہ دار درخت کہ جب تک سرسبز ہے اُس کے سایہ میں راحت ملتی ہے اور اس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہو گیا تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے" یہی مثال ہمارے ہیرو سرسید کی تھی۔ وہ بھی مسلمانوں کا ایسا ہی دوست تھا، جب تک زندہ رہا اپنے ہاتھ پاؤں زبان قلم جان اور مال سے اُن کی مدد کرتا رہا اور جب مر گیا تو اپنی محبت اور اپنے کام کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا تاکہ اُن

کی بھلائی کا کام جو اُس نے ادھورا چھوڑا ہے اُس کو سب مل کر پورا کریں حق یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا گیا ہے ؛

جَمَالُ ذِی الْاَرضِ کانوا فی الحیوۃ وَھُمْ بَعْدَ الْمَمَاتِ جَمَالُ

الْکُتُبِ وَالسِّیَرِ

# سرسید کی لائف انکی تصنیفات اور اُنکے کاموں پر تحقیق

## سرسیّد کی ترقی کے اسباب

ہمارے ملک میں ترقی کا لفظ زیادہ تر عہدہ یا منصب کی ترقی پر اطلاق کیا جاتا ہے. مگر اس موقع پر نہ ایسی ترقی سے ہماری غرض متعلق ہے اور نہ ہمارے نزدیک سرسید نے عہدہ یا منصب کے لحاظ سے ترقی کا کوئی ایسا درجہ حاصل کیا ہے جو اُن کی اعلیٰ لیاقتوں کے مقابلہ میں کچھ وزن رکھتا ہو. میرے ایک دوست سے ایک لائق انگلشمین نے سرسید کا ذکر کرتے وقت کہا کہ اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو کسی بڑی امپائر میں وزیر اعظم کے درجہ تک پہنچتا کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں اُن کو باعتبار پولیٹکل لیاقت کے سرسالار جنگ اول سے دوسرے درجہ پر رکھا ہے. مگر اخبار براڈ ایرو مطبوعہ ۱۴ر فروری ۱۸۸۶ء میں اُس پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "سید احمد خاں کو سرسالار جنگ سے دوسرے درجہ پر رکھنے میں ایک ممتاز ہندوستانی جنٹلمین کی قدر و قابلیت کا غلط اندازہ کیا گیا ہے جس کی تمام زندگی شمالی ہندوستان کے واسطے برکت اور رحمت رہی ہے"

بہر حال یہاں سرسید کی جس ترقی کے اسباب بیان کرنے مقصود ہیں وہ عہدہ اور منصب کی ترقی نہیں بلکہ وہ ترقی ہے جو بعض اوقات کسی شخص کو نہ اور منصب کے لحاظ سے اور نہ مال و دولت، وجاہ و حکومت کے اعتبار سے بلکہ اعلیٰ اور اشرف خصائل انسانی کے لحاظ سے نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ تمام قوم اور ملک میں ممتاز کر دیتی ہے۔

سرسید کی زندگی کے واقعات جو پہلے حصہ میں بیان ہو چکے ہیں اگر اُن کو محض سرسری طور پر دیکھا جائے تو بھی ان سے اس قدر ضرور ثابت ہوگا کہ ایک مسلمان جو قومی تنزل کے زمانہ میں پیدا ہوا جس نے ایک مردہ دار الخلافہ کی نیم مردہ سوسائٹی میں ہوش سنبھالا اور ہندوستان کی کمزور آب و ہوا میں نشو و نما پائی۔ اس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ نہایت جانکاہ محنت، دلی شوق اور بے نظیر استقلال کے ساتھ گورنمنٹ کی خیر اندیشی، ملک کی خیر خواہی، قوم کی خدمت اور مذہب کی حمایت میں بسر کر دی پس اس مقام پر ضرور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز نے یہ غیر معمولی تحریک اس کے دل میں پیدا کی؟ اور کیونکر وہ اس قدر طول طویل زمانہ تک ایسے استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا؟ اگرچہ اس سوال کے جواب میں صرف یہ کلام معجز نظام پیش کرنا کافی ہے کہ "کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ" (یعنی ہر شخص کو اُس کام میں جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے آسانی دی گئی ہے) لیکن چونکہ سرسید کی بائیوگرافی کو ہم آئندہ نسلوں کے لیے ایک مثال قابل تقلید سمجھتے ہیں اس لیے اُن کی ترقی کے اسباب کی تفتیش کرنا غالباً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

سرسید کی لائف میں جیسا کہ اُن کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر اُن کی ترقیات

کی بنیاد قائم کیجا سکتی ہے، قطع نظر اُن جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے سمجھنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اتفاقاتِ حسنہ نے بھی اُن کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمت مجتمع تھی۔ اُن کی ددھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور اُن کی ننھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت حسنِ تدبیر اور علم وفضل سے اپنے اقران واشال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانہ کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی ننھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم وتربیت پائی۔ انھوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھ سے دیکھا اور اچھے لائق ماموؤں کی صحبت برتی، اُن کی ماں ایک نیک نہاد سنجیدہ اور دانشمند بی بی تھیں جن کی تعلیم وتادیب سرسید جیسے جوہر قابل کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی تھی۔ انھوں نے حسنِ اتفاق سے ایسی حالت میں نشو ونما پائی کہ نہ اُن کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان
چھوڑا گیا، وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے مگر اپنے رشتہ داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ اُن پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا کہ قوائے جسمانی مضمحل ہو جائیں اور نہ ان کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی تھی کہ جدھر منہ اٹھ گیا چل نکلے۔

اُن کے والد ایک آزاد منش اور تعلقاتِ دنیوی سے الگ تھلگ رہنے والے آدمی تھے گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ

بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود طنطنہ اور رعب داب کے نہایت متحمل و بردبار تھیں پس وہ بیجا تشدد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلت بیٹھ جاتی ہے، سرسید پر کبھی نہیں گذری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی وہ اکثر رنگین جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیرزادوں سے ملنے جلنے لگے۔ سوسائٹی کا پرچھاواں اُن پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیے تھا مگر ہونہار نوجوانوں کی لغزشیں بھی اُن کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر کبھی عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لیے لہو و لعب سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتشگیر مادہ بھرا ہوا تھا وہ آخر کار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو عنفوانِ شباب میں ہوا و ہوس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حُبِّ قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا۔

؎ "دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا"

جس حد تک سرسید کی تعلیم ہوئی اُس کو بھی اُن کی ترقی کا مؤید سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی، اگر وہ پرانے طریقہ کی تعلیم پوری کر لیتے اور علوم قدیمہ کا رنگ ان پر چڑھ جاتا پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کے قبول کرنے کی قابلیت اُن میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑ بند ہو جاتے اور تعصب کے

پردے اُن کی آنکھوں پر پڑ جانے۔ نئے طریقہ کی تعلیم بھی اُن نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجہ کی سویلیزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں وہ آخرکار اس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں یہاں تک کہ وہ ان کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کیجاتی ہیں محض بے سود اور لاحاصل جاننے لگتا ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کا پرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا نہ ہونا منجملہ اُن اتفاقاتِ حسنہ کے تھا جنھوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے اُن کو جھجکنے نہیں دیا۔

اگرچہ یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں بلاشبہ ایسی ہیں جن کو سرسید کی ترقی میں بہت کچھ دخل معلوم ہوتا ہے مگر اُن میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کو اُن کی ترقی کے اسباب میں شمار کیا جائے کیونکہ یہی باتیں اکثر اوقات ترقی کی سدِ راہ دیکھی گئی ہیں۔ اس کے سوا ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور خاصکر ہماری مردہ قوم میں جس قسم کے حیرت انگیز اور عظیم الشان کام سرسید سے ظہور میں آئے ہیں اور جیسی جلیل القدر خدمتوں میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ نہایت استقلال کے ساتھ بسر کیا ہے اُن کو محض اتفاقیہ امور کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کا اپنی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنا اور چالیس برس تجرد اور بے تعلقی کی حالت میں رہنا یہی اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد تھی اگر وہ دوسرا نکاح کر لیتے تو ہرگز اُن کو ان کاموں کے سرانجام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر اس تقدیر

پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ایک چالیس بیالیس برس کے توانا تندرست ذی استطاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان شخص کو نکاح ثانی سے باز رکھا اور تجرد کی ناگوار اور تلخ زندگی پر قانع کر دیا؟

البتہ ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے جو سرسید کی لائف پر غور کرتے وقت لوگوں کے ذہن میں ضرور پیدا ہوتی ہوگی یعنی یہ کہ جب سے انگریزی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے اور یورپ کے اُن نامور لوگوں کے حالات سے جنھوں نے ملک اور قوم پر اپنی جانیں قربان کی ہیں ہندوستان کے لوگ واقف ہوئے ہیں اُس وقت سے ہندوستان میں بھی کم و بیش قومیت اور قومی ہمدردی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔ پس یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ سرسید نے بھی جو کچھ ملک یا قوم یا مذہب کی خدمت میں کیا وہ انھیں یورپ کے ریفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات سن سن کر ان کی ریس سے کیا ہو۔ لیکن اول تو جس وقت سرسید کو ملک اور قوم کی خدمت یا مذہب کی حمایت کا خیال پیدا ہوا اُس وقت تک انگریزی تعلیم ہندوستان میں نہایت محدود تھی اور مسلمانوں میں بالکل نہ تھی دوسرے اگر بالفرض یہ بات مان بھی لی جائے تو صرف اسی قدر مانی جا سکتی ہے کہ یورپ کی تاریخ سے اُن کے دل میں بھی حب وطن اور قومیت کا خیال ایسا ہی پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں ایک دودھ کا سا اُبال پیدا ہو جاتا ہے مگر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خیال ایسا پک جائے کہ ایک ہندوستان کا مسلمان قوم کی دُھن میں اپنے تئیں فنا کر دے جس طرح حالت موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے موجدوں اور مخترعوں کے حالات سُن سُن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں۔

اسی طرح یہ بھی امکان سے خارج ہے کہ یورپ کے ریفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یا زبانی سُنکر ہندوستان میں بھی ویسے ہی ملک کے جاں نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں۔

اصل یہ ہے کہ ایشیائی طرزِ حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی اور اُس کے سوا تمام طاقتوں کو فنا کرنے والی ہے اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح ابتدائے آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آئی تھی اُس نے ایشیا کی کسی قوم بلکہ بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی۔ ایک بڑے حکیم کا قول ہے کہ شخصی حکومت میں صرف ایک شخص یعنی بادشاہ، ملک کا خیرخواہ ہو سکتا ہے اور بس۔ جان سٹوارٹ مِل لکھتے ہیں کہ "اگر رعیت کو ایسا بنا دو کہ وہ ملک کے لیے کچھ نہ کر سکتے تو اس کو ملک کی کچھ پروا نہ رہے گی" اگرچہ ہندوستان میں سو برس سے طرزِ حکومت بدل گئی ہے۔ جس کا مقتضا یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں میں ملک اور قوم کی بھلائی کا خیال اور جوش پیدا ہو مگر جو سکون اور انجماد ہندوستان کی قوموں میں صد ہا پشت سے متوارث چلا آتا ہے اور جو اُن کے آب و گل میں خمیر ہو گیا ہے اُس کو برٹش طرزِ حکومت جیسی کہ وہ ہندوستان میں ہے ایک صدی میں زائل نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی نظیریں سُن سُن کر جو اکثر ہندوستانیوں کے دل میں بعض اوقات ملک اور قوم کی بھلائی کا جوش دفعۃً اُٹھتا ہے کچھ زیادہ دن نہیں گذرنے کہ وہ آوے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاصکر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پہ ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ یہ مذہب ہی میں طاقت ہے کہ انسان نہایت سخت

ریاضتوں میں اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے، تمام لذات کو اپنے اوپر حرام کر دیتا ہے۔ آگ میں تپتا ہے۔ برف میں گلتا ہے۔ گھر بار لٹا دیتا ہے اور ہر ناقابلِ برداشت تکلیف اٹھاتا ہے۔ مگر مذہب بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا ہو طرزِ حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اس میں جتنی باتیں طرزِ حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصہ ناقابلِ عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن کا نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے اور یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جن سے بلا واسطہ تمام ملک یا تمام بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پائیدار اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں آپ بھی آنکھیں بند کر کے اسی شاہراہ پر پڑ لیتے ہیں، دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنی پڑتی ہے اور مذہب کا وہ متروک حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے اس پر عمل کرنا اور اس کو رواج دینا پڑتا ہے زمانہ کی ضرورتیں اس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانی مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے اور خود مذہب اس میں استقلال پیدا کرتا ہے جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے یہیں سے اس چیز کا سراغ چلتا ہے جس نے سرسید سے تمام ملکی اور قومی خدمتیں

سر انجام کرائی ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاں تک کہ ان کی لائف شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ ان کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے ان کی تمام تحریکات کا منبع، ان کے کل مقاصدِ عالیہ کا محرک اور ان کی ہر منزل کا رہبر مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی۔

اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔ دارالخلافہ کا اخیر دور تھا اور مسلمانوں کو آخرت کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی اس لیے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ جو اس زمانہ میں دیندار مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھی، اس کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق تھا ان کے والدین خانقاہ کے مشائخ سے کمال عقیدت و ارادت رکھتے تھے اور اس لیے سرسید بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ خانقاہ میں جانے لگے تھے اور ایک مدت دراز تک انھوں نے وہاں کا رنگِ صحبت اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اُن کی والدہ کے سوا ان کے ننھیال والے جہاں اُنھوں نے نشو و نما پائی شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے معتقد تھے۔ پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے سارے گھر میں مذہب ہی کا دور دورہ دیکھا تھا، گویا مذہب ہی کی آغوش میں انھوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔ علوم جدیدہ جس عمر میں مذہب سے دل اچاٹ کر سکتے ہیں اس عمر میں سرسید پر ان کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی بلکہ زیادہ تر ان کی لے اس وقت کھلنی شروع ہوئی جب مذہب کی جڑ پتال تک پہنچ چکی تھی اور جب کہ سائنس کو

بجائے اس کے کہ مذہب کے ساتھ جنگ کرے اُس سے صلح کرنی ضرور تھی۔

چونکہ سرسید کا تمام خاندان دو ایسے خاندانوں سے عقیدت رکھتا تھا جو نہ صرف دلّی بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے اس لیے اُن کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بیہودہ اوہام اور لغو عقاید سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں، چنانچہ سرسید کہتے تھے کہ "اس زمانہ میں بھی جب کہ میرے مذہبی خیالات محققانہ اصول پر مبنی ہیں، میں اپنی والدہ کے عقاید میں ایک آدھ بات کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصول کے خلاف نہیں پاتا" یہی عقائد ابتدا سے سرسید کے دل میں ڈالے گئے تھے اور اسلام کی یہی صورت انھوں نے آنکھ کھول کر دیکھی تھی، گویا ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے اپنا قدم تحقیق کی پہلی سیڑھی پر پایا تھا۔ پھر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیفات نے اُن کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور اُن کو کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔ مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ اُن پر غالب رہا مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا، وہ انھیں سنت و بدعت و تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں میں اُلجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف اُنھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو اور یا خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں نے اُن کی آنکھیں کھولیں اور خود اُس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت اُن کی گھٹی میں پڑا تھا، اُن کو اسلام کی حقیقت اور اُس کے اصلی مقاصد تک پہنچا دیا۔ جو باتیں دینِ حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں اُن کو چھوڑا اور جو اُس کے مطابق پائیں اُن کو پکڑا اور زید و عمر کی مخالفت کا

خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا، ہر ایک معاملہ میں خود مذہب کو بجائے اس کہ زید و عمر کو اپنا رہبر بنایا، جو سوال پیش آیا اُس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا اُس کو سر پر رکھا۔ لوگ انگریزی نوکری پر اعتراض کرتے تھے۔ مگر مذہب نے اجازت دی کا اس لیے انگریزی نوکری بے تامل اختیار کرلی۔ مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ غیر قوم اور غیر مذہب گورنمنٹ کی نوکری محض دفع الوقتی وایام گذاری کے طور پر کرنی چاہیے؟ یا تہ دل سے اُس کے فرائض ادا کرنے چاہییں۔ مذہب نے جواب دیا کہ نوکری کا پورا معاوضہ لینا اور اُس کے فرائض تہ دل سے ادا نہ کرنا خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہے۔ اِس لیے نوکری کے فرائض نہایت ایمانداری اور سچائی کے ساتھ سرانجام کیے۔ مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیت کو اُس کی خیرخواہ اور وفادار رعایا بن کر رہنا ضرور ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایۂ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا امن و آزادی حاصل ہو اُس کی رعیت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو، لہٰذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیرخواہی میں صرف کردی۔ مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدق دل سے دوستی میل جول اور کھانا پینا دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اسلام نفاق سے بدتر اور رذیل تر خصلت کو نہیں بتاتا اس لیے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اُسی صداقت اور خلوص کے ساتھ میل جول رکھا جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔

واقعۂ ۱۸۵۷ء نے جب ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سخت

صدمہ پہنچایا اور اُن کے پنپنے کی بالکل امید نہ رہی اس سے سرسید کے دل پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھائی کہ اُن کا ارادہ ہندوستان سے تعلقات قطع کر کے کسی دوسرے ملک میں جاکر رہنے کا ہوگیا۔ اُس وقت بھی انھوں نے مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ قوم کی آگ میں کود نا بہتر ہے یا اپنی جان بچا کر اور کسی گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ اسلام کا اصل اصول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیرخواہی اور ہمدردی ہے اور بس۔ مذہب نے اُن کو بتایا کہ بانی اسلام جس کی اطاعت اور اتباع تمام امت پر فرض ہے اور جس کی نسبت قرآن ناطق ہے کہ " لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ " اُس نے دنیا میں آکر کیا کیا! اپنی تمام عمر ملک اور قوم کی خیرخواہی میں بسر کی۔ وہ گمراہ تھے اُن کو ہدایت کی، وہ وحشی تھے اُن کو انسان بنایا، وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اُن میں اخوت اور دوستی کی بنیاد ڈالی، وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے اُن میں ملک گیری اور کشور کشائی کا مادہ پیدا کیا۔ ان کا دین اور دنیا دونوں درست کیے، ان کی خیرخواہی اور اصلاح میں سخت شدائد اور تکلیفیں اپنے نفس پر برداشت کیں۔ ملک کی محبت کو جزو ایمان قرار دیا اور کہا کہ " حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ " قوم کی محبت پر تمام امت کو مجبور کیا اور فرمایا کہ " حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِیْمَانِ " قوم کی سرداری کو قوم کی خدمت میں منحصر ٹھیرایا اور کہا کہ " سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ " اخیر دم تک اُمت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور اُمّتی اُمّتی کہتا رب سے رخصت ہوا۔

سرسید نے مذہب کی یہ ہدایت سن کر تمام ارادے فسخ کیے اور اس اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔ انھوں نے دنیوی تعلقات کو جن کے بغیر قوم کی خیرخواہی

اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا قطع تعلق سے ہزار درجہ بہتر سمجھا اور اپنی تمام زندگی اور طاقت اور استطاعت اور اپنے تمام قویٰ کو نفس واپسیں تک قومی خدمت اور قومی خیر خواہی کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ قوم کی اصلی اور حقیقی خیر خواہی کس چیز میں ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے اعزاز سے اسلام کو معزز کرنا اور دنیا کے ذریعہ سے دین کو تقویت دینی۔ مذہب ہی نے ان کے دل میں ڈالا کہ مسلمان دنیوی عزت میں حد سے زیادہ گرے ہوئے ہیں اور گرتے چلے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی ذلت بعینہٖ اسلام کی ذلت ہے۔ اگر چند روز ان کا یہی حال رہا تو ہندوستان میں ان کا عدم اور وجود برابر ہو جائے گا اور اسلام اس ملک سے رخصت ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے قوم کو اول دنیا ہی کی طرف متوجہ کیا اور جو ذریعے ان کی دنیوی ترقیات کے تھے ان کے لیے مہیا کیے سب سے زیادہ ان کی ترقی کا مدار انگریزی تعلیم پر سمجھا۔ اس لیے گو ایک زمانے نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اور مزاحمت کی، مگر انھوں نے اُس کو قوم میں جاری کر کے چھوڑا۔ مذہبی وہام اور غلط خیالات جو دنیوی ترقی کے مانع تھے اپنی پُر زور تحریروں سے ان کی غلطی ثابت کی۔ سوشل اور اخلاقی خرابیاں جو قوم میں شائع تھیں جن پر غیر قومیں ہنستی تھیں اور جو دنیوی عزت اور وقار کی منافی تھیں ان کی اصلاح میں جہاں تک ممکن تھا کوشش کی۔ قوم کی طرف سے جو گورنمنٹ کو پولٹکل بدگمانیاں تھیں ان کو رفع کیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو قوم کے دل میں منافرت یا دہشت یا جھجک تھی اُس کو دور کیا۔ انگریز جو اسلام کو ایک نہایت مہیب اور خوفناک مذہب خیال کرتے تھے اور اس لیے مسلمانوں کی طرف سے مطمئن نہ تھے، ان کو اسلام کی اصلی

صورت دکھائی اور ثابت کیا اگر دنیا میں کوئی مذہب عیسائیوں کا دوست عیسائی مذہب کا حامی، بائبل کی تصدیق کرنے والا اور اس کے اصول سے مطابقت رکھنے والا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور بس، ہندو مسلمانوں میں جہاں تک کہ ممکن تھا اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کوشش کی کیونکہ دونوں قوموں کی عزت اسی بات پر موقوف تھی اور موقوف ہے۔ کہ آپس میں مل جل کر رہیں جتنے مدرسے اور انسٹیٹیوشن قائم کیے اُن میں دونوں قوموں کو شریک کیا اور اُن سے دونوں کے فوائد ملحوظ رکھے، ہمیشہ اپنی پبلک اسپیچوں میں دونوں قوموں کو اسی بات کی نصیحت کی کہ ہندوستان کی عزت اتفاق میں ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے جن میں مذہبی نزاع اور جھگڑوں نے پھوٹ ڈال رکھی ہے اور اس لیے وہ روز بروز ضعیف اور حقیر ہوتے جاتے ہیں جہاں تک ممکن تھا اُن میں اتفاق و التیام کی بنیاد ڈالی۔ مدرسۃ العلوم میں ہر مسلمان فرقہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ہر فرقہ کے طالب علموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی۔ اپنے سُنی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے روکا اور خود جو ابتدائے عمر میں اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تھی اُس سے ہمیشہ کے لیے اجتناب کیا۔ باوجودیکہ اُن کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے مذہب کے متعلق صدہا باتیں جمہور کے خلاف لکھنی پڑیں مگر بغیر سخت ضرورت کے کبھی کوئی نئی بات زبان سے نہیں نکالی، کبھی جمہور اہل اسلام کے مقابل کوئی جدید فرقہ کھڑا کرنا اور آپ اس کا سرگروہ بننا نہیں چاہا، کبھی مخالفین کے اعتراضات کا جواب پلٹ کر نہیں دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ قوم میں اختلاف اور نزاع بڑھنے نہ پائے اور میل کا بیل نہ بن جائے۔

جس وقت سرسید نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کا ارادہ کیا

اس وقت مذہب ہی نے اُن کو اس یقین پر قائم رکھا جو صدمہ یورپ میں عیسائی
مذہب کو تعلیم سے پہنچا ہے وہ اسلام کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا. اور جب کہ
انگریزی تعلیم اُن میں جاری ہوگئی اور اُس کو روز بروز ترقی ہونے لگی اِس
وقت بھی مذہب ہی نے اُن کو یہ سمجھایا کہ جب تک سائنس اور اصول
اسلام میں تطبیق نہ کی جائے تب ان کورے اور سادہ لوح طالب علموں کی طرف
سے اطمینان نہیں ہو سکتا جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لیے
اُن کے دل میں مذہب کی طرف سے سوء ظن پیدا ہو جانا بالکل قرین قیاس
ہے. مذہب نے اُن کو ڈرایا کہ اگر تعلیم سے اسلام کو کچھ صدمہ پہنچا تو اس کا
مظلمہ خاص کر اُس شخص پر ہوگا جس نے قوم میں تعلیم جاری کی. چنانچہ اس عظیم الشان
کام کو بھی انھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی سمجھ اور علم و عقل کے موافق قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا یہ محض بے سروپا قیاسات نہیں ہیں بلکہ خود
سرسید نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے خصوصاً
وہ آرٹیکل جو تہذیب الاخلاق مورخہ یکم ربیع الاول ۱۲۸۸ھ ہجری میں "ایک نادان
خدا پرست اور دانا دنیادار" کے عنوان سے لکھا ہے اُس سے ہمارے مذکورہ
بیانات کی بخوبی تائید ہوتی ہے اس کے علاوہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے
تھے کہ سرسید قومی خدمات اسی سرگرمی اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیتے
تھے جیسے ایک مرتاض اور نفس کش زاہد عبادت الٰہی بجا لاتا ہے۔ نہ بیماری
اور ضعیفی اُن کے ذوق و شوق کو کم کرتی تھی اور نہ گرمی
یا سردی کی شدت یا اور کسی ہرج مرج سے اُن کی ہمت قاصر ہوتی
تھی. چالیس برس برابر انھوں نے مخالفتیں جھیلیں، اُن کے کفر کے لیے بیشمار
فتوے لکھے گئے، انکو دہریہ، ملحد، کافر اور دجّال سب کچھ کہا گیا. اُن کو بارہا

قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ صدہا گمنام خطوں میں مغلظ گالیاں لکھ کر بھیجی گئیں۔ اخباروں اور رسالوں میں جہاں تک ہو سکا اُن کی توہین کی گئی، مگر وہ اپنی دھن میں اسی طرح لگے رہے اور اپنا کام اسی ذوق و شوق کے ساتھ کیے گئے۔ بلکہ جس قدر مخالفت بڑھتی گئی اسی قدر اُن کا جوش اور سرگرمی زیادہ ہوتی گئی۔ لوگ اُن کو بُرا کہہ کر اور گالیاں دے کر اس قدر خوش نہ ہوتے ہوں گے جس قدر کہ وہ بُرا سن کر اور گالیاں کھا کر خوش ہوتے رہے۔ ان کی بہن کے انتقال کی خبر اُن کو اُس وقت پہنچی جب کہ وہ قومی کانفرنس کی کارروائی میں مصروف تھے۔ جب تک جلسہ اپنے معمولی وقت پر برخاست نہ ہُوا وہ بہن کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہوئے۔ جوان بیٹے کی موت سے اُن کو سخت صدمہ پہنچا پندرہ بیس روز تک قلب کی حرکت نہایت سست رہی اور یہ صدمہ آخر تک فراموش نہ ہوا۔ با اینہمہ وہ اپنی قومی خدمات میں برابر مصروف رہے اور ایک رات اور ایک دن سے زیادہ جو کہ دلّی کی آمد و رفت میں صرف ہوا انھوں نے باوجود ایسے سخت صدمہ کے کوئی قومی کام ملتوی نہیں کیا اور ایسے مواقع کو تا بمقدور کبھی پاس نہیں آنے دیا جن سے بیٹے کا داغ تازہ ہو اور قومی خدمات میں حرج واقع ہو۔ دلی میں انھیں خیالات سے وہ جنازہ کے ساتھ نہ گئے اور دفن کرنے میں شریک نہیں ہوئے۔ لوگوں کو سخت تعجب ہُوا اور بعضوں نے بڑے بڑے اعتراض کیے اور حق یہ ہے کہ اُن کے اعتراض بالکل بجا تھے کیونکہ "من جهل شیئاً اعداہ" الغرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں کہ اُن کے تمام کاموں کی محرک کوئی ایسی روحانی اُمنگ تھی جس پر دنیا کے معمولی تلاطم غالب نہیں آ سکتے تھے اور جس قدر جسمانی امنگیں کم ہوتی جاتی تھیں وہ امنگ بڑھتی جاتی تھی۔

اس مقام پر یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ سرسید کی فطرت میں جیسا کہ اُن کے حالات اور اُن کے کاموں سے معلوم ہوتا ہے، غایت درجہ کی فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی تھی یہاں تک کہ بعض اشخاص غلطی سے اُن کو حد سے زیادہ مسرف اور فضول خرچ خیال کرتے تھے جو لوگ ان کے حالات سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہے کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کا خیال اُن کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت بڑھ کر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور کبھی اُن کی آمدنی میں سے ایک حبہ پس انداز نہ ہوتا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے اُن کو تعلیم اہل اسلام کا خیال ہوا انھوں نے اس قسم کے شخصی سلوک اور احسان بالکل بند کر دیئے۔ جو کچھ اُن کے ضروری اخراجات سے بچا وہ انھوں نے مدرسہ کے سوا اور کہیں صرف نہیں کیا سائل اُن کے دروازہ سے ہمیشہ ناکام پھرتے تھے تعلیم کے سوا کسی اور رفاہ عام کے چندہ میں بھی وہ شریک نہیں ہوتے تھے بخلاف اس کے مدرسہ کی امداد میں وہ اپنی طاقت اور استطاعت سے بمراتب بڑھ کر خرچ کرتے رہتے تھے۔ غدر سے پہلے جب کہ وہ بجنور میں صدر امین تھے

---

[1] مارچ سنہ ۹۵ء میں جبکہ سر شیر محمد خاں بہادر رئیس پالن پور کالج کے ملاحظہ کو علیگڑھ میں آئے اور ٹرسٹیوں کی طرف سے سرسید نے ان کو ایڈریس دیا، اُس وقت کالج کی خیرخواہی کے جوش میں سرسید نے ایک ایسا کام کیا جس کو سُن کر ہر شخص تعجب کریگا رئیس ممدوح نے چلتے وقت پچاس روپیہ سرسید کے پوتے سید مسعود کو اور پچاس محمد بشیر کو جو نواب محسن الملک کا عزیز ہے اور پچاس روپیہ دونوں صاحبوں کے ملازموں کو علاوہ پانسو روپیہ چندہ کالج کے دیے تھے۔ دونوں بچوں نے تو خوشی سے کہہ دیا کہ ہم دونوں کے سو روپیہ کالج کی مسجد کی تعمیر میں صرف کیے جائیں مگر سرسید نے نوکروں کا روپیہ بھی لینا چاہا نواب محسن الملک نے تو اپنے نوکروں کے انعام کو اُن سے لینا ہرگز پسند نہ کیا اور پچاس روپیہ انھیں کو دیدیے مگر سرسید نے حجت شرعی تمام کرنے کو نوکروں سے کہا کہ اگر تم کو ہماری نوکری منظور ہے تو جو انعام نواب صاحب نے تم کو دیا ہے وہ کالج میں دیدو ورنہ ابھی اپنا حساب کرلو۔ وہ بیچارے نوکری کیونکر چھوڑ سکتے تھے انھوں نے مجبور پچاس روپیہ سرسید کو دیدیے اور سرسید نے بلا تکلف اُن سے روپیہ لے کر کالج فنڈ میں جمع کرلیا ۱۲

انھوں نے کئی مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کرائی، اپنے پاس سے بھی روپیہ صرف کیا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی لے کر لگایا۔ مگر غدر کے بعد جب سہارنپور کی جامع مسجد کے لیے اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو انھوں نے چندہ دینے سے صاف انکار کیا اور لکھ بھیجا کہ "میں مسلمانوں کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔" ان باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ سرسید کی کل مذہب کے ہاتھ میں تھی۔ مذہب جہاں چاہتا تھا ان سے خرچ کراتا تھا اور جہاں چاہتا تھا اُن کا ہاتھ روک دیتا تھا کیونکہ مذہب کے سوا کوئی ایسا زبردست حاکم نہیں ہے جو انسان کی طبیعت کے اقتضا پر غالب آجائے اور ایک ہی شخص کو ہمیشہ کے لیے ایک جگہ غایت درجہ کا فیاض اور دوسری جگہ حد سے زیادہ ممسک اور تنگدل بنادے ۔ جیسا کہ بعض صحابہ کا حال تھا کہ کہیں اُن کی داد و دہش کے آگے حاتم کی فیاضی ہیچ معلوم ہوتی تھی اور کہیں ان کی کفایت شعاری اور جزرسی پر حد سے زیادہ تعجب ہوتا تھا۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے جتنے بڑے بڑے کام کیے وہ عقل سلیم اور رائے صائب کی ہدایت سے کیے اور اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے کارہائے نمایاں اُن کی دانشمندی اور رائے صائب کے نتیجے تھے نہ مذہب کے۔ لیکن اول تو جو شخص مذہب اور عقل کو لازم و ملزوم جانتا ہو اُس کے کسی کام کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عقل کا نتیجہ تھا نہ مذہب کا۔ دوسرے عقل کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ راہِ راست بتا دیتی ہے مگر اس راہ پر چلنا اور ثابت قدم رہنا اور نہایت استقلال کے ساتھ اُس کی تمام منزلیں طے کرنا جب تک کہ مذہب کا سہارا نہ ہو غیر ممکن ہے۔

اس بحث کو جو ہم نے اس قدر طول دیا ہے اس سے شاید لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ہم سر سیّد کے مخالفوں کو اُن کے مسلمان یا پابند مذہب ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں مگر فی الواقع ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کیونکہ جس مذہب کو سر سیّد مذہب سمجھتے تھے اور جس اسلام کو وہ اسلام جانتے تھے مخالفوں کے نزدیک نہ وہ مذہب مذہب تھا اور نہ وہ اسلام اسلام۔ بلکہ ہمارا مقصد اس طولانی بحث سے صرف اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ ایشیائی ممالک میں جہاں وطنیت اور قومیت کا خیال بالکل نہیں ہے۔ جو شخص مذہب کا پابند نہ ہو وہ ہرگز ملک یا قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ پس ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو قومی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک وہ اسلام پر ثابت قدم نہ ہوں گے ممکن نہیں کہ قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام کر سکیں۔ یورپ اور امریکا میں اب تک جس قدر ترقیات اور اصلاحات ظہور میں آئی ہیں اُن کے بانی مبانی تقریباً تمام وہی لوگ نکلیں گے جو مذہب کے سخت پابند تھے، لوتھر، کالون، بیکن، ملٹن، نیوٹن، کولمبس، بنجمن، فرنکلین، جارج سٹیفن، واشنگٹن، ہمپڈان، میٹنی وغیرہ وغیرہ سب مذہب کے نہایت پابند تھے۔

# سرسیّد کی ملکی خدمات اوران کے نتائج

اس عنوان کے تحت میں ہم سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی، تینوں قسم کی خدمات کا ذکر کریں گے مگر پیشانی پر ہم نے ان تمام خدمات کو ملکی خدمات کی لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ سرسید کو گورنمنٹ کی خیر خواہی اور حسن خدمت کی بدولت ملک اور قوم کی بھلائی کرنے میں بے انتہا مدد پہنچی ہے اور اس لیے ہم ایسی سرکاری خدمات کو بھی ملکی خدمات میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک کے کسی فرقہ کو جو زمانہ کے انقلابات سے پست ہو گیا ہو، ابھارنا اور اس کے ہم وطنوں میں اس کا اعزاز از سرنو قائم کرنے میں کوشش کرنا درحقیقت ملک کے ایک ایسے عضو ماؤف کی اصلاح کرنا ہے جس کے سبب سے اس کے تمام صحیح اعضا معرضِ خطر میں ہوں۔

## سرکاری خدمات

سب سے پہلے ہم سرسید کی سرکاری خدمات پر جو اُن کی تمام ترقیات کی پہلی سیڑھی اور اُن کے تمام کارناموں کا ایک زبردست آلہ رہی ہیں، نظر ڈالتے ہیں، اور اپنی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو گورنمنٹ سروس کے ذریعہ سے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں، نصیحت کرتے ہیں کہ اُن کو سرسید کی راستبازی، دیانت، وفاداری اور شریفانہ، نہ غلامانہ، اطاعت سے

جس پر وہ ملازمت کے زمانہ میں اور اُس کے بعد ہمیشہ کار بند رہے، سبق لینا چاہیے کیونکہ حسن خدمت کی کوئی مثال اور کوئی نمونہ اُن کو اس سے بہتر دستیاب نہیں ہو سکتا۔

## سرکاری ملازمت کی ابتدا

جس زمانہ میں سرسید نے انگریزی نوکری اختیار کی اس وقت مسلمانوں کو انگریزوں کے اخلاق، عادات، طرز معاشرت اور انگلش گورنمنٹ کی طرز حکومت سے بہت ہی کم واقفیت تھی اور دلی اور اُس کے نواح کے مسلمان عموماً انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ خصوصاً جو خاندان قلعۂ دہلی سے کچھ تعلق رکھتے تھے ان کو انگریزی نوکری کا کبھی خواب بھی نظر نہ آتا ہوگا۔ چنانچہ سرسید نے جب سرکاری ملازمت کی خواہش ظاہر کی تو اُن کے تمام عزیز اور رشتہ دار اس ارادہ سے مانع آئے مگر چونکہ اُن کے نانا دبیر الدولہ نے بعض سرکاری خدمات انجام دی تھی اور اُن کے خالو خلیل اللہ خاں اس وقت ایک ممتاز انگریزی خدمت پر مامور تھے اس لیے انھوں نے قلعہ دہلی کے تبرک پر قناعت نہ کی بلکہ انگریزی نوکری اختیار کر لی۔

## کام سیکھنے کا شوق

سرسید نے ابتدائے ملازمت ہی میں یہ نکتہ بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا کہ کسی کام کے ملنے سے پہلے اُس کام کی لیاقت اور اس کے فرائض کی اطلاع حاصل کرنی ضرور ہے۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں جب مسٹر رابرٹ ہملٹن نے ان کو عدالت سشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا تو انھوں نے اُس کے

(حاشیہ اگلے صفحہ)

قبول کرنے سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ جس کام کی میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اس کو کیونکہ قبول اور اس کے فرائض ادا کر سکتا ہوں؟ جب وہ آگرہ کی کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر مقرر ہوئے تو انھوں نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی اور ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے مطابق تمام دفتر کمشنری آگرہ کا مرتب کیا گیا۔ پھر عدالت منصفی کے متعلق قوانین کا ایک خلاصہ تیار کیا جس کو صاحب کمشنر آگرہ نے گورنمنٹ میں پیش کر کے ان کے لیے عہدۂ منصفی کی سفارش کی۔

## حسنِ خدمت

اس کے بعد انھوں نے اپنے تمام زمانۂ ملازمت میں اس قاعدہ کو ہمیشہ نصب العین رکھا کہ جو کام سرکار کی طرف سے ان کو تفویض ہوا اس کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچائی اور اس کے فرائض بڑے تجربہ کار آدمیوں کی طرح سرانجام کیے۔ یہاں تک کہ سروس کا زمانہ ختم ہونے کے بعد بھی جتنے کام گورنمنٹ نے ان سے لینے چاہیے ان کو کمال جانفشانی اور محنت سے اور نہایت بصیرت اور اطلاع کے ساتھ انجام دیا۔ یجس لیٹو کونسل کی ممبری انھوں نے ایسی لیاقت کے ساتھ کی کہ ان سے پہلے کسی ہندوستانی ممبر نے

---

[۱] چونکہ سررشتہ داری عدالت سشن کے قبول کرنے سے سرسید نے اس خوف سے انکار کیا تھا کہ مبادا اس کے فرائض ان سے ادا نہ ہوسکیں اس لیے مسٹر رابرٹ ہملٹن نے جو سفارش کی چٹھی مسٹر لشنٹن کے نام لکھ کر سرسید کو آگرہ بھیجا تھا اس میں ان کو عالی خاندان اور ہوشیار ہونے کے علاوہ ڈرپوک بھی لکھا تھا۔ اس چٹھی کو کرنل گریہم سرسید کی لائف میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ سرسید میں اب کوئی علامت ڈرپوک ہونے کی نہیں ہے اس کے بعد وہ عدالت جنگ کے متعلق ماسٹر اوٹ دار لکھ کر کہتے ہیں کہ غدر کے موقع پر سید احمد نے اس خطاب کا کافی ثبوت دیا ہے ۱۲۔

نہیں کی تھی۔ اُن سے پہلے بظاہر کسی نیٹو ممبر نے کوئی مسودۂ قانون پیش نہیں کیا تھا۔ انھوں نے تین مفید قانون بنائے جن میں سے صرف دو پیش ہوئے اور دونوں پاس ہو گئے کونسل کے اکثر مباحثوں میں باوجود انگریزی نہ جاننے کے نہایت سنجیدہ اور بیگل اسپیچیں کیں اور محض اپنی اعلیٰ لیاقت کے سبب دو وائسرائوں کے عہد میں دوبارہ منتخب ہوئے۔ اُن کی ایک اسپیچ کی نسبت جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے خود لارڈ لٹن نے اپنی زبان سے کہا کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سنی۔ اسی طرح ایجوکیشنل کمیشن میں جیسی مبسوط اور مفصل شہادت انھوں نے دی اور جو روشنی تعلیمی معاملات پر اُن کی شہادت نے ڈالی اس سے زیادہ کسی شہادت میں نہیں سنی گئی۔ غرض کہ انھوں نے سرکاری کام کو کبھی بیگاریوں کی طرح نہیں کیا بلکہ ہر ایک خدمت کے فرائض نہایت تندہی اور جانفشانی سے ادا کیے اسی سبب سے اُن کے افسر ہمیشہ ان کے مداح اور شکر گذار رہے۔

## بے غرضی

جہاں تک ہم کو معلوم ہے انھوں نے کبھی اپنی ترقی یا کسی خدمت کے صلہ کی صراحتہً یا کنایۃً اپنے افسروں سے درخواست نہیں کی بلکہ ہمیشہ اپنی کار گذاری اور حسنِ خدمت سے اُن کے دل میں جگہ کی اور خود اپنے کاموں کو اپنا سفارشی بنایا۔ ۱۸۸۸ء میں جب کہ سرسید کو بمقام علیگڑھ کے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا گیا اس وقت صاحب کلکٹر علیگڑھ مسٹر کینڈی نے سرسید کی تعریف میں جو لمبی تقریر کی تھی اس میں یہ بھی کہا تھا کہ "یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے واسطے کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے

کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی" پروفیسر آرنلڈ ایم اے جو دس برس علیگڑھ کالج میں سرسید کے پاس رہے انھوں نے لاہور کے ماتمی جلسہ میں جو سرسید کی وفات پر اسپیچ دی تھی اس میں یہ بھی کہا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے جو اعزاز یا خطاب ان کو ملا وہ ہمیشہ بے طلب ملا اور میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو ان سے زیادہ شریفانہ زندگی بسر کرنے والا اور ان سے زیادہ بے لاگ اور بے غرض ہو۔"

دیانت داری کی صفت ان کی تمام پبلک سروس میں ایسی نمایاں رہی ہے جیسے آفتاب میں روشنی۔ صہیب رومی کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "نعم العبد صہیب لو لم یخف اللہ لم یعصہ" یعنی صہیبؓ ایسا نیک بندہ ہے کہ اگر وہ خدا سے نہ ڈرتا تو بھی اس کی نافرمانی نہ کرتا، یہی حال سرسید کے تدین کا تھا وہ نہ کسی حاکم کے خوف سے اور نہ شرعی امتناع کی وجہ سے بلکہ محض اپنی طبیعت کے اقتضا سے کوئی کام دیانت داری کے خلاف نہیں کر سکتے تھے، غدر سے پہلے ان کا تدین بہت خوفناک صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اہل مقدمہ کو یہ جرأت تو نہ ہوتی تھی کہ ان کے سامنے کچھ نذرانہ پیش کریں، یا ایسا پیغام بھیجیں۔ البتہ کبھی کبھی ناواقف لوگ دورانِ مقدمہ میں ان کے مکان پر صرف ملنے کے بہانے یا کوئی سوغات لے کر چلے جاتے تھے۔ سوغات کا قبول کرنا تو درکنار ہم نے سنا ہے کہ وہ سوغات لانے والے سے اس قدر بدگمان ہو جاتے تھے کہ اُس کا اثر مقدمہ کے فیصلہ تک پہنچتا تھا۔ آخر اہل مقدمہ نے اثنائے تحقیقات میں ان سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ جھوٹے مقدمے بنانے والے اور جھوٹی گواہیاں دینے والے ان کے نام سے کانپتے تھے۔ نہ ان سے اپنوں کو رعایت کی توقع تھی اور نہ غیروں کو صاحب جج بنارس نے سالانہ رپورٹ میں ان کی نسبت

لکھا تھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔"

غدر سے پہلے جو اکثر یورپین افسروں نے سرسید کی نسبت اپنی چٹھیات میں رائے ظاہر کی ہے اس میں زیادہ تر اُن کے علو خاندان لیاقت اور دیانت داری کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے زیادہ وہ ہندوستانیوں کے کیرکٹر سے اس وقت بخوبی واقف ہو سکتے ہیں جب کوئی امتحان کا موقع پیش آئے یہاں ہم صرف ٹامس مٹکاف صاحب رزیڈنٹ و کمشنر دہلی کی چٹھی مورخہ ۱۴ جولائی ۱۸۵۲ء کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں معزز خاندان کے ممبر ہیں اور نواب دبیرالدولہ خواجہ فرید خاں مرحوم کے جو شاہنشاہ اکبر شاہ مرحوم کے وزیر اعظم تھے، نواسے ہیں۔ اور میں اپنے ذاتی تجربہ سے اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ ایمانداری اور دیانت میں بہت اعلیٰ درجہ کا کیرکٹر رکھتے ہیں۔"

اس باب میں سرسید کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ اُن کی سروس ختم ہونے پر باوجودیکہ گورنمنٹ بہت خوشی سے اُن کو کام کرنے کی مہلت دینی چاہتی تھی مگر انھوں نے زیادہ مہلت لینی مناسب نہ سمجھی کیونکہ مدرسۃ العلوم قائم ہو چکا تھا جس کے لیے چندہ جمع کرنے کی از بس ضرورت تھی اور وہ عام طور پر چندہ وصول کرنا ملازمت کی حالت میں خلاف احتیاط سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب تک انھوں نے پنشن نہیں لی بنارس میں اپنے دوستوں کے سوا کسی سے چندہ طلب نہیں کیا۔

## آزادی

اگرچہ سرسید نے اُس دربار کے سایہ میں پرورش پائی تھی جو ایک قدیم ڈسپاٹک گورنمنٹ کی یادگار تھا، جہاں آزادی کے پر جلتے تھے اور

خوشامد کا بازار گرم تھا، نیز اُس وقت شمالی ہندوستان میں انگریزی عملداری کا ابتدائی زمانہ تھا اور اس لیے برٹش گورنمنٹ میں بھی اُس وقت تک ایشیائی طرزِ حکومت کی تمام خاصیتیں موجود تھیں۔ اہل کار خوشامد کو اہلکاری کا زیور سمجھتے تھے اور اس وجہ سے یورپین حکام اور افسر ہندوستان میں آکر خوشامد پسند بن جاتے تھے، باوجود اس کے سرسید کا برتاؤ اپنے افسروں کے ساتھ ابتدا سے اخیر تک نہایت آزادانہ رہا۔ وہ اپنے افسروں کا ادب اور تعظیم اور سرکار میں اُن کی اطاعت جیسی کہ چاہیے ہمیشہ کرتے تھے مگر ان کا بے جا دباؤ کبھی نہیں مانا اور بے موقع کبھی اُن کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ غدر سے بہت پہلے جب کہ دلّی میں جان پاٹن گبنس سشن جج اور سرسید مصنف تھے، قسمت دہلی کے دو جاگیر دار بھائیوں میں جن میں سے ایک سرسید کا گہرا دوست تھا جاگیر کی بابت سخت نزاع تھا اور اُن کا جھگڑا گورنمنٹ میں پیش تھا۔ دوسرے بھائی نے صاحب جج سے شکایت کی کہ میرے بھائی کو سید احمد خاں بہکاتا اور ہر قسم کی مدد دیتا ہے، اس کو آپ سمجھا دیں کہ جب تک ہمارا جھگڑا عدالت سے طے نہ ہو جائے، وہ میرے بھائی سے ملنا چھوڑ دے جان پاٹن گبنس کے طنطنے اور رعب و داب کی تمام قسمت میں دھاک تھی اور اُن کے کسی ماتحت کی یہ مجال نہ تھی کہ اُن کا کہنا نہ مانے۔ انھوں نے ایک روز سرسید کو بلاکر سمجھایا کہ جب تک یہ نزاع رفع نہ ہو تم اپنے دوست سے ملنا چھوڑ دو۔ سرسید نے صاف کہہ دیا کہ میں بیشک آپ کا ماتحت ہوں، سرکاری معاملات میں جو کچھ آپ ہدایت کریں گے اُس کی بسر و چشم تعمیل کروں گا مگر میرے ذاتی تعلقات میں آپ کو دخل دینا نہیں چاہیے، اگر آپ کہیں کہ تم چند روز کو اپنی ماں یا بہن سے ملنا چھوڑ دو تو میں کیونکر آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں۔ اگرچہ

انگریزوں میں ہندوستان کی آب و ہوا تحکّم اور خوشامد پسندی پیدا کر دیتی ہے مگر چونکہ آزادی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوتی ہے وہ ایسے آزاد شخصوں کی آخر کار قدر کرنے لگتے ہیں اور برخلاف عام اشخاص کے اُن کے ساتھ خاص طور کا برتاؤ برتتے ہیں۔ جب صاحب جج نے یہ معقول عذر سنا پھر کبھی ان پر ایسا بے جا دباؤ نہیں ڈالا۔

۱۸۵۰ء میں جب کہ وہ پہلی بار مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اس وقت رہتک میں عجب کھل بلی پڑی ہوئی تھی۔ مسٹر گتری قائم مقام مجسٹریٹ نے بے شمار مقدمے بداعمالی اور رشوت ستانی کے مسٹر کرک پر دائر کرا رکھے تھے، مخبری کا بازار گرم تھا۔ جو لوگ گتری صاحب کے ہاں کرک کے برخلاف مخبری کرتے تھے اُن سے سب لوگ دبتے تھے۔ خان بہادر غلام نبی خان مرحوم جو اس وقت وہاں نائب سررشتہ دار کلکٹری تھے اُن کا بیان ہے کہ "سید صاحب نے وہاں جا کر کئی کام صاحب مجسٹریٹ کی مرضی کے بالکل برخلاف کیے اور کبھی اُن کا دباؤ نہیں مانا۔ ایک شخص بابر خاں نامی قصبۂ رہتک کا نمبردار جس کو راقم بھی جانتا ہے۔ گتری صاحب کا بڑا مقرب تھا جس نے کرک کے برخلاف اُن کو بہت مدد دی تھی، اُس نے کسی دیوانی کے مقدمے میں سید صاحب کے اجلاس میں جھوٹی گواہی دی۔ انھوں نے فوراً اس کو ماخوذ کیا، ہرچند گتری صاحب نے اُس کی رہائی کے لیے سفارش کی مگر سید صاحب نے سفارش نہیں مانی اور اُس کو دورہ سپرد کر دیا جہاں سے اُس کو تین برس کی قید کا حکم ہوا۔"

پھر میونسپل کمیٹی کے ایک مقدمہ میں گتری صاحب ایک ٹھیکہ دار کی جائیداد بعلت مطالبۂ کمیٹی نیلام کرنی چاہتے تھے اور تمام ممبران کمیٹی

سوائے سید صاحب کے اُن سے متفق الرائے تھے۔ سر سید نے اُس وقت کے بائلاز کے مطابق یہ رائے دی کہ کمیٹی بدون حاصل کرنے ڈگری دیوانی کے اپنے اختیار سے ٹھیکہ دار کی جائیداد نیلام کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ جب سب نے اس رائے سے اختلاف کیا تو انھوں نے اپنی رائے مدلل تحریر کر کے کمیٹی میں بھیج دی۔ آخر کلکٹر صاحب کو بصد اکراہ انھیں کی رائے کے موافق عمل کرنا پڑا۔"

منشی صاحب ہی کا یہ بیان ہے کہ "جب سے کلکٹر صاحب نے مسٹر کرک کو زک دی تھی صدر امینی کی کچھ وقعت لوگوں کی نظر میں نہیں رہی تھی خصوصاً ملازمان کچہری ضلع اُس کو لاشے محض سمجھنے لگے تھے۔ اتفاق یہ کہ ایک شخص جس کا باپ صاحب ضلع کے محکمہ میں سررشتہ دار تھا، صدر امینی میں بزمرۂ محرّران نوکر تھا اور اس گھمنڈ پر کہ میرا باپ صاحب مجسٹریٹ کی ناک کا بال ہے اپنا کام نہایت بے پروائی سے کرتا تھا۔ سر سید نے اُس کو بعلت غفلت و بے پروائی کے معطل کر دیا۔ ہر چند ضلع والوں نے سفارش کے لیے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر انھوں نے کچھ التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ دیوانی کی تعطیل میں دلی چلے گئے۔ مگر تعطیل سے واپس آکر کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ اُس کے باپ کے بڑھاپے کا خیال کر کے اُس کو پھر بحال کر دیا۔"

یہ واقعات اُس زمانے کے ہیں جب کہ سر سید یورپین حکام کی نظر میں ایک ہندوستانی عہدیدار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے اور جو وقعت اور اعتبار اُن کو ایام غدر کی خدمات کے بعد انگلش حکام اور خود انگلش گورنمنٹ میں حاصل ہوا اُس کا عشر عشیر بھی اُس وقت حاصل نہ تھا۔ مگر اُس حالت میں بھی انھوں نے اپنی آن کو کبھی ہاتھ سے نہیں

جانے دیا اور اپنے فرائض منصبی نہایت آزادی اور دلیری سے ادا کرتے رہے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ ٹومنی صاحب جو سٹرگرک کے مقدمات کی تحقیقات کے لیے اڈیشنل کمشنر ہو کر رہتک گئے تھے۔ جب سرسید ان سے ملے تو وہ اُن کی ملاقات سے نہایت خوش ہوئے اور اُن کی غیبت میں لوگوں سے کہا کہ ہم نے ہندوستانی افسروں میں ایسا صاف اور آزاد طبیعت کوئی افسر نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے سرسید کا ٹمنی صاحب سے اس قدر ربط بڑھ گیا تھا کہ آثار الصنادید کا انگریزی ترجمہ جو مسٹر رابرٹس جنٹ مجسٹریٹ دہلی نے ناتمام چھوڑ دیا تھا اس کے پورا کرنے کا وعدہ انھوں نے سرسید سے کیا۔ چنانچہ جب صاحب موصوف مراد آباد میں جج ہو کر گئے تو بہت سا ترجمہ انھوں نے کرایا۔"

تھیوڈور ماریسن اس آرٹیکل میں جو انھوں نے سرسید کی وفات کے بعد اُن کے پولٹکل ورکس پر لکھا تھا، ٹرکی اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس مضمون پر سرسید نے کوئی مذبذب اور مشتبہ آواز نہیں نکالی۔ اُس نے بھی اور مسلمانوں کی طرح سلطان ٹرکی کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اس کے تنزل پر افسوس کیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عملاً سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے اور اُس کو یہ خوف تھا کہ مبادا مسلمان بھی پولیٹکل بے وقعتی کی اس حالت تک پہنچ جائیں جو یورپ میں یہودیوں کی حالت ہے۔ اسی لیے ٹرکی کے ہر ایک صدمہ پر وہ ویسے ہی سچے دل سے رنج و الم کرتا تھا جیسا کہ ہر مسلمان کرتا ہے لیکن اس ہمدردی کی بدولت جو اُس کو اپنے معزز ہم مذہبوں کے ساتھ تھی، وہ قیصر ہند کی وفاداری اور احسان مندی سے سبکدوش نہیں ہو سکا۔"

# بے تعصبی اور انصاف

اس کے سوا سرسید نے اپنی تمام ملازمت کا زمانہ جس بے تعصبی اور کشادہ دلی سے بسر کیا وہ فی الحقیقت ہمارے ملک میں ایک ایسی مثال ہے جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ انھوں نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر ہر قوم اور ہر مذہب کے آدمی کو ہمیشہ ایک نگاہ سے دیکھا اور کبھی ایک جج ہونے کی حیثیت سے اپنی قوم اور اپنے مذہب کے آدمی کو دوسری قوم اور دوسرے مذہب کے آدمی پر ترجیح نہیں دی۔ بلکہ ایسی ترجیح دینے کو ایک نہایت کمینہ خصلت اور ننگ انسانیت تصور کیا۔ اُن کی بے تعصبی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ غدر کے موقع پر جیسا کہ پہلے حصہ میں مفصل بیان ہو چکا ہے۔ باوجودیکہ ضلع بجنور کے ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی، وہاں کے تمام ہندو تعلقہ داروں نے خود سرکار سے کمال خوشی اور آرزو کے ساتھ یہ درخواست کی کہ جب تک ضلع میں امن نہ ہو سید احمد خاں اور ڈپٹی رحمت خاں کو ضلع سپرد کیا جائے اور انھیں کو ضلع کا حاکم بنایا جائے۔ تاریخ سرکشی بجنور میں سرسید نے جہاں ہندو چودھریوں کا حال لکھا ہے اُس سے اُن کی نہایت درجہ کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔

باوجودیکہ ہندو چودھریوں اور اُن کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے پاک تھے اس لیے اُن کو اس الزام سے بالکل بری کیا ہے۔ اور واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو جو اُس وقت تمام ملک میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے تھے مطلق کام نہیں فرمایا۔

جب سرسید ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بنارس سے روانہ ہونے کو

تھے تو وہاں کے ہندو اور مسلمان رؤسا نے بشمول یوروپین حکام کے اُن کو ایک حکام کے اُن کو ایک وداعی ایڈریس دیا تھا جس میں اُن کی سرکاری ملکی اور قومی خدمات کے علاوہ خاص کر اُن کے بے لاگ انصاف اور بے تعصبانہ فیصلوں کی نہایت تعریف تھی۔ سرسید نے اس کے جواب میں کہا کہ " اگر میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلالحاظ کسی کے رتبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی تو اس کے لحاظ سے میں کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہوں مجھکو تمام عمر اس بات کی فکر رہی ہے کہ جو بڑا فرض مجھکو تفویض ہوا ہے اُس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ہمیشہ خوب سمجھتا رہا ہوں اور دنیا کی دولت اور عزت پر سچ بات کو اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو انسان کی قدر دانی اور تعریف پر ہمیشہ ترجیح دیتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے تئیں خدا تعالیٰ کا جواب دہ سمجھا ہے، نہ کہ انسان کا گو میں نے اپنی رائے میں غلطی کی ہو، مگر ہمیشہ اپنے ایمان کی ہدایت پر عمل کیا ہے باوجود اس کے مجھکو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ جو کوششیں میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں اُن کی قدر شناسی میرے ہموطنوں نے کی ہے "

اُنھیں دنوں میں جب کہ سرسید بنارس سے رخصت ہونے والے تھے شہر کے ہندو اور مسلمان شرفا نے اُن کی یادگار قائم کرنے کے لیے ایک کمیٹی منعقد کی تھی جس کے پریسیڈنٹ راجہ شمبو نرائن سنگھ بہادر تھے۔ اس کمیٹی میں راجہ صاحب موصوف نے سرسید کی یادگار کے طور پر بنارس کالج میں طبیعات کی تحصیل کے لیے ایک سکالرشپ ہمیشہ کے واسطے "سید احمد خاں سکالرشپ" کے نام سے مقرر کی تھی جو اب تک برابر جاری ہے۔

انتظام قحط ضلع مراد آباد کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں اُسی کے ضمن میں وہ واقعہ جو راجہ جگیشن داس صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور جس سے اُن کو سرسید کی بے تعصبی کا یقین ہوا تھا ملاحظہ کے قابل ہے کہ رسالہ " لائل محمدنز اوف انڈیا " کو دیکھ کر انھوں نے سرسید کو ایک سخت متعصب مسلمان خیال کیا تھا مگر مراد آباد کے محتاج خانہ میں ہر مذہب اور ہر ملت کے ادنیٰ ادنیٰ کنگلوں کی خدمت گذاری میں اُن کو دیوانہ وار سرگرم دیکھ کر وہ حیران اور اُن کی بے تعصبی کے دل سے قائل ہو گئے۔

# وفاداری

غدر کے زمانہ میں جس خلوص اور سچائی کے ساتھ گورنمنٹ کی وفاداری خیر خواہی اور یوروپین مردوں عورتوں اور بچوں کی جان کی حفاظت اُن سے بن آئی اُس کو ہم مفصل پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں صرف سرجان اسٹریچی کے چند الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جو انھوں نے ۱۸۸۴ء میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محمڈن کالج کمیٹی کے ایڈریس کے جواب میں سرسید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہے تھے انھوں نے کہا کہ "کسی شخص نے اُس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے (یعنی سید احمد خاں نے) دیا، میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس سے ان کی جاں نثاری کا کافی طور پر اظہار ہو سکے" اسی اسپیچ میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ " شمال مغربی اضلاع میں اُن سے زیادہ کوئی روشن ضمیر جج نہیں ہوا۔ اور مسٹر شکسپیر نے اپنی رپورٹ میں اقرار کیا تھا کہ " اگر صدر امین (یعنی

سید احمد خاں بیچ میں واسطہ نہ ہوتا تو ہماری جانیں نواب محمود خاں کی شکار ہو جاتیں۔
اسی رپورٹ میں انھوں نے سرسید کی دانشمندی، بے مثل ایمانداری اور سرگرمی پر شہادت دی تھی۔

بنارس کی سول جسٹس ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۸۷۴ء میں صاحب جج بنارس نے اُن کی نسبت لکھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔ وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں نہایت باقاعدہ اور ان کی طرف متوجہ رہنے والا ہے اور اس کے فیصلے نہایت احتیاط اور غور سے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ مقدمہ کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک جانب پر اس طرح غور کرتا ہے کہ عدالت اپیل کے فیصلہ کے واسطے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اُن کے اس بہت بڑے تجربہ سے جو ہر قسم کے جوڈیشل امور میں حاصل ہے، میں نے خود بہت فائدہ اٹھایا ہے۔"

ہائی کورٹ کے ججوں نے سرسید کی درخواست پنشن گورنمنٹ میں بھیجتے وقت حسب ذیل رپورٹ کی تھی "سید احمد خاں کے اوصاف اور قابلیت بحیثیت ایک پبلک سرونٹ کے ہز آنر پر بخوبی روشن ہیں مگر یہ عدالت بوجہ بالادست عدالت ہونے کے جس کے سید احمد خاں ماتحت رہے ہیں، اُن کی ذہانت، محنت، قابلیت اور ہوشیاری کی بلند اور بے داغ شہرت کو جو انھوں نے اپنے طول طویل زمانۂ ملازمت میں تمام جماعتوں کے درمیان حاصل کی ہے بطور شہادت کے درج کر دینا چاہتی ہے اور نیز اس نقصان پر افسوس ظاہر کرنا چاہتی ہے جو پبلک سروس کو جو انھوں نے اس قدر عزت اور شرافت کے ساتھ انجام دی ہے، اُن کی کنارہ کشی سے

پہنچے گا۔"

نواب لفٹننٹ گورنر کی طرف سے جو اس رپورٹ کا جواب موصول ہوا وہ یہ ہے "سید احمد خاں کا استعفا منظور کرنے میں ہز آنر لفٹننٹ گورنر نے مجھکو ہدایت کی ہے کہ ان کی جانب سے میں اُن کی ہائی اپنینین سید احمد خاں کی اس قابلیت اور ہوشیاری کی نسبت ظاہر کروں جو پبلک سروس میں اُن کے امتیاز کا باعث رہی ہے اور نیز اُن کی اُس روشن، مہذب اور بے غرضانہ محنت کی نسبت بھی جو انھوں نے اپنی پرائیویٹ لائف میں اپنے ہموطنوں کے فائدے کے واسطے کی ہے۔"

# استحقاق

اس موقع پر ہائی کورٹ نے چاہا تھا کہ سر سید کی خدمات کی نسبت ایک خاص شکریہ گورنمنٹ گزٹ میں مشتہر کرایا جائے مگر چونکہ یہ ایک غیر معمولی طریقہ تھا اس لیے عمل میں نہیں آنے پایا لیکن پاینیر نے غالباً رجسٹرار ہائی کورٹ کے اشارہ سے اس شکریہ کے الفاظ چھاپ کر مشتہر کر دیے تھے۔

کتاب "پلرز اوف دی انڈین اسپائر" جس میں سر سید کو ارکانِ سلطنت ہندوستان میں سے ایک رکن شمار کیا گیا ہے۔ اُن کی ممبری کونسل کے زمانہ کی طرف اشارہ کر کے یہ لکھا ہے کہ " اُن طریقوں میں سے جو لارڈ لٹن نے ہندوستانیوں کو عزت اور ذمہ داری کے مناصب پر ترقی دینے کے لیے اختیار کیے تھے کوئی طریقہ از روئے استحقاق کے اس قدر ہر دل عزیز نہیں ہوا جیسا کہ

شائستہ مسلمانوں کے اس واجب التعظیم لیڈر یعنی سید احمد خاں کا لیجس لیٹو کونسل میں مقرر کرنا ہوا ہے۔ اس اعزاز کو ہندو اور مسلمانوں نے مساوی طور پر سید احمد خاں کی دیانت داری۔ بے غرضانہ اور شریفانہ برتاؤ اور اُن کی قابلیتوں کا صلہ تسلیم کیا ہے۔"

# پولٹکل خدمات

مسٹر ایچ جی کین ممبر پارلیمنٹ نے اخبار "ہوم ورڈ میل" میں سرسید کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "سید احمد خان جس سے میں نے ۱۸۶۸ء میں جب کہ وہ لیجسلیٹو کونسل کا ممبر تھا، واقفیت حاصل کی تھی، ٹھیک اس قسم کا شخص ہے جس کو ہندوستان کا انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی خاصکر مشکل اور خطرہ کے وقت میں خواہش کرے گا۔ وہ ایک خاندانی، تعلیم یافتہ، لائق، دغا اور ادہ پوری اُپج اور مستقل طبیعت کا آدمی ہے۔ وہ تاج برطانیہ کا ایک خیرخواہ اور دوست سبجکٹ ہے۔ مگر باایںہمہ وہ انگریزی گورنمنٹ کے نقطوں سے بخوبی واقف ہے۔"

مسٹر تھیوڈ ورپک نے جو ۲۹۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کی وفات پر اسپیچ دی تھی اس میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "دس برس کا عرصہ ہوا کہ سر آکلنڈ کالون نے جب کہ وہ لفٹنٹ گورنر تھے مجھ سے یہ کہا تھا کہ کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی، برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے۔"

## رسالۂ اسباب بغاوت اور اس پر لوگونکی رائیں

رسالۂ اسباب بغاوت جس کا لکھنا ایک حیثیت سے ملک اور قوم کی

بے نظیر خدمت اور دوسری حیثیت سے تاج برطانیہ کی حقیقی خیر خواہی کا کام تھا، سر سید کی اُن جلیل القدر خدمات میں سے ہے جن سے وہ ارکان سلطنت میں شمار کیے جانے کے مستحق ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں جو ولایت سے مولوی سید مہدی علیخاں کو بھیجا ہے لکھتے ہیں کہ "میں انڈیا آفس میں صاحب سکرٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے مجھکو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب "اسباب بغاوت" مع تمام و کمال انگریزی ترجمہ کے دکھلائی۔ اسے دیکھ کر میرا بہت دل خوش ہوا۔ جو کچھ رائیں اس کی بدولت قرار پائیں اُن کا بیان بے فائدہ ہے۔ اہل ہند ناقدر دان، دوست کش اور اپنے خیر خواہ کے دشمن ہیں مگر میں خوش ہوں کہ میرے ہموطنوں کی بھلائی ہوئی۔"

اسی حال کو انھوں نے زبانی مجھ سے اس طرح بیان کیا کہ "ولایت میں سر جان کے فارن سکرٹری وزیر ہند سے پرائیویٹ ملاقات ہوئی تو اُن کی میز پر ایک دفتر کاغذات کا موجود تھا۔ انھوں نے ہنس کر کہا کہ "تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ یہ تمہارا رسالہ اسباب بغاوت اصل اور اس کا انگریزی ترجمہ ہے اور اُس کے ساتھ وہ تمام مباحثات ہیں جو اُس پر پارلیمنٹ میں ہوئے مگر چونکہ وہ تمام مباحثے کانفیڈنشل تھے اس لیے وہ نہ چھپے اور نہ اُن کا ولایت کے کسی اخبار میں تذکرہ ہوا۔"

## سر آکلنڈ کالون کی رائے

اسی کتاب کی نسبت ۱۸۸۸ء میں سر آکلنڈ کالون لفٹنٹ گورنر نے ٹرسٹیان محمڈن کالج کی ایڈریس کے جواب میں یہ الفاظ کہے تھے کہ "جو واقعات سب سے پہلے مجھکو اُس وقت پیش آئے جب کہ میں اول مرتبہ ہندوستان

میں آیا تھا۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بات تھی کہ میرے دوست سر سید احمد خاں نے ایک ایسے معاملہ میں مجھ سے اعانت کی خواہش کی جو اُس وقت انھوں نے شروع کیا تھا اور جس کی طرف اُن کی دلی توجہ مائل تھی۔ انھوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی تھی کہ میں اُن کو ہندوستانی زبان سے انگریزی زبان میں اس رسالہ کا ترجمہ کرنے میں مدد دوں جو انھوں نے اُن افسوسناک واقعات کے اسباب کی نسبت تحریر کیا تھا جو ۵۷ء میں ظہور میں آئے ہیں کہہ سکتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے اُس رسالہ کو دیکھا ہوگا انھوں نے مجھ سے اس امداد کی درخواست کر کے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا ہندوستان میں میرے دورِ ملازمت کے خاتمہ تک قائم رہیگا کیونکہ انھوں نے اس رسالہ میں خاصکر بعض ایسے خیالات پر زور دیا تھا جن کی پوری قوت کو میں اس کے بعد اپنے تجربہ کی رو سے بخوبی سمجھ سکا ہوں۔ سر سید احمد نے اس میں اشارہ کیا تھا کہ جو بات انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات اور حالات کو بخوبی سمجھیں۔ انھوں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ زیادہ تر اُن واقعات کی بنیاد جن پر وہ بحث کر رہے تھے، بجائے ناراضی کے غلط فہمی تھی۔ پس اگر انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے خیالات کے سمجھنے میں ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کریں گے تو اُن کے باہمی تعلقات بہت زیادہ مربوط و مستحکم ہوجائیں گے" اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "انھیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے اور انھیں خیالات کی دوسری صورت علیگڈھ کالج ہے۔"

# مسٹر مارلین کی رائے

مسٹر تھیوڈور مارلین نے جو سرسید کی وفات کے بعد اُن کے پولٹکل ورکس پر ایک آرٹیکل لکھا تھا اس میں وہ اسی رسالہ اسباب بغاوت کی نسبت لکھتے ہیں کہ " انگریزوں میں بہت سے اس بات کے بڑے خواہش مند تھے کہ فتح کے بعد (ہندوستانیوں سے) دل کھول کر انتقام لیں اور اُن کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاصکر بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں. اس وحشیانہ حالت میں جبکہ شدید تر خیالات کے پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا جو عام پسند نہ تھی، منہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی... ۱۸۵۸ء میں یہ دلیری کے الفاظ تھے. باوجود اس کے سرسید کے دلائل کے عام منشے کی سچائی اسی وقت سے تسلیم کرلی گئی ہے اور جو لوگ سرسید کے اُس برتاؤ پر جو اُس نے نیشنل کانگریس کے ساتھ کیا الزام لگاتے ہیں اُن کے لیے اس بات پر غور تا مفید ہوگا کہ اس نے اتنی مدت پہلے یعنی کہ ۱۸۵۸ء سے اب تک گذری ہے گورنمنٹ پر زور ڈالا تھا کہ لیجس لیٹو کونسل میں دیسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔"

# ہیوم نیوز کی رائے

انگلستان کے مشہور اخبار "ہوم نیوز" نے اس کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ " سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کیے تھے اُن میں سے بعض نہایت قیمتی اور عملدرآمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکام

ہندوستان نے کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کیں۔ اس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ ان اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جاسکتا ہے اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔"

## برمنگھم ڈیلی گزٹ کی رائے

"برمنگھم ڈیلی گزٹ" نے سرسید کی اسی کتاب کا کسی قدر خلاصہ لکھ کر یہ تحریر کیا تھا کہ "ان شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی[1] سے لے کر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی اور ہندوستانی اور یورپین جو ملازم سرکار نہ تھے وہ وائسرائے اور پریزیڈنسیوں کی لیجس لیٹو کونسلوں میں شریک کیے گئے۔"

## سینٹ جیمس بجٹ کی رائے

اخبار "سینٹ جیمس بجٹ" نے اسی کتاب پر ریمارک کیا تھا کہ "سید احمد خاں کی مستحکم وفاداری جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اس کے

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسالہ اسباب بغاوت کے دیکھنے کے بعد یہ تبدیلی عمل میں آئی ہے کیونکہ ملکہ معظمہ کا اشتہار جس میں اس تبدیلی کا اعلان کیا گیا تھا سرسید کی کتاب چھپنے سے پہلے شائع ہو چکا تھا پس اس سے یہ مراد ہے کہ جس بات کی آرزو سرسید نے اس کتاب میں ظاہر کی تھی وہ ان کی کتاب کے پیش ہونے سے پہلے ہی پوری کر دی گئی ۱۲۔

ملک کے واسطے سراسر مفید ہے، وہ اُس کے اُن خیالات اور رایوں کو نہایت سنگین کر دیتی ہے جو اُس نے بڑے جوش اور فصاحت کے ساتھ کتاب "اسباب بغاوت" میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت دلچسپ اور فائدہ مند ہے۔ خود سر سید احمد خاں دو دفعہ وائسرائے کی کونسل میں لارڈ لٹن اور لارڈ رپن کے عہد میں ممبر رہا ہے اور اس کی وہ خواہش جو ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی تھی پوری ہوئی ہے۔ لیکن ابھی اُس کی اس شکایت میں زور ہے کہ حاکم اور محکوم دونوں طرفداری اور غلط فہمی ہونے کے سبب ہنوز ایک دوسرے سے جدا ہیں اور یہ اکثر صورتوں میں عدم ہمدردی یا بالاتر قوم کی طرف سے عمدہ اخلاق ظاہر نہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک خیالی شکایت ہے۔ لیکن اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہم عملی لوگ ہیں، اس لیے ہم کو خیالی شکایتوں پر توجہ نہ کرنی چاہیے تو بے شک ہم اُس غلطی میں گھر جائیں گے جس کی سید احمد خاں شکایت کرتا ہے، ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔"

## کرنل گریہم کی رائے

کرنل گریہم جنھوں نے سرسید کی لائف لکھی ہے، وہ اس کتاب کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ہم میں سے بعضے لوگ سید احمد کی "اسباب بغاوت" سے متفق نہ ہوں مگر یہ رسالہ جس کو ہماری خیر خواہ اور وفادار

مسلمان شرفا میں سب سے لائق ترین شخص نے لکھا ہے، فی نفسہ بدرجہ غایت مفید ہے، کہ اُس سے ہندوستانی طرز خیالات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

# رسالۂ اسباب بغاوت کے بعض نتائج

اگرچہ کرنل موصوف کے بیان کے موافق ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو اس رسالہ کے مضامین بالکل نہ تسلیم کرتے ہوں یا اُس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے جیسا کہ مذکورۂ بالا انگریزی اخباروں میں تصریح کی گئی ہے، سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عمل درآمد اور اکثر شکایتوں کا تدارک کیا، مثلاً سب سے بڑی چیز جس کو سرسید نے کتاب مذکور میں بغاوت کا اصلی سبب قرار دیا تھا وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کے سبب سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا، یعنی، ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی رئیس لیجس لیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کیے گئے چنانچہ جنوری ۱۸۶۲ء کے اجلاس کونسل میں ہم پہلی ہی بار مہاراجہ نرندر سنگھ رئیس پٹیالہ راجہ دیو نرائن سنگھ رئیس بنارس اور راجہ ڈنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار کو شریک پاتے ہیں اگرچہ اُس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا، مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اس پودے کا جواب کسی قدر بار آور ہونے لگا ہے۔ اور اُن کا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ رہیگا۔ یا

مثلاً کتاب مذکور میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدہ پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پنڈت شمبوناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہونے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے ملنے لگے۔

## پولٹکل خدمات پر پال مال گزٹ کی رائے

لندن کے نامور اخبار پال مال گزٹ میں سرسید کی وفات پر اُن کی پولٹکل خدمات کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ "سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارکباد دے سکیں جس قدر کہ سرسید احمد خاں کی لائف پر وہ ابتداء سے آخر دم تک سرکار انگریزی کے راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اُس نے کیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔"

یہاں تک ہم نے سرسید کی سرکاری خدمات، اور جو وقعت اور اعتبار انھوں نے اُن خدمات کی بدولت ایک ایسی قوم کی حکومت میں حاصل کیا جس کی نظر میں ہندوستانیوں کا جینا شاید محال سے کچھ ہی کم ہوگا، اس کو بطور مشتے نمونہ از خروارے بیان کر دیا ہے۔ اب ہم اُن کی ملکی اور قومی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔

اگرچہ پہلے حصہ میں سرسید کے ہر قسم کے واقعات زندگی کے ضمن میں

اُن کی ملکی و قومی خدمات کا ذکر اپنی اپنی جگہ تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ مگر ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اُن کو ایک سلسلہ میں نہایت اختصار کے ساتھ منتظم کر کے ناظرین کو خاص طور پر اُن کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اور اُن کے متعلق جو امور پہلے حصہ میں بیان نہیں ہو سکے یا جو نتائج اُن خدمات پر مترتب ہوئے اُن کو بھی اِس سلسلہ میں شامل کر دیا جائے۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اِس کتاب میں ایک ایسے شخص کی خدمات کا ذکر کر رہے ہیں جس کے اختیار میں اپنی طاقت کے موافق کوشش و تدبیر کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ اُن کے ہاتھ میں سلطنت اور حکومت کی باگ ڈور تھی کہ اپنے ملک اور قوم کے واسطے جو چاہیے سو کر گزرے اور نہ ملک اور قوم کے دل اس کے قبضے میں تھے کہ جو نیک صلاح ان کو بتلائے اُس سے کسی کو اختلاف یا انکار نہ ہو۔ پس ہم کو سرسید کی لائف میں یہ نسبت اس کے کہ اُس کی کوششوں سے ملک اور قوم کو کیا کیا فائدے پہنچے، زیادہ تر یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس نے اُن کے فائدے کے واسطے کیا کیا کوششیں کیں۔ اسی لیے ہم نے سرسید کی کامیاب اور بارآور کوششوں کے ساتھ اُن کاموں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے کوئی معتدبہ نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ یا جو بسبب نامساعدت وقت کے ادھورے رہ گئے۔ تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس شخص کی ساری عمر کس دُھن اور کس اُدھیڑ بن میں گذری ہے۔

# ملکی و قومی خدمات

## ہمدردی

ہمدردی کا اصل مادہ ظاہرا انسان اور تمام حیوانات میں یکساں پیدا کیا گیا ہے
فرق صرف اس قدر ہے کہ دیگر حیوانات کی ہمدردی اُس حد سے جو اُن کی فطرت
میں رکھی گئی ہے، کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی برخلاف انسان کے کہ کبھی اس
کی ہمدردی ایک چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہتی ہے اور کبھی بیرونی اسباب
سے وہ نہایت وسیع ہو جاتی ہے. لیکن ہمیشہ اس کا تعلق اول گھر کی چار دیواری
سے شروع ہوتا ہے، پھر جس قدر انسان میں بیرونی اسباب سے متاثر ہونے
کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر وہ تعلق بڑھتا جاتا ہے. سرسید کے
واقعات زندگی سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُن میں ہمدردی کا مادہ
اور بیرونی اسباب سے منفعل ہونے کی قابلیت معمولی آدمیوں سے بمراتب
بڑھ کر پیدا کی گئی تھی. محبت جو کہ ہمدردی کی ماں ہے اُن کی طبیعت میں کوٹ
کوٹ کر بھری تھی۔

## خاندان کی محبّت

محبت کی پہلی سیڑھی خاندان کی محبت ہے، سو اس کی شہادتیں اس کتاب
میں جا بجا ملیں گی. خاندان کے بعد وطن کی محبت ہے سو دلی کے ساتھ جو دلبستگی

اُن کو تھی اور جو آخر کو حسرت کے ساتھ بدل گئی تھی۔ اس کا ثبوت بھی اِس کتاب میں متعدد مقامات پر ملے گا۔

## وطن کی محبّت

اسی وطن کی محبت کا اقتضا تھا جس نے اُن کو اُس اُجڑے دیار کے پرانے کھنڈروں اور قدیم یادگاروں کی تحقیقات میں بے انتہا مشقتیں اٹھانے پر مجبور کیا اور آئین اکبری کی تصحیح میں جس سے دلّی کے افضل ترین بادشاہ کی ایک دُھندلی تصویر کا اجالنا مقصود تھا، اُن سے فوق العادت محنت کرائی لیکن یہ سب کام ایسے تھے کہ اگر سرسید کی کوشش انھیں کاموں پر ختم ہو جاتیں تو شاید اُن کو ایک محب وطن کی خدمات کا درجہ نہ دیا جاتا۔ مگر جب اُن کی آیندہ مسلسل خدمات پر جن کا سلسلہ اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہا۔ نظر کیجاتی ہے تو لامحالہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے یہ معمولی کام اُسی طلائی زنجیر کی ابتدائی کڑیاں تھیں جو زمانۂ مستقبل میں اُن کی ملکی اور قومی خدمات سے ترتیب پانے والی تھی۔

## عملی قوت

پہلے حصہ میں جو سرسید کے ہر قسم کے کام تاریخ وار بیان کیے گیے ہیں اُن پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص میں جس درجہ کی عملی قوت پیدا کی گئی تھی وہ اُن کاموں پر بس کرنیوالی نہ تھی جو وہ ابتدائے حال میں وقتاً فوقتاً سرانجام کرتے رہے۔ باوجودیکہ عدالت کا کام جو ان کو سپرد تھا اور جس کو وہ کمال تندہی اور نہایت غور و فکر سے انجام کرتے دیتے تھے، فی نفسہٖ

ایک تھکا دینے والا کام تھا با اینہمہ وہ بعینہ ایک مستسقی کی طرح، جس کی پیاس چُلو دو چلو پانی سے نہیں بجھتی اور وہ کنویں یا ندی کی طرف دوڑتا ہے، ہمیشہ کسی بڑے کام کی تلاش میں رہتے تھے۔ غدر سے پہلے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے۔ انھوں نے مختلف قسم کے بہت سے کام سرانجام کیے مگر اُن کی پیاس کسی طرح نہ بجھی۔"

# خارجی اسباب سے متاثر ہونا

آخر وہ وقت آ پہنچا جب کہ اُن کی طبیعت کے اصلی جوہر ظاہر ہونے والے تھے۔ ۵۷ء کے ہنگامہ نے جیسا کہ سرسید کے کسی دوست کا قول ہے اُن کے دل پر وہ کام کیا جو لوتھر کے دل پر بجلی کے گرنے نے کیا تھا۔ جس طرح سورج کی گرمی سے پانی کا ایک خاص حصہ اپنے حیّز طبعی سے بلند ہو جاتا ہے، اسی طرح غدر کی آنچ نے سرسید کو اپنے طبقہ کی سطح سے بالاتر کر دیا۔ دلی، مرادآباد اور بجنور کے مسلمان خاندانوں کی تباہی اور بربادی دیکھ کر جس جوش کے ساتھ ہمدردی کی لہر اُن کے دل میں اٹھی وہ فی الواقع حیرت انگیز تھی اُس وقت اُن کا حال بعینہٖ اُس شخص کا سا تھا جس کے گھر میں آگ لگ کر گھر کا ایک حصہ جل گیا ہو اور باقی حصوں کے بچانے کے لیے دیوانہ وار ادھر اُدھر ہاتھ پانو مارتا پھرتا ہو۔ انھوں نے خیال کیا کہ جو مسلمان غدر کی روندن میں آ چکے اور جو خاندان بگڑ چکے اُن کو مدد پہنچانی تو اب امکان سے خارج ہے مگر جو باقی ہیں اور جو ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں اُن کو کس طرح غدر کے آیندہ خوفناک نتیجوں سے بچایا جائے؛ گورنمنٹ تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے بدگمان ہو گئی ہے۔ مسلمان گورنمنٹ کے شاید انتقام اور

سخت سزاؤں سے جو غدر کے بعد ظہور میں آئیں اُس کی مہربانی اور شفقت سے بالکل مایوس ہو گئے ہیں، جن غلط فہمیوں کے ہندوستانی شکار ہوئے ہیں اُن کی سوتیں بدستور جاری ہیں جس جہالت اور تعصب نے یہاں تک نوبت پہنچائی وہ اسی طرح ہندوستانیوں اور خاصکر مسلمانوں کے سر پر سوار ہے حکمران قوم مسلمانوں کی دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی ہے، انگریزی اخباروں میں برابر مسلمانوں کے برخلاف آرٹکل لکھے جاتے ہیں جن سے انگریزوں کا دل روز بروز مسلمانوں سے زیادہ پھٹتا جاتا ہے۔ کچہریاں اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے جاتے ہیں، فوج میں اُن کی بھرتی موقوف ہو گئی ہے۔ وہ درباروں میں کم بلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ تمام آثار اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ اب مسلمانوں کا ہندوستان میں عزت اور اعتبار کے ساتھ رہنا غیر ممکن ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کر کے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا یہاں تک کہ انھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود و باش کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، مگر آخر کار ان کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔ اس وقت جو کیفیت ان کے دل پر طاری تھی اُس کا کسی قدر اندازہ اُس نماز و مناجات کے پر درد الفاظ سے ہو سکتا ہے جو ملکۂ معظمہ کا اشتہار معافی شایع ہونے کے وقت انھوں نے بعد ادائے دوگانہ شکر الٰہی کے پندرہ ہزار مسلمانوں کے مجمع میں بمقام مرادآباد پڑھی تھی، اور جس کو ہم پہلے حصہ میں بجنسہٖ نقل کر چکے ہیں۔

الغرض اس مہم کے سر کرنے کے لیے جب کبھی جو تدبیر اُن کے خیال میں گذری اس کو انھوں نے کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں اُن کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں مغربی

طریقۂ تعلیم عام نہ ہوگا اُس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ میں جو منافرت چلی آتی ہے، وہ رفع نہ ہوگی۔

## مدرسۂ مراد آباد

چنانچہ مراد آباد میں آتے ہی انھوں نے اول ایک اسکول جس کو تعلیم کے میدان میں اُن کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے، قائم کیا پھر انھیں دنوں میں جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے۔

## سرکاری طریقۂ تعلیم پر اعتراض

ایک رائے جس میں ورنیکلر اسکولوں پر سخت اعتراض کیے تھے اور گورنمنٹ کو نہایت شدومد کے ساتھ مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ ہندوستان کے ساتھ فی الواقع بھلائی کرنی چاہتی ہے تو اُن کو انگریزی زبان میں تعلیم دے۔ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھاپ کر شایع کی۔

## بغاوت کے اسباب سے گورنمنٹ کو مطلع کرنا

پھر رسالۂ اسباب بغاوت کے ذریعہ سے گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کو اُن تمام شکایتوں سے جو از راہ غلط فہمی یا واجبی طور پر گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستانیوں کے دلوں میں متمکن تھیں اور اُن کے ظاہر ہونے کی کوئی سبیل نہ تھی، نہایت دلیری اور صفائی کے ساتھ ظاہر[۱] کیا۔

---

[۱] اسی رسالہ میں جہاں انھوں نے ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک نہ ہونے کی شکایت کی ہے وہاں (بقیہ آگے صفحہ پر)

# انتظام قحط اور یتیموں کی حفاظت

اُسی ہمدردی کے جوش میں جو اس وقت اُن کے دل میں موجزن تھا، انھوں نے صاحب کلکٹر مراد آباد سے خود درخواست کرکے قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اُن کی دسترس تھی ہندو و مسلمانوں کے یتیم بچوں کو مشنریوں کے چنگل سے بچانے میں کوشش کی۔ پھر اُسی زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کے برخلاف انگریزی اخباروں میں زیادہ بوچھاڑ ہونے لگی تو انھوں نے ایک سہ ماہی رسالہ موسوم بہ"

# رسائل لائل محمڈنز اف انڈیا

"لائل محمڈنز آف انڈیا" اردو اور انگریزی میں جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان

---

(بقیہ حاشیہ) اس اعتراض کا جواب کہ ہندوستانی جو جاہل اور بے تربیت تھے کونسل میں کیونکہ شریک کیے جا سکتے تھے، اس طرح دیا ہے کہ کونسل میں رعایا کے شریک کرنے کا طریقہ ہم نے علیحدہ بیان کیا ہے اس کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ پھر جو خط کہ سرسید نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کو لکھے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولایت ہی میں طریقۂ انتظام سلطنت ہندوستان پر ایک مبسوط کتاب لکھنی چاہتے تھے مگر جب راقم نے بذریعۂ تحریر کے ان سے اس کتاب کا حال دریافت کیا تو انھوں نے ایک لمبی تحریر بھیجی تھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس کتاب کے لکھتے وقت یہ ارادہ تھا کہ انڈیا کونسل کے ممبروں سے بھی ہر ایک پوائنٹ پر اس باب میں گفتگو کیجائے مگر کونسل مذکور کے تمام ممبر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور میں اردو میں، نہ وہ میری بات سمجھتے تھے اور نہ میں اُن کی۔ اس لیے کافی معلومات ملنے کا کوئی سامان میسر نہ آیا۔ پھر ہر ایک ممبر سے گفتگو کرنے کے لیے کرایہ کی گاڑی پر جانا پڑتا تھا اور جب تک گفتگو ہو گاڑی کو باہر انتظار کرنا پڑتا تھا اور ان اخراجات کا تحمل ناممکن تھا، اس لیے جو چند یادداشتیں اور مسودے لکھے تھے وہ سب معدوم کر دیے گئے ۱۲-

ہو چکا ہے نکالنا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے سُنا کہ ایک مسلمان کو

# شرح لفظ نصاریٰ

اس جرم میں کہ اُس نے انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا سخت سزا دی گئی ہے۔ یہ سنتے ہی انھوں نے ایک رسالہ اس لفظ کی تحقیق پر لکھکر اردو اور انگریزی میں شایع کیا جس میں نہایت خوبی سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان انگریزوں کو ازراہ تحقیر کے نصارا نہیں کہتے بلکہ قرآن کی رو سے اُن کے ہاں کوئی لقب انگریزوں کے لیے اس سے زیادہ معزز نہیں ہے۔

# تفسیر بائبل

مرادآباد ہی میں سرسید کو یہ خیال ہُوا کہ جو غلط فہمیاں عیسائی ملکوں میں اسلام اور بانی اسلام کی نسبت ابتدائے شیوع اسلام سے آج تک چلی آتی ہیں۔ اور جو تیرہ سو برس تک پکتے پکتے تمام دنیا کے عیسائیوں کی طرح انگریزوں کے نزدیک بھی مثل علوم متعارفہ کے مسلم الثبوت ٹھیر گئی ہیں جب تک وہ رفع نہ ہوں گی (اور اُن کا رفع ہونا ہنسی کھیل نہیں ہے) اُس وقت تک مسلمان ہمیشہ انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے رہیں گے اور جو تدبیر مسلمانوں کی صفائی کے لیے کیجائے گی وہ اس دوا کی طرح جو بغیر ازالۂ سبب کے کسی مرض میں علاج میں استعمال کیجائے بے سود ثابت ہوگی۔ اگرچہ یہ بہت بڑا کام تھا جس کا بوجھ سید احمد خاں جیسی حیثیت کے آدمی سے اٹھنا ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن وہ جو مشہور ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہوتا ہے جوں ہی سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا سعاسر کار سے اُن کی مدتوں کی چڑھی ہوئی تنخواہ جو غدر کے زمانہ میں

بند رہی تھی اور لٹے ہوئے اسباب کا معاوضہ اُن کو مل گیا۔ انھوں نے فوراً جیساکہ پہلے حصہ میں مفصل مذکور ہے اس عظیم الشان کام کی بنیاد مراد آباد ہی میں ڈالدی اور بائیبل کی تفسیر لکھنی اور ساتھ کے ساتھ چھپوانی شروع کر دی جس بنیاد پر اور جس غرض سے سرسید نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور جو اثر اُس کے شایع ہونے سے عیسائیوں کے دل پر ہوا اُس کا ذکر مجملاً ہم پہلے حصّہ میں کرچکے ہیں اُس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ کام خاصکر ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں کس قدر مفید اور نتیجہ خیز تھا لیکن کچھ تو اس لیے کہ مسلمانوں میں اُس کی کچھ قدر نہ ہوئی اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ سرسید کی توجہ اُس سے مفید تر اور اعلیٰ تر کاموں کی طرف منعطف ہوگئی اس تفسیر کی صرف دو جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔

## سائنٹفک سوسائٹی

غازیپور پہنچ کر انھوں نے دوسری طرح سے ہندوستانیوں اور انگریزوں میں میل جول بڑھانے اور اُس منافرت کے دور کرنے کی، جو ۵۷ء کی بغاوت نے حاکم و محکوم میں پیدا کر دی تھی، بنیاد ڈالی اس سے ہماری مراد سائنٹفک سوسائٹی کا قائم کرنا ہے جو اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ انگریزی اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے علمی مضامین پر سوسائٹی میں لکچر دیئے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصولِ حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے ہندو، مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اُس میں شامل کیے جائیں

اور اس طرح قومی مغایرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔

## سوسائٹی کے نتائج

قطع نظر اُن اہم مقاصد کے جن کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اُس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصوں کو پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی انسٹی ٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی۔

## انجمنوں کا قائم ہونا

پھر ۳۵ برس کے عرصہ میں جس قدر سوسائٹیاں۔ انجمنیں اور سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اُس کے بعد اور اسی کی ریس سے قائم ہوئیں اور اسی سوسائٹی کے اخبار نے تمام دیسی اخباروں کا رنگ بالکل بدل دیا۔ اُن میں بجائے اس کے کہ کچھ سچی اور اکثر بے سروپا بعید از قیاس خبریں درج ہوتی تھیں، پولٹیکل سوشل اور علمی و اخلاقی مضامین بھی خبروں کے ساتھ چھپنے لگے۔

## اخباروں کی اصلاح

لگے اور بجائے اس کے کہ وہ محض دیسیوں کے دل بہلانے کے اوزار تھے، اُن کو یہ دن نصیب ہوا کہ گورنمنٹ اُن کی آواز پر کان لگانے لگی۔

# اُردو لٹریچر کی ترقی

پھر اسی سوسائٹی کی درخواست پر جو کہ اُس نے ایڈریس مورخہ ۹، مئی ۶۸ء میں بحضور سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر بمقام علیگڑھ پیش کی تھی، ہز آنر نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی اُن میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی، چنانچہ ۲۶، اگست ۶۸ء کو یعنی ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹ شمال مغرب نے وہ انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا اور جس نے تیس برس کے عرصہ میں ملک کو اس سرے سے اس سرے تک دیسی زبانوں کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گذر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اُس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اُس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے خصوصاً اردو لٹریچر صرف اسی تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔

اسی ایڈریس میں جو کہ سر ولیم میور کی حضور میں پیش کیا گیا تھا یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ منجملہ اُن کتابوں کے جو اُردو زبان میں سوسائٹی شائع کر رہی ہے۔ دو کتابیں سید احمد خاں لائف آنریری سکرٹری تیار کر رہے ہیں، ایک اُردو لٹریچر کی تاریخ یا فہرست جس میں تمام کتابوں کا جو ابتدا سے آج تک چھپی ہیں نام، اُس کے مصنف کا حال، تصنیف کا زمانہ، طرز بیان اور مختلف

مقامات سے اُس کی عبارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہوگا۔
دوسری اُردو ڈکشنری. مگر معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب کی شروع کرنے کی
نوبت نہیں پہنچی لیکن اُردو ڈکشنری جو سرسید نے لکھنی شروع کی تھی اُس کا
نمونہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپا ہوا اور اس پر بعض یورپین فاضلوں کے عمدہ
ریمارکس موجود ہیں۔ اگرچہ سرسید نے ان دونوں کاموں میں سے کوئی کام پورا نہیں
کیا لیکن اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ملک اور قوم کی تمام مقدم
ضرورتیں جن میں سے بعضی ابتک بھی لوگوں کو محسوس نہیں ہوئیں اس شخص نے
اب سے نہیں بلکہ چالیس برس پہلے بخوبی محسوس کر لی تھیں. یہاں تک کہ جب
کوئی اُن ضرورتوں کا پورا کرنے والا نظر نہ آتا تھا تو باوجود یک سر و ہزار سودا ہونے
کے خود ہی اس کام کے سرانجام کرنے کو کھڑا ہو جاتا تھا۔

مگر درحقیقت یہ سب سوسائٹی کے ضمنی نتائج تھے اور جس بڑے مقصد
کے لیے وہ قائم کی گئی تھی اُس کا گھر ابھی بہت دور تھا اور محض سوسائٹی اُس
درد کی دوا نہیں ہوسکتی تھی

# سوسائٹی کی ترقی میں کوشش

باانیہمہ سرسید نے سوسائٹی کے ترقی دینے میں
.... کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فرو گذاشت نہیں کیا یہاں تک کہ سالانہ
چندہ، اور قیمت اخبار کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ سالانہ تک
پہنچ گئی. ضلع کے رئیسوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا، گورنمنٹ کو اس کی طرف
توجہ دلائی. خود اپنی لیاقت سے بڑھ کر اُس کو مالی مدد پہنچائی، اُس کی عالیشان
عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی. اُس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ
تدبیریں کیں، لائق لائق آدمی ترجمہ کے کام کے لیے مقرر کیے. قریب چالیس

کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں، غازیپور سے علیگڑھ، بنارس جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دھن برابر لگی رہی۔ چنانچہ ولایت جاتے ہوئے جو خط کہ انھوں نے مولوی مہدی علیخاں کو عدن سے بھیجا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی و کوشش کا واسطے شکست کر دینے کے باقی نہ رکھیں گے پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اُس کے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں

سوسائٹی قائم کرنے کے بعد جب تک کہ سرسید اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچے جو کام ملک اور قوم کی بھلائی کا اُن کو معلوم ہوا اسی ذوق و شوق اور سرگرمی کے ساتھ جو ان کی جبلت میں داخل تھا اُس کو سرانجام دیا۔

## غازیپور کا مدرسہ

۱۸۶۴ء میں انھوں نے غازیپور میں محض قومی چندہ سے بڑی دھوم دھام کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا جس کی اُٹھان مدرسۃ العلوم کی ابتدا سے کچھ ہی کم سمجھنی چاہیے اور جو اب تک وکٹوریا اسکول کے نام سے غازیپور میں جاری ہے۔

## برٹش انڈین ایسوسی ایشن

پھر ۱۸۶۶ء میں انھوں نے علیگڑھ آ کر "برٹش انڈین ایسوسیئیشن" جس

نے اب "نیشنل کانگرس" کی صورت میں جنم لیا ہے قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے درد دل اور اپنی ہی شکایتوں کے اظہار کے لیے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔ اگرچہ جس مقصد کے لیے یہ ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی وہ اس سبب سے کہ ملک میں اس کے چلانے کی قابلیت نہ تھی اور سرسید جو اس کے بانی مبانی تھے وہ یک انار و صد بیمار کے مصداق تھے، حاصل نہ ہوا۔ مگر اس کے ذریعہ سے اکثر مفید تحریکیں کی گئیں اور ان میں سے اکثر میں کامیابی ہوئی جیسے مسافران ریل کی تکلیفات کی شکایت، کتابوں کے محصول میں تخفیف کی درخواست۔ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کی سلسلہ جنبانی وغیرہ۔

# ہومیوپیتھیک کی تائید

پھر ۱۸۶۷ء میں بمقام بنارس اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہومیوپیتھیک سے زیادہ کوئی طریقہ علاج کا ملک کے لیے مفید نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے جہاں تک اُن کی قدرت میں تھا، اس کی حمایت اور ترویج و اشاعت میں کوشش کی۔ اس کی تائید کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جس کے وہ خود سکرٹری تھے ایک ہومیوپیتھیک ہوسپٹل کھولا۔ اس طریقہ علاج کی ہسٹری اور اس کے اصول پر لکچر دیے اور ایک رسالہ لکھ کر شایع کیا۔

# تعلیمی کمیٹیاں

پھر ۱۸۶۸ء میں سرسید ہی کی سلسلہ جنبانی سے تمام اضلاع شمال مغرب

ہیں تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں جن میں ہر ضلع کے زمینداروں کو تعلیم کے انتظام نگرانی اور اخراجات پر بحث اور گفتگو کرنے کا اختیار دیا گیا۔

## اردو زبان کی حمایت

پھر بنارس ہی میں انھوں نے اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت میں جو بظاہر خاص مسلمانوں کی طرفداری کا، مگر درحقیقت تمام شمالی ہندوستان کی بھلائی کا کام تھا بے انتہا کوشش کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان کے دفاتر سرکاری میں اردو زبان اور فارسی خط بدستور بحال و برقرار رکھا گیا اور ہزارہا ہندو مسلمان جو بذریعۂ اردو تحریر اور فارسی خط کے سرکاری نوکری کرتے تھے یا نوکری کے امیدوار تھے اور جن کو بڈھے طوطے کی طرح اب بھاشا زبان اور ناگری حرفوں کا سیکھنا اور اس میں امتحان دینا ایسا ہی مشکل تھا جیسا نیچر کا بدلنا، اس ناگہانی طوفان کے ریلے سے بچ گئے اور اردو زبان جس نے کئی صدیوں کی ترقی کے بعد ایک مستقل زبان کا درجہ حاصل کیا تھا اور جو ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر ٹکڑے میں برابر بولی اور سمجھی جاتی تھی وہ اس صدمہ سے جو کورٹ کی زبان اور خط کے بدلنے سے اس کو پہنچنے والا تھا، محفوظ رہی۔

## مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول پیدا کرنا

اس کے سوا بنارس ہی میں انھوں نے احکام طعام اہل کتاب پر ایک رسالہ اس غرض سے لکھا کہ مسلمان جن کا مذہب انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے سے مانع نہیں ہے، بلکہ محض رسم و رواج کی قید نے اُن کو آج

تک انگریزوں سے دور دور رکھا ہے اُن کی یہ جھجک اور رکاوٹ جاتی رہے اُن کو حکمراں قوم کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملے، ہر ایک قوم دوسری قوم کے اصلی خیالات سے بلا واسطہ اطلاع حاصل کرے اور بد گمانی اور خوف صفائی اور اطمینان کے ساتھ بدل جائے. اگرچہ اس وقت اس رسالہ پر بہت سے ریویو ہوئے اور سرسید کو اس کے لکھنے پر جیسی کہ امید تھی سب کچھ کہا گیا مگر آخر کار اُس کا نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جن کی انگریزوں تک رسائی اور اُن کے ساتھ ربط ضبط تھا، یہ آن بالکل توڑ ڈالی۔

اس رسالہ کے علاوہ سرسید نے اور طرح طرح سے انگریزوں اور مسلمانوں میں موانست پیدا کرنے کی کوشش کی بمسلمانوں کی جھجک نکالنے کے لیے انھوں نے اولاً خود انگریزوں کے ساتھ معاشرت اور موانست اختیار کر کے قوم کے واسطے ایک مثال قائم کی اور رفتہ رفتہ اپنے دوستوں کی سوسائٹی میں اس طریقہ کو وسعت دے کر اس کا اثر دور تک پھیلا دیا. تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں انھوں نے بہت سے آرٹیکل اسی مضمون پر لکھے۔ انگریزوں کو انھوں نے سب سے پہلے نہایت شد و مد کے ساتھ رسالۂ اسباب بغاوت میں متنبہ کیا تھا کہ اُن کو ہندوستانیوں کے ساتھ دوستی اور صداقت کا برتاؤ رکھنا ضرور ہے. اس کے بعد ہمیشہ اپنی تحریروں اور پبلک اسپیچوں میں اس بات کی تمنا ظاہر کرتے رہے کہ ہمارے اور انگریزوں کے سوشل تعلقات برادرانہ اور دوستانہ ہونے چاہییں نہ حاکم محکومانہ۔

## مسٹر بلنٹ کی دعوت میں اسپیچ

اس موقع پر ہم سرسید کی ایک مختصر اسپیچ جو انھوں نے علیگڑھ میں ایک

ڈنر پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کا جام صحت پر ولوپز کرتے وقت ۸۴ء میں
کی تھی اور جس میں بھی تمنا خاص مسلمانوں کی طرف سے ایک لطیف پیرایہ
میں ظاہر کی گئی تھی، بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ سر سید نے کہا "ہم کو نہایت
خوشی ہے کہ مسٹر بلنٹ نے ہمارے ملک کو دیکھا۔ ہماری قوم کے مختلف
گروہوں سے ملے جو ہم کو امید ہے کہ انھوں نے ہر جگہ ہماری قوم کو تاج برطانیہ
کا لائل اور کوئین وکٹوریا ایمپریس اوف انڈیا کا دلی خیر خواہ پایا ہوگا۔ اگر
ہماری کسی آرزو سے وہ واقف ہوئے ہوں گے تو وہ صرف انگریزوں کی
طرف سے سمپتھی کی خواہش ہوگی جس کی نسبت بلاشبہ میں کہوں گا کہ ہماری
وہ خواہش پورے طور پر پوری نہیں ہوئی "۔

ور مسلمانوں کی یہ خواہش کہ مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں سمپتھی قائم
ہو، کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کبھی کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ ہم مسلمانوں
میں اور انگلش نیشن میں کوئی معرکہ ایسا گذرا ہو کہ ہم میں اور ان میں کوئی بنائے
مخاصمت قائم ہوئی ہو، ان کو ہم سے بدلا لینے کی رغبت ہو اور ہم کو ان کے
عروج اقبال سے رشک و حسد ہو کر وسیڈ کے زمانہ میں جو ایک زمانہ ہر قسم
کی عداوتوں کے برانگیختہ ہونے کا تھا، انگلش نیشن کو بہت ہی کم ان معرکوں
سے تعلق تھا "۔

"یہ بات سچ ہے کہ ہم نے ہندوستان میں کئی صدیوں تک شاہنشاہی
کی، یہ بھی سچ ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کی شان و شوکت کو بھول نہیں سکتے
لیکن اگر یہ خیال کسی شخص کے دل میں ہو کہ ہم مسلمانوں کو انگلش نیشن کے
ساتھ اس وجہ سے کہ انھوں نے ہماری جگہ ہندوستان کی حکومت حاصل
کی، کچھ حسد و رشک ہے تو وہ خیال محض بے بنیاد ہوگا۔ وہ زمانہ جس میں

انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی ایسا زمانہ تھا کہ بچاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی، اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا تاکہ گاسپل کے عہد نامہ کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں مگر اس وقت اس پر کچھ کہنا ضرور نہیں ہے کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدہ کو کہاں تک پورا کیا۔"

"ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قائم کی۔ ہندوستان میں انگلش حکومت قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پھلوں کے شریک تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُن دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا۔ پس ہم مسلمانوں کی نسبت ایسا خیال کرنا کہ ہم انگلش حکومت کو ایک ناگواری سے دیکھتے ہیں محض ایک غلط خیال ہوگا۔"

"انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی، مگر مثل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل ہونی چاہیے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لیے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کے لیے۔ ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا اُن کی خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی اور بہتری کے لیے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم میں اور ان میں سمپتھی نہ ہو۔ سمپتھی سے میری مراد پولٹیکل سمپتھی نہیں ہے پولٹیکل سمپتھی تانبے کے برتن پر چاندی کے ملمع سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی، اس کا اثر دونوں (فریق) کے دلوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ ایک فریق جانتا ہے کہ وہ تانبے کا برتن ہے دوسرا فریق سمجھتا ہے کہ وہ جھوٹے ملمع کی قلعی ہے۔ سمپتھی سے میری مراد برادرانہ و دوستانہ سمپتھی ہے۔"

سرسید کہتے تھے کہ یہ اسپیچ جب اخبار میں سرالیفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر

کی نظر سے گذری اور اس کے بعد میں اُن سے ملا تو انھوں نے فرمایا کہ تم نے یہ عجب طرح کی اسپیچ دی تھی، میں نے کہا شاید عجیب ہو مگر غلط نہیں تھی۔ غالباً ہز آنر کو اسپیچ مذکور کے اس فقرہ پر تعجب ہوا ہو گا کہ " انگلش حکومت کے قائم ہونے میں ہم اور وہ شل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے "۔ شاید عام لوگ سرسید کی اس تلمیح سے آگاہ نہ ہوں، اس لیے اس کا جو مطلب ہم سمجھے ہیں اس کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ غالباً سرسید نے اس فقرہ میں ہندوستان کے اُن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک ہندوستان کی ابتدائی انگریزی فتوحات اور سرکاری کمپنی کے رعب و داب اور اس کی پالسی کو مسلمان امیروں اور حکمرانوں کی تائید اور آشتی سے بہت مدد ملی ہے۔ جیسے پلاسی کی لڑائی میں میر جعفر کا بمقابلہ سراج الدولہ کے لارڈ کلائیو کا ساتھ دینا، شاہ عالم کا مرہٹوں کے مقابلے کے وقت اپنے تئیں لارڈ لیک کی حفاظت میں سپرد کر دینا اور نظام حیدرآباد کا لارڈ ولزلی کی صلاح ملنت اور تمام فرانسیسیوں کی فوج کو اپنی قلمرو سے یک قلم موقوف کرنا وغیرہ وغیرہ۔

## نمائش آگرہ کے دربار میں یورپین افسروں سے جھگڑا

ایک اور موقع پر اسی سودا کے جوش میں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ اچھا نہیں ہے سرسید ایک ایسی جرأت کر بیٹھے جس کی بدولت آخر کار اُن کو گورنمنٹ سے معافی مانگنی پڑی۔ فروری ۱۸۶۷ء میں جب کہ ڈریمنڈ صاحب اضلاع شمالی مغرب میں لفٹننٹ گورنر تھے، آگرہ میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی اور سرسید بھی منتظم کمیٹی کے ایک ممبر تھے۔ اس کمیٹی میں اُن کے سوا اور بھی چند معزز ہندوستانی انگریزوں

کے ساتھ شامل نہیں تھے اور تمام ممبروں کو یکساں اختیار دیے گئے تھے۔ کسی طرح کا تفاوت انگریزوں اور ہندوستانی ممبروں میں نہ تھا۔ نمائش کی اخیر تاریخ دربار کے لیے مقرر تھی اور دربار کا انتظام مسٹر پالک کلکٹر ضلع آگرہ کے سپرد تھا۔ صاحب موصوف نے نمائش گاہ کے قریب ایک میدان میں درباریوں کے لیے کرسیاں اس طرح بچھوائیں کہ جو مقام کسی قدر بلند تھا کرسیوں کی ایک لائن تو اُس مقام پر لگائی اور اس پر ایک شامیانہ بھی جس سے دھوپ کی روک ہو کھچوا دیا اور دوسری لائن اسی کے متوازی مگر اس سے ذرا نیچی جگہ پر لگوائی جس پر شامیانہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ سرسید نے اکثر ہندوستانی درباریوں کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اس موقع پر گورنمنٹ کو یہ منظور ہے کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں کچھ تمیز نہ رکھی جائے اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک معزز ہندوستانی شاید دربار سے ایک دن پہلے چلتے پھرتے دربار کے میدان کی طرف جا نکلے اور اتفاق سے اوپر کی لائن میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک بابو نے آکر اُن کو وہاں سے اٹھا دیا اور کہا کہ آپ کے واسطے نیچے کی لائن لگائی گئی ہے۔ وہ وہاں سے سیدھے سرسید کے پاس آئے اور حال بیان کیا اور یہ کہا کہ آپ کا خیال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مساوات کے باب میں صحیح نہ تھا۔ سرسید کو نہایت تعجب اور اس کے ساتھ سخت ندامت ہوئی کہ جو کچھ لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا۔ وہ غلط ہوگیا۔ یہ اسی وقت دربار کے میدان میں پہنچے اور قصداً اوپر کی لائن میں ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ بابو نے آکر ان کو بھی ٹوکا یہ وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسٹر جیمس سمتھ سکرٹری گورنمنٹ سے جو وہیں دربار کے ٹکٹ بانٹ رہے تھے، سارا حال بیان کیا۔ انھوں نے بھی اس امر کو

ناپسند کیا اور سرسید سے کہا کہ آپ اس کا ذکر مسٹر پالک سے کریں۔ اتنے ہی
میں مسٹر تھارن ہل صدر بورڈ کے حاکم اعلیٰ وہیں چلے آئے۔ جب اُن کو یہ قصہ
معلوم ہوا تو وہ سرسید پر نہایت افروختہ ہوئے اور کہا کہ تم لوگوں نے غدر میں
کونسی برائی تھی جو ہمارے ساتھ نہیں کی! اب تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے
اور ہماری عورتوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو دربار میں بیٹھو! سرسید نے کہا اسی
سبب سے تو یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں کہ آپ لوگ ہندوستانیوں کو
ذلیل سمجھتے رہے۔ اگر اُن کو اس طرح ذلیل نہ سمجھا جاتا تو کیوں یہاں تک نوبت
پہنچتی۔ تھارن ہل صاحب اور زیادہ برہم ہوئے۔ آخر مسٹر جیمس سمتھ نے
سرسید کو سمجھایا کہ اس گفتگو سے کچھ فائدہ نہیں۔ سرسید وہاں سے اپنے ڈیرے
میں چلے آئے اور دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن یہ خبر نواب لفٹنٹ
گورنر کو پہنچی تو انھوں نے بھی دربار کی ترتیب اور انتظام کو ناپسند کیا اور یہ
حکم دیا کہ اس وقت زیادہ تبدیلی تو نہیں ہوسکتی لیکن ہر ضلع اور قمست کے
حکام کو چاہیے کہ اپنے اپنے ضلع اور قمست کے ہندوستانی رئیسوں اور افسروں
کے ساتھ نیچے کی لائن میں بیٹھیں۔ دربار کے بعد جو یوروپین افسر سرسید سے
ملتا تھا اس واقعہ کو پوچھتا تھا اور جب وہ بیان کرتے تھے تو بگڑتا تھا۔ لاچار
انھوں نے وہاں زیادہ ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور رات کو وہاں سے سوار ہوکر
علیگڑھ چلے آئے مگر چند روز بعد لوکل گورنمنٹ کے سکرٹری کی چٹھی سرسید
کے نام پہنچی جس میں اُن سے اس بات کا جواب طلب کیا گیا تھا کہ تم دربار
میں کیوں نہیں شریک ہوئے! اور بلا اجازت کس لیے علیگڑھ چلے گئے۔
سرسید نے آگرہ سے بلا اجازت چلے آنے کا سبب لکھ بھیجا اور دربار میں
شریک نہ ہونے کی معافی چاہی اس کے بعد پھر وہاں سے کچھ باز پرس نہیں

ہوئی. مگر اس نمائش سے پہلے جو لارڈ لارنس مرحوم وائسرائے وگورنر جنرل نے آگرہ میں دربار کیا تھا وہاں سرسید کو ایک طلائی تمغہ دیئے جانے کا حکم دیا تھا اور وہ تمغہ اب تیار ہوا تھا۔ چونکہ سرسید نمائش کے دربار میں شریک نہیں ہوئے تھے اس لیے نواب لفٹنٹ گورنر نے وہ تمغہ صاحب کمشنر قسمت میرٹھ کو دیدیا تاکہ وہ میرٹھ جاتے ہوئے علیگڑھ میں سرسید کو اپنے ہاتھ سے پہناتے جائیں۔ صاحب کمشنر جب علیگڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو سرسید حسب الحکم وہاں موجود تھے ان کو ایک طرف لیجا کر بسبب اُس رنجش کے جو تھارن ہل صاحب سے اُنھوں نے سخت گفتگو کی تھی یہ کہا کہ اگرچہ میں اپنے ہاتھ سے تم کو تمغہ پہنانا پسند نہیں کرتا لیکن گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں۔ یہ کہکر سرسید کو تمغہ پہنانا چاہا سرسید نے یہ کہکر کہ میں بھی گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں اُن کے آگے سر جھکا دیا اور تمغہ پہن کر چلے آئے۔ ہم نے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ اُنھیں دنوں میں گورنمنٹ کا ارادہ سب ججوں کی تنخواہ میں معقول اضافہ کرنے کا تھا مگر سرسید کی اس کار روائی سے وہ اضافہ مدت تک ظہور میں نہیں آیا اور سرسید کے ساتھ اور لوگ بھی جو اُن کے ہم عہدہ تھے، اُس سے محروم رہے۔ نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بہت دن بعد مسٹر پالک سے جب کہ وہ کمشنر تھے ایک دن سرسید کا ذکر آیا اُنھوں نے نہایت چیں بہ چیں ہو کر کہا کہ وہ بڑا مفسد اور باغی ہے اور آگرہ کی نمائش گاہ کا وہ تمام قصہ بیان کیا میں نے یہ حال سید صاحب کو لکھ بھیجا اُنھوں نے مسٹر پالک کو ایک مفصل چٹھی لکھ کر بھیجی جس میں اصل منشا اپنی اس جسارت کا بیان کیا تھا۔ اس چٹھی کے آنے کے بعد پھر مسٹر پالک اُن کی طرف سے بالکل صاف ہو گئے تھے۔

الغرض سرسید کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کوئی برتاؤ انگریزوں کی طرف سے ایسا نہ ہو جو ہندوستانیوں کی ذلت کا باعث ہو خصوصاً مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فروگذاشت نہیں کیا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی سالانہ جلدوں میں شاید ہی کوئی جلد ایسی نکلے جس میں اُن کے متعدد آرٹکل اس مضمون پر لکھے ہوئے موجود نہ ہوں۔

## ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

خصوصاً ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو جو انھوں نے ۱۸۷۱ء میں بمقام بنارس لکھا تھا اور جس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے، سرسید کی اُن جلیل القدر خدمات میں سے ہے جس کے شکر سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور وہابی مسلمان خصوصاً کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے چونکہ اس ریویو میں سرسید نے اپنے وہابی ہونے کا اقرار کیا تھا اس لیے انگریزوں کی بدگمانی وہابیوں کی بالکل جاتی رہی تھی۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ "غالباً ۱۸۷۰ء میں جب مسٹر گریفن ڈپٹی کمشنر لاہور نے منشی قادر بخش خاں تحصیلدار چونیاں کو ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ پر بجرم وہابیت زیر مواخذہ کرکے صاحب فنانشل کمشنر کے پاس بھیجا اور کرنل ڈیوس کو جو اس وقت کمشنر تھے۔ یہ معلوم ہوا کہ قادر بخش خاں کا وہی مذہب ہے جو سید احمد خاں کا ہے تو انھوں نے فنانشل کمشنر سے سفارش کرکے اُن کی تبدیلی قصور میں کروا دی۔ اس کے بعد جب اُن کی تبدیلی قصور سے ہونے لگی تو مسٹر ایرٹن اسسٹنٹ کمشنر قصور نے اُن کو جو سرٹیفکیٹ بغرض صفائی کے دیا تھا اُس میں بڑا

بثبوت اُن کی صفائی کا یہ لکھا تھا کہ یہ شخص وہی مذہب رکھتا ہے جو سید احمد خاں صدر الصدور اضلاع شمال مغرب کا مذہب ہے اور اس لیے اُس کی نسبت بدخواہی سرکار کا اشتباہ محض لغو ہے۔"

# ولایت میں مسلمانوں کی خیر خواہی کے خیالات

ولایت کا سفر جو سرسید نے ۱۸۶۹ء میں کیا اگرچہ بہ ظاہر اس غرض سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو تعلیم کے لیے انگلستان پہنچا کر اُس کے آرام و آسائش و تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی آنکھوں کے سامنے کریں اور اُس کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان حاصل کر کے واپس چلے آئیں مگر جن مشغلوں اور جن منصوبوں میں انھوں نے سترہ مہینے لندن میں بسر کیے اُن سے صاف پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی تعلیم کا صرف ایک بہانہ تھا ورنہ اصل منشا اس سفر دور دراز کا قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کے جوش کے سوا کچھ نہ تھا، اُس وقت اسلام اور مسلمانوں کی لگن میں سرسید کا حال بعینہٖ اس شعر کا مصداق تھا۔

"تَرَکْتُ لِلنَّاسِ دُنْیَاهُمْ وَدِیْنَهُمْ ۔۔۔ شُغْلًا لِحُبِّکَ یَا دِیْنِیْ وَدُنْیَائِیْ"[1]

مذہب اسلام کی خدمت جو کچھ کہ وہاں اُن سے بن آئی اس کا ذکر ہم اگلے عنوان میں کریں گے، یہاں صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ اس سفر کے آغاز سے لے کر انجام تک برابر اُن کو مسلمانوں کی لو کس قدر لگی رہی ہے۔

---

[1] شاعر اپنے محبوب کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ لوگوں کو اُن کی دنیا اور اُن کا دین مبارک ہو، میرا تو دین بھی تو ہی ہے اور دنیا بھی تو ہی ۱۲۔

# دلسوزی کے آرٹکل

اُن کے سفرنامہ سے جس کا نمونہ پہلے حصہ میں دکھایا جاچکا ہے اور اُن کے آرٹیکلوں سے جو وقتاً فوقتاً وہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کے لیے ولایت سے ہندوستان میں بھیجتے رہے ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان سے جاتے وقت جو حالت کہ وہ مسلمانوں کی دیکھ گئے تھے اُس سے اُن کے دل پر عجب بے چینی اور قلق کا عالم تھا خصوصاً اُن کے دل کی کیفیت اور تلاطم۔

# دلسوزی کے پرائیویٹ خطوط

ان پرائیویٹ خطوں کے دیکھنے سے بالکل آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے جو انھوں نے اپنے ہمدرد اور دلی دوست سید مہدی علیخاں کو ولایت سے بھیجے ہیں اور جو اس کتاب کے لکھتے وقت مخدومی مولوی سید زین العابدین خاں نے راقم کو عنایت کیے ہیں۔ صاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص قوم کے سوز میں انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ کبھی یورپ کی ترقی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پستی و تنزل کا اندازہ کر کے نہایت مایوسی کے الفاظ لکھتا ہے۔ کبھی کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون مسلمانوں کے برخلاف دیکھ کر بیچ و تاب کھاتا ہے۔ کہیں یہ صلاح دیتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی انجمن مسلمانوں کی طرز معاشرت کی اصلاح کے لیے جلد قائم کرنی چاہیے۔ کبھی اسی غرض سے کوئی قومی اخبار یا میگزین ہندوستان میں جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے کبھی انگریزی میں ایسی کتابیں لکھوانے پر کمر باندھتا ہے جن میں یورپ کے مؤرخوں کے اُن بیجا اعتراضات کا جواب دیا جائے جو انھوں نے

مسلمانوں بادشاہوں یا خلیفوں پر وارد کیے ہیں اور جن کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی پولٹکل حالت پر بہت بُرا پڑتا ہے اور اس کام کے لیے ہندوستان سے چندہ طلب کرتا ہے، کبھی ایسی کتابیں لکھوانے کا ارادہ کرتا ہے جن سے مسلمانوں کو اپنی گذشتہ عظمت کا خیال پیدا ہو اور اُن کو سلف کی ترقی اور اپنے تنزل کا اندازہ کرنے سے غیرت آئے، کبھی کسی ہندوستان کے مسلمان کے اعزاز کی خبر سُن کر نہایت خوشی ظاہر کرتا ہے اور کبھی کسی ایسے قانون کے نافذ ہونے پر جس سے ہندوستانیوں کے حقوق کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے افسوس کرتا ہے. یہاں ہم چند فقرے مذکورہ بالا خطوں میں سے ناظرین کی اطلاع کے لیے بطور نمونہ کے نقل کرتے ہیں۔

ایک خط میں اس عربی مدرسہ کا جو دلی میں منشی امو جان مرحوم کے مکان میں قائم کیا گیا تھا، ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "جان من و جناب من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے. افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی اُن کا نکالنے والا نہیں. ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں. ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں. اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے. اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے. اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے! اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے؟ اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے. انشاء اللہ تعالےٰ میں یہاں سے واپس آکر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا مگر مجھ کافر، مردود، گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا۔"

ایک اور خط میں اس طرح لکھتے ہیں، "جس کتاب[1] کے چھاپہ ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہو گئی. ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اس کے نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیسا سچ اختیار کیا ہے، گو بعض خیالات اس کے ہمارے خیالات کے مطابق نہ ہوں وہ مسلمان نہیں ہے انگریز ہے جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔"

اب ایک اور بات ضروری ہے جو لکھتا ہوں انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو. ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ از راہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں اس لیے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔"

"دو بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کو نہایت

---

[1] یہ اس کتاب کا ذکر ہے جو جان ڈیون پورٹ نے اسلام کی حمایت میں لکھی تھی اور جس کو لندن میں کوئی پبلشر نہیں چھاپتا تھا مگر سرسید نے وہاں پہنچ کر اپنے روپیہ سے اس کو چھپوا کر ہندوستان میں بھیجا اور یہاں دو شخصوں نے اس کے الگ الگ ترجمے کیے. اگرچہ ڈیون پورٹ کی انگلستان میں کچھ وقعت نہ تھی اور اس کی کتاب میں اور مصنفوں کے اقوال نقل کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا مگر چونکہ سرسید نے اس سے پہلے کسی یوروپین مصنف کی ایسی تحریر جس میں اسلام کی اس قدر حمایت کی گئی ہو نہیں دیکھی تھی اس لیے ان کو اس کے شایع کرنے کا خیال ہوا ۱۲-

بڑا تعلق ہے، ایک واقعہ فتح اندلس کا ہے جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی عیسائیوں پر حکومت رہی اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اُس قوم کی کی نہایت ہی عجیب اور قابل فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور عیسائی قوموں سے بیت المقدس پر ہوئیں۔ میں نے اُن عالم صاحب (یعنی جان ڈیون پورٹ) سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھ دیں اور اُن کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جس کا تصور اُن کی منصفانہ رائے میں ہو سب لکھیں اور چونکہ وہ نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور عبرانی لیٹن، فرنچ، گریک زبان جانتا ہے اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے، صرف انگریزی کتابوں پر اُس کو بھروسا نہیں ہے۔ اس لیے امید ہے کہ جیسی بلا تعصب اُس نے یہ کتاب (یعنی اپالوجی) لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھے گا۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً صرف ہوگا، فی کتاب چار سو روپیہ۔ بس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے احباب سے آٹھ سو روپیہ چندہ کر کے میرے پاس بھیج دیں۔ چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہیے، صرف احباب مخلصین سے چندہ ہو، مثلاً آپ، میر ظہور حسین، زین العابدین، مرزا رحمت اللہ اور احباب سے ملاقات کریں اور زبانی بات چیت کریں اور جو جس کی توفیق ہو اُس سے لے کر جمع کریں۔"

مولوی سید مہدی علیخاں کے لیے ہندوستان میں صاحب کمشنر نے خلعت کے لیے گورنمنٹ میں رپورٹ کی ہے اس کی مبارکباد کے بعد سرسید اُن کو لکھتے ہیں "بھائی مہدی! تم پایونیئر اخبار الہ آباد کے آرٹیکل ترجمہ سنو وہ لکھتا ہے کہ "آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں

کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں، وہ بھی ضعیف ہیں، جلد پنشن لیں گے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آیندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں ہوگا۔ دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔ یہ آرٹکل بہت بڑا ہے کہیں سے دستیاب ہو تو منگا کر بالکل سنو۔ بہرحال جو عزت تم کو خدا دے وہ تمام قوم کی عزت ہے اور مجکو دوہری خوشی ہے ایک قومی دوسری خاص محبت و محبوبیت کی۔ اللہ تعالےٰ ہمیشہ با اقبال رکھے۔

مولوی امداد العلی جو سر سید کے سخت مخالف تھے ان کو ہندوستان میں سٹار آف انڈیا کا خطاب ملنا تجویز ہوا ہے، یہ خبر سنکر سر سید مولوی مہدی علیخاں کو لکھتے ہیں،" بلا تصنع میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت سٹار اوف انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ عین آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ چشم ما روشن و دل ما شاد۔ اُن کا یہ فرمانا کہ سید احمد نے انگریزوں کا جھوٹا کھا کر سٹار اوف انڈیا لیا اور انھوں نے مونچھوں پر تاو دے کر (نہیں نہیں بھول گیا اُن کے مونچھیں[1] نہیں ہیں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر) میرے سر اور آنکھوں پر۔ خدا کرے ایک اُن کو اور ہزاروں مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو۔"

اور کئی خطوں میں مولوی مہدی علیخاں کو اس بات کی تاکید لکھی ہے کہ میرے واپس آنے سے پہلے ایک ایسوسیشن مسلمانوں کی طرز معاشرت

---

[1] مولوی امداد العلی اتباع سنت کے خیال سے مونچھیں نہیں رکھتے تھے یہ اُس کی طرف اشارہ ہے ۱۲۔

کی اصلاح کے لیے قائم کرو اور ایک اخبار اسی مقصد کے لیے ایسوسیئیشن کی طرف سے ایسا اور ایسا نکالو اور چپاں کرو اور بنیں کرو۔ پھر جب اس سے بھی کچھ کامیابی ہوتی نہیں دیکھی تو ممانعت کر دی۔ بعد ممانعت کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اگر بالتخصیص مسلمانوں کی تربیت کے لیے جداگانہ مدرسہ مقرر ہو جائے تو ایک رحمت ہمارے لیے ہے۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ ایسے مدرسے تقرر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں۔ مگر بغیر دس لاکھ روپیہ نقد کے ممکن نہیں ہے۔" اسی طرح سرسید کے تمام خطوں میں جو ولایت سے انھوں نے سید مہدی علیخاں کو لکھے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا وکھڑا رونے کے سوا کوئی مضمون نظر نہیں آتا۔

## مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کی تدبیریں

الغرض سرسید کے تمام منصوبے جو وہ ابتدا سے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے برابر باندھتے رہتے تھے۔ اس راستے پر آکر ختم ہو گئے کہ ہندوستان میں جبکہ قوم کی تعلیم کے لیے ایک محمڈن کالج یا محمڈن یونیورسٹی قائم کیجائے انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سوشل اور پولٹکل حالت درست کرنے کے لیے ایسوسیئیشن قائم کرنی یا کاغذ کی ناؤ سے اس دریا کو عبور کرنا کسی طرح ممکن نہیں بلکہ جب تک ان میں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائے گی ان کی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بیکار ثابت ہوں گی جیسے کسی کھیت میں تخم ریزی سے پہلے آبپاشی کرنا۔

## ولایت میں ہندوستان کے طریقہ پر پمفلٹ لکھنا

انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا اپنی تمام زندگی اس کام پر

وقف کر دیجیے، چنانچہ اس مقصد کے متعلق تمام ابتدائی مدارج جو ولایت میں طے ہوئے ممکن تھے، انھوں نے وہیں طے کر لیے، ایک پمفلٹ جس میں ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراض اور بجائے اُس کے جو طریقہ تعلیم اُن کے نزدیک ہندوستان کی حالت کے مناسب تھا اس کو بیان کیا تھا، لندن میں شایع کیا تاکہ جن کی رائے اس کے خلاف ہو وہ اخبار وں کے ذریعہ سے ظاہر کریں۔

## کیمبرج یونیورسٹی کو دیکھنا

نیز کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر نہایت توجہ سے دیکھا اور اُس کے تمام جزئی و کلی حالات پر غور کی۔

## اشتہار جاری کرنا

پھر مسلمانوں اور نیز گورنمنٹ کی اطلاع کے لیے اردو اور انگریزی میں اشتہار چھپوا کر سید مہدی علیخاں کے پاس اشاعت کی غرض سے ہندوستان میں بھیجے اور ہندوستان میں آکر نہایت باقاعدہ اور دانشمندانہ طریقہ سے اُس منصوبہ کے پورا کرنے پہ کمر باندھی جو اُن کی سالہا سال کی غور و فکر کا آخری نتیجہ تھا۔

## انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

ادھر تو انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی جس کی کوششوں سے آخرکار مدرسۃ العلوم قائم ہو گیا اور ادھر قوم کو جگانے اور تعلیم کی طرف

مائل کرنے کے لیے پرچہ تہذیب الاخلاق نکالا۔

# تہذیب الاخلاق نکالنا

سرسید کے ان دونوں کاموں کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں پر کیا اثر کیا اور مدرسۃ العلوم سے اُن کو اب تک کیا فائدہ پہنچا اور آیندہ کن فائدوں کے پہنچنے کی توقع ہے

# تہذیب الاخلاق کے نتائج

ہندوستان میں دیسی اخباروں اور میگزینوں کی حالت کچھ تو اس وجہ سے کہ اُن میں کوئی ایسا کرشمہ نہیں ہوتا جو پبلک میں کچھ جنبش پیدا کرے اور زیادہ تر ہندوستانیوں کی مردہ دلی کے سبب جیسی کہ اب تک رہی ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ یورپ میں یہی اخبار اور میگزین قوموں کے دلوں کے مالک ہیں اور اُن کے جذبات اور خیالات پر حکومت کرتے ہیں، مگر ہمارے ملک میں سوا اس کے کہ لوگ اُن کو ایک دل کا بہلاوا جانتے ہیں وہ کسی مرض کی دوا نہیں سمجھے جاتے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ تہذیب الاخلاق سے جو ایک سب سے زیادہ افسردہ اور دل مردہ قوم کے بیدار کرنے کے لیے نکالا گیا تھا، کیا امید ہوسکتی تھی ؛ باوجود اس کے جو نتیجے اُس سے پیدا ہوئے وہ نہایت تعجب انگیز ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس وقت یہ پرچہ جاری ہوا اس وقت مسلمانوں پر بسبب اُس انقلاب کے جس نے غدر کے بعد اُن کی حالت دگرگوں کر دی تھی، دو مختلف حالتیں طاری تھیں ایک طرف مذہبی تعصبات اور

مذہبی جوش و خروش، جو ادبار اور تنزل کے زمانہ کے ہتھیار ہیں، نہایت زوروں پر تھے اور تہذیب الاخلاق کا جزو اعظم وہ مضامین تھے جن کو مذہبی تعصبات کے ساتھ وہی نسبت تھی جو آگ کو بارود کے ساتھ ہوتی ہے۔ پس جیسی کہ امید تھی تہذیب الاخلاق نے متعصب مولویوں کے گروہ میں تلاطم پیدا کر دیا اور مذہبی مناظرہ کے ہتھیار جو مدت دراز سے کام میں نہ آنے کے سبب زنگ خوردہ پڑے تھے اُن کو کام میں لانے کا موقع ملا۔

دوسری طرف مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا بھی تھا جن کی افسردہ اور مایوس طبیعتیں اپنے روز افزوں کے تنزل کے سبب ڈوبتی ہوئی ناو کی طرح کوئی ایسا سہارا ڈھونڈ رہی تھیں جس سے اُن کی ڈھارس بندھے لیکن کوئی امید کی صورت نظر نہ آتی۔ تہذیب الاخلاق نے اس گروہ کے دل پر فی الواقع وہ کام کیا جو مرہم زخم پر یا ٹھنڈا پانی پیاسے پر کرتا ہے اس گروہ نے جبکہ وہ اپنے تئیں ناچیز اور ایک نہایت کس مپرس حالت میں سمجھ رہا تھا اور دنیوی ترقیات کے دروازے اپنے چاروں طرف مسدود پاتا تھا، دیکھا کہ ایک ناصح شفیق کمال دلسوزی سے اُن کو نیند سے جگاتا ہے، اُن کی غفلت پر ملامت کرتا ہے، اُن کے اسلاف کے کارنامے سُنا کر اُن کو غیرت دلاتا ہے اور ان کو ترقی کرنے کا گُر بتاتا ہے یہ گروہ اُس کی آواز پر اس طرح دوڑا جیسے کسی بے سری فوج کا کوئی سر دھرا پیدا ہو جائے اور وہ اُس کے اشارہ پر ادھر اُدھر سے سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو جائے غرض کہ موافق اور مخالف دونوں فریق ہمہ تن اُس کی طرف متوجہ ہو گئے دوسرا اس لیے کہ اس کی آواز غور سے سنیں اور پہلا اِس لیے کہ اس کی آواز کسی کو سننے نہ دیں۔ تعجب یہ ہے کہ جس قدر اُس کی موافقت سے قوم کو فائدہ

پہنچا اسی کے قریب قریب اس کی مخالفت نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔

# مدارس اسلامیہ کا قائم ہونا

جوں جوں تہذیب الاخلاق "مدرسۃ العلوم" کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کرتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہو گئے اور برابر ہوتے جاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے شاید تین برس گذرے تھے کہ مولوی سخاوت علی صاحب نے انبہٹہ میں ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ مدرسہ قائم کرنے کے بعد انھوں نے جیسا کہ تہذیب الاخلاق نمبر ا جلد ۲ میں منقول ہے ایک موقع پہ کہا کہ "اگرچہ پہلے بھی ہم کو اپنی قوم کی بھلائی کی فکر تھی مگر کوئی تقاضا کرنے والا اور بار بار جگانے والا نہ تھا۔ اب تہذیب الاخلاق نے یہاں تک چرچہ کیا اور آگاہ کیا جس کے سبب اس قصبہ میں بھی ایک مدرسہ قائم ہو گیا، خدا اس پرچہ تہذیب الاخلاق کو ہمارے لیے ہمیشہ مبارک رکھے" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "ہمارے مدرسہ انبہٹہ اور ضلع کے کل مدارس دیوبند، سہارنپور اور گنگوہہ کو بڑی تسلی ہے کہ یہ سب مدرسے اس مدرسۃ العلوم مسلمانان سے جس کے قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، مستفیض ہوں گے، گویا علیگڑھ ہمارے مدرسوں کے طلبہ کا قصر امید ہے۔ اگر درحقیقت ہم اپنی ترقی کریں گے تو وہ قصر ہمارے ہی لیے ہے پس کس قدر ہم کو اس کے بانیوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

اس قول کے نقل کرنے کے بعد سرسید تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں

کہ "سب سے اخیر مدرسہ جو ہماری تحریروں کے اثر سے قائم ہوا وہ مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ ہے جس میں بشمول دیگر علوم معینہ کے مذہب شیعۂ اثنا عشریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں نے شیعہ اور سُنی دونوں کے دل کو جگا دیا ہے۔ سرسید نے جس مضمون میں یہ حال لکھا ہے وہ ۱۸۸۱ء کا لکھا ہوا ہے جس کو اب چوبیس برس کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس عرصہ میں اور بے شمار مدارس اسلامیہ زیادہ تر اسی خیال سے قائم ہوئے ہیں کہ انگریزی تعلیم جس کی بنیاد مسلمانوں میں تہذیب الاخلاق نے ڈالی ہے اُس کے اثر سے مسلمانوں کو بچایا جائے۔ یہ خیال فی نفسہٖ صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق ہی نے مسلمانوں میں یہ جوش پیدا کیا ہے اور اس طرح سرسید کی چیخ وپکار نے اپنے مخالفوں میں بھی وہ اسپرٹ پیدا کر دی ہے جس پر قومی ترقی کا دار و مدار ہے۔

اگرچہ تمام مدارس اسلامیہ جو ہندوستان میں اب تک قائم ہوئے ہیں ان میں آج تک کوئی تبدیلی زمانہ کے مقتضا کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم ڈگر اب تک نہیں چھوڑی گئی جو اس زمانہ سے ہرگز مناسب نہیں ہے لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ زمانہ جو سب سے بڑا ریفارمر ہے اُن کی اصلاح کیے بغیر نہ رہے گا۔ چنانچہ ندوۃ العلما جس کا پانچواں اجلاس سال گذشتہ میں ہو چکا ہے اس غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلۂ درس کی زمانۂ حال کی ضروریات کے موافق اصلاح کرے۔ اور اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلما کا وجود اُسی نتیجہ کی ایک شان ہے جس کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا۔ وہی کانپور جو تہذیب الاخلاق اور سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں سے

تہذیب الاخلاق کے برخلاف نور الانوار نور الآفاق اور امداد الآفاق اخبار کیا اور کیا مدت دراز تک شائع ہوتے رہے، وہیں سے علما کی یہ جماعت اس غرض سے اٹھی ہے کہ مسلمانوں کی قدیم طرز تعلیم زمانہ حال کی طرز تعلیم کے سانچے میں ڈھالی جائے اور اسی لیے اکثر علما اس سے بدگمان ہو گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجلس سید احمد خاں کے اشارہ سے قائم ہوئی ہے، ہم ایسا تو نہیں سمجھتے لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ "ھذا ایضا من برکات البراھمۃ" بے شک مسلمانوں کی اصلاح کا خیال ان کے دل میں سید کی چیخ پکار نے پیدا کیا ہے۔

# مخالف مولویوں کی رایوں میں انقلاب

اور اگر وہ اپنے ارادوں پر ثابت قدم رہے اور لومۃ لائم سے خوف زدہ نہ ہوئے تو رفتہ رفتہ ضرور وہ اپنے موجودہ خیالات سے آگے بڑھیں گے اور جن باتوں کی درحقیقت قوم کو ضرورت ہے ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔

نواب محسن الملک نے ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں گفتگو کرتے وقت ندوۃ العلما کی روئداد میں سے اس کے بعض ممبروں کی تقریر کا خلاصہ نقل کیا تھا جو تہذیب الاخلاق جدید کی پہلی جلد میں چھپ گیا ہے اس کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ سرسید نے تہذیب الاخلاق کی ابتدائی جلدوں میں علوم جدیدہ کی ضرورت کے متعلق لکھا تھا، یا قرآن کی بعض آیتوں کی تفسیر علوم جدیدہ کے مطابق کی تھی اور جس پر ان کی تکفیر کی جاتی تھی، ہمارے علما کی رایوں پر اس نے کس قدر اثر کیا ہے اور ان کے خیالات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا قدیم علم کلام جو اس زمانہ کے فلاسفہ کے مقابلہ کے لیے مدون ہوا تھا اس

زمانہ میں اس کا مدارس اسلامیہ میں پڑھانا بے فائدہ ہے۔ اب فلاسفۂ زمانہ حال کے مقابلہ کی ضرورت ہے اور اس لیے انگریزی زبان کا سیکھنا اور علوم جدیدہ سے واقف ہونا ضرور ہے۔ پہلے جو ہمارے علما علوم جدیدہ کے پڑھنے سے اس لیے منع کرتے تھے کہ ان سے اصول اسلام میں شبہات پیدا ہوں گے اور الحاد اور دہریت پھیلے گی، اب برخلاف اس کے وہ بھی وہی کہنے لگے ہیں جو ہیں برس سے برابر سر سید کہتے چلے آتے تھے۔ چنانچہ ایک عالم نے ندوۃ العلما میں یہ کہا کہ " مذہب اسلام ایسا ریتے گھر کا نہیں جس پر نئے فلسفہ کا ریلا کچھ اثر کرے اور نہ کبھی پچھلی صدیوں میں کچھ اثر کیا ہے فلسفہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا، پر آسمانی مذہب کبھی نہ بدلے گا۔ اسلام کا کوئی دنیاوی فلسفہ نہیں نہ کوئی ہیئت و ریاضی ہے وہ تو صرف انسان کی اخلاقی و روحانی تعلیم کرنے والا ہے۔ پھر کہا کہ " اسلام نے تاریخ کا بھی بطرز مورخانہ ذمہ نہیں لیا ہے بلکہ انھیں واقعات کا ذکر کیا ہے جو انسان کے لیے عبرت و حیرت پیدا کردیں۔ اگر بطلیموس کی ہیئت ثابت ہو جائے تو کیا اور فیثا غورس کی قائم ہو جائے تو کیا، جزو لایتجزیٰ باطل ہوا تو کیا اور ثابت ہوا تو کیا، خلا کا بطلان ہوا تو کیا اور اثبات ہوا تو کیا، ہمارے بزرگوں نے یونانی فلسفہ کے حملے روکنے کے لیے ایسے ایسے مسائل علم کلام میں داخل کیے تھے جن کو آج کل محض جودتِ طبع کے لیے ہم لوگ پڑھتے ہیں، نہ وہ ہمارا مذہب تھا نہ کتاب و سنت اور مشکوٰۃ نبوت کا فرسودہ تھا۔ سب کچھ بگڑ جائے تو ہماری بلا سے۔"

اگر تہذیب الاخلاق لوگوں کی مخالفت کے خوف سے صلح کل کا طریقہ اختیار کرتا اور جو رکاوٹیں مسلمانوں کی ترقی کی سد راہ تھیں ان کے دور

کرنے پر علی الاعلان کمر نہ باندھتا تو ظاہر ہے کہ اس کی مخالفت بالکل نہ ہوتی اور اس لیے جو عمدہ نتیجے اُس کی مخالفت سے پیدا ہوئے وہ ظہور میں نہ آتے۔ نیز جس قدر اس کی مخالفت کم ہوتی اسی قدر اس کے مددگاروں کا جوش کم ہوتا اور اس لیے وہ مخالفت اور موافق دونوں کے حق میں کوئی معتدبہ نتیجہ پیدا نہ کر سکتا۔ یہی سبب تھا کہ جوں جوں اُس کی مخالفت زیادہ ہوتی گئی اُسی قدر لوگ اس کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے گئے اور اُسی قدر اس کا منتر زیادہ کارگر ہوتا گیا۔

## مسلمانوں کا اسلاف کی ترقیات سُنکر متنبہ ہونا

اُس نے جب کہ مسلمان اپنے اسلاف کے حال سے بے خبر تھے نہایت مؤثر طریقوں کے ساتھ اُن کو ان کے بزرگوں کی علمی اور عقلی فتوحات سے آگاہ کیا تاکہ اُن میں وہ حمیت پیدا ہو جو اولاد کے دل میں اپنے آباؤ اجداد کی بڑائی سُننے سے پیدا ہونی چاہیے اور وہ اپنے موجودہ تنزل کا مقابلہ زمانۂ سلف کی ترقیات کے ساتھ کر کے خود ترقی کی طرف مائل ہوں۔ اگرچہ تہذیب الاخلاق کو اس مقصد میں پوری کامیابی ہوئی کہ اُس نے مسلمانوں میں فخر و مباہات کا جوش توقع سے زیادہ پیدا کر دیا لیکن ان نیچرل موانع کے سبب جو گری ہوئی قوموں کی مدت تک اُٹھنے نہیں دیتے، ابھی تک اُن میں وہ حرکت پیدا نہیں ہوئی جو سلف کے کارنامے سُنکر ایک غیور قوم میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کو پستی و تنزل کے ننگ و عار سے نکلنے پر آمادہ کر دیتی ہے تاہم جس قدر بیس بائیس کے عرصہ میں کم و بیش ترقی کا خیال ہندوستان کے مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے اُس کو اسی تہذیب

الاخلاق کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے، ورنہ مسلمانوں نے زمانہ کی مخالفت پر جس شد و مد
کے ساتھ کمر باندھی تھی وہ اُس وقت تک کہ زمانہ اُن کو بیپا نہ ڈالے، ہرگز کھلنے
والی نہ تھی۔ تہذیب الاخلاق جس کوٹھے پر چڑھنے کی تاکید کرتا تھا صرف
اُس کے بتانے ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا زینہ بھی اپنے ساتھ
رکھتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے لوگوں کو ترقی کی طرف بلاتا تھا اور دوسرے
ہاتھ سے مدرستہ العلوم کی تصویر اُن کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اسی لیے اُس
کی کوششیں بالکل اکارت نہیں گئیں۔

## مسلمانوں میں عیسائی مورخوں کے الزامات رفع کرنے کا خیال پیدا ہونا

تہذیب الاخلاق ہی نے لوگوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ یورپ کے مصنفوں
نے جو غلطیاں اسلام کی حقیقت ظاہر کرنے یا اسلام کی تاریخ لکھنے میں کی ہیں
اُن غلطیوں کو رفع کیا جائے اور ان کا منشا ظاہر کیا جائے۔ اگرچہ سرسید اپنی
متعدد تصنیفات میں جیسا کہ اس کتاب میں جابجا ظاہر کیا گیا ہے، اس موضوع
پر بہت کچھ لکھ چکے تھے اور آیندہ مصنفوں کے لیے یہ رستہ صاف کر چکے
تھے مگر اُن کی اکثر تحریرات عام طور پہ شائع نہیں ہوئی تھیں۔ تہذیب الاخلاق
ہی کی تحریک سے لائق لائق مسلمان اس کام پر کھڑے ہوئے بہت سے
مضامین تہذیب الاخلاق میں اسی موضوع پر لکھے گئے اور ان کے سوا عمدہ
عمدہ متعدد کتابیں انگریزی اور اردو میں علیحدہ شائع کی گئیں۔ اس تحریک کا سب
سے عمدہ نتیجہ مسلمانوں کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان

جن سے ہم خود واقف ہیں یا جن کا حال معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے۔ اُن اعتراضوں کو دیکھ کر جو انگریزی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں پر وارد کیے گئے ہیں اسلام سے برگشتہ ہو چلے تھے، کوئی عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اور کوئی سرے سے مذہب ہی کو لغو سمجھنے لگا تھا، مگر تہذیب الاخلاق کے مضامین دیکھ کر جو شبہات اسلام کی طرف سے اُن کے ذہن میں خطور کرتے تھے وہ یک قلم زائل ہو گئے اور اُن کے دل کا وعدغہ بالکل جاتا رہا۔ اب وہ اسلام پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور اپنے اُن پراگندہ خیالات سے نادم ہیں

## تعصب تقلید، توکل، قناعت اور تقدیر کی مزاحمتوں کا کم ہونا

تہذیب الاخلاق نے تعصبات کو بہت کم کر دیا، تقلید کی بندشیں ڈھیلی کر دیں، توکل، قناعت اور تقدیر کے جو غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے تھے اور جس غلطی نے اُن کو نکما اور کاہل اور جمادات کی طرح بے حس و حرکت کر دیا تھا اُس سے اُن کو مطلع کیا اور صرف مطلع ہی نہیں کیا بلکہ لاکھوں کے خیالات بدل دیے اور تدبیر و کوشش کی طرف اُن کا رخ پھیر دیا۔

## سیلف ہیلپ کا خیال پیدا ہونا

اسی پرچہ نے اُنکو اپنے دست و بازو پر بھروسا کرنا اور گورنمنٹ کا سہارا چھوڑنا سکھایا اور سیلف ہیلپ کا اصول جس کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی، اُن کے ذہن نشین کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ قومی کاموں میں ایک پیسہ

صرف کرنا نہیں جانتے تھے وہ سیکڑوں اور ہزاروں صرف کرنے لگے۔ کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ قومی کاموں میں چندہ دینا کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف تہذیب الاخلاق نے یا دوسرے لفظوں میں سید احمد خاں کی تحریروں اور اسپیچوں نے سکھایا ہے اور اس بات کا بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ مسلمان جو روپیہ دو روپیہ مہینے سے زیادہ اولاد کی تعلیم پر خرچ کرنا نہیں جانتے تھے وہ اسی شخص کی چیخ پکار سے اب پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپیہ مہینہ بے دریغ اپنے بچوں کی تعلیم میں خرچ کرتے ہیں اور ولایت کی تعلیم کے لیے ایک ایک لڑکے پر بیس بیس تیس تیس ہزار صرف کر دیتے ہیں۔ سرسید کے مخالف جو ہمیشہ مستثنے نتیجوں کو اعتراض کا ذریعہ گردانتے ہیں اس مقام پر ضرور مسلمان لڑکوں کی وہ مثالیں پیش کریں گے جن کو ولایت جانے سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا ہے مگر ایسے مستثنیات سے تو خدا کے کام بھی خالی نہیں پائے جاتے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ہم کو اس باب میں ان شاذ و نادر مثالوں پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سرسید نے مسلمانوں کے خیالات میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ جو روپیہ وہ پہلے اولاد کی بیاہ شادیوں کی بیہودہ رسموں میں خرچ کرنے کے عادی تھے یا جس روپیہ سے جاہل اور نالائق اولاد کے لیے جائیداد خرید کر اُن کی عیاشی اور بدچلنی یا کاہلی اور سستی کا سامان مہیا کر جاتے تھے، اب وہ روپیہ اُن کی لیاقت اور اصلی عزت اور اقتدار بڑھانے میں صرف کرنا سیکھ گئے ہیں۔

تہذیب الاخلاق ہی نے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کو مدت دراز کے بعد قومیت کے معنی یاد دلائے ہیں۔

# قومیت کا خیال پیدا ہونا

قومیت جو در حقیقت ایک لفظ اسلامی اخوت کا مترادف ہے اس کے مفہوم سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بالکل ذہول ہو گیا تھا۔ اُن میں بھی مثل ہندوؤں کے ذاتوں کی تفریق پیدا ہو گئی تھی اور ایک ذات کو دوسری ذات کے ساتھ قومی حیثیت سے کچھ تعلق نہ سمجھا جاتا تھا۔ پٹھانوں کو یہ استحقاق نہ تھا کہ وہ مغلوں کی فتوحات پر فخر کر سکیں اور سادات اس بات کا حق نہیں رکھتے تھے کہ بنی امیہ یا بنی عباس کے کارناموں پر نازاں ہوں۔ اس کے مذہبی فرقوں کے سوا اختلاف نے ان میں ایک دوسری طرح کا تفرقہ ڈال دیا تھا جس کے سبب سے وہ رابطہ جو تمام اہل قبلہ میں بسبب اتحاد اسلامی کے متحقق ہونا چاہیے باقی نہ رہا تھا۔ تہذیب الاخلاق نے ان دونوں تفرقوں کے دور کرنے کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں میں کم سے کم یہ خیال ضرور پیدا کر دیا کہ ذاتوں کے تفرقہ یا مذہبی حریفوں کے اختلاف سے قومی اتحاد میں کچھ فرق نہیں آتا اور ہمارے نزدیک یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم و قومیت و قومی ہمدردی اور قومی عزت کے الفاظ جن وسیع معنوں میں کہ اب ہندوستان میں عام طور پر بولے جاتے ہیں یہ درحقیقت سرسید ہی کی تحریروں نے جو اول سوسائٹی اخبار میں اور اس کے بعد تہذیب الاخلاق میں شایع ہوئیں لوگوں کو بولنے سکھائے ہیں۔

# اُردو لٹریچر میں انقلاب پیدا ہونا

اُردو لٹریچر کو بھی اس پرچہ سے کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا. یہ پرچہ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہوچکا ہے. چھبیس برس کے عرصہ میں تین دفعہ مختلف وقتوں میں جاری ہوا مگر سب سے زیادہ عرصہ تک صرف پہلی دفعہ یعنی سات برس برابر نکلتا رہا. لٹریری خوبی کے لحاظ سے جس قدر عمدہ مضامین ان سات برس کے پرچوں میں شایع ہوئے پھر ویسے نہیں ہوئے اور جو نتایج کہ ہم نے اوپر بیان کیے ہیں وہ زیادہ تر انھیں سات برس کے پرچوں سے علاقہ رکھتے ہیں۔

اس پرچہ کو جاری ہوئے صرف تین برس کا عرصہ گذرا تھا کہ سرسید کے ایک انگریز دوست نے جیسا کہ جلد ۲ نمبر ا میں مذکور ہے ان کو لکھا تھا کہ "تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کردیا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہوسکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے۔"

# مذہبی لٹریچر میں آزادی کا پیدا ہونا

یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ سوشل اخلاقی اور مذہبی مضامین جس سادگی اور لطافت اور شایستگی کے ساتھ اس پرچہ میں لکھے گئے ویسے کبھی کسی اُردو زبان کے پرچہ میں نہیں لکھے گئے۔

اسی پرچہ نے مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں جو صدیوں سے بند پانی کی طرح بےحس و حرکت چلا آتا تھا دفعۃً تموج پیدا کردیا۔ تہذیب الاخلاق

سے پہلے ہندوستان میں جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا گیا تھا اُس میں سرسید کے سوا بہت ہی کم لوگوں کی تحریروں میں آزادی کا عنصر پایا جاتا تھا۔ تعصب اور تقلید نے اُن جنبلوں کی سوئیں بالکل بند کردی تھیں۔ علمائے سلف کے اقوال اور اُن کی رایوں کو نقل کر دینا ہی تصنیف و تالیف کی معراج تھی۔

## مذہبی مناظرہ کے طریقہ کی اصلاح

غیر مقلد جو بہت آزادی کا دم بھرتے تھے اُن کی جولانگاہ بھی صرف چند مسائل فقہیہ متعلق بہ عبادات تھے اور بس۔ پادریوں کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کرنے کا طریقہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جو اعتراضات وہ مذہب اسلام پر قرآن اور حدیث کے حوالوں سے کرتے تھے اُسی قسم کے اعتراضات عیسائی مذہب پر توریت وانجیل کے حوالوں سے کیے جاتے تھے۔ یورپین سویلیزیشن اور یوروپین سائنس کے حملے جو اسلام پر ہو رہے تھے اول تو اُن سے مسلمان عالم محض بے خبر تھے اور اگر اُن کو خبر بھی ہوتی تو تقلید کی بدولت اُن میں یہ قابلیت باقی نہ رہی تھی کہ ان نئے حملوں کو دفع کرنے کے لیے نئے ہتھیار ایجاد کریں۔ مناظرہ کا طریقہ اس قدر نامہذب اور خراب ہو گیا تھا کہ کتابوں کے نام لٹھ، جوت آرہ، درہ، قبقاب اور کنٹاپ رکھے جاتے تھے۔ تہذیب الاخلاق نے جہاں تک کہ اُس سے ہو سکا تعصب کی جڑ کاٹی، تقلید کی بندشیں توڑیں، مذہبی تحریروں میں آزادی کی روح پھونکی۔ مذہبی حمایت کا فرسودہ طریقہ جو اس زمانے میں کچھ بکار آمد نہ تھا اُس کی جگہ دوسرا طریقہ جو زمانے کے مناسب حال تھا جاری کیا۔ مناظرہ کے ناپسندیدہ طریقہ کی اصلاح کی اور اپنے طرز بیان سے اس طریقہ کی ایک مثال قائم کی جس کی قرآن نے۔

ہدایت کی تھی کہ "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنْ"۔

## اردو شاعری میں انقلاب

اردو شاعری جس میں دو سو برس سے ایک ہی قسم کے خیالات برابر دُہرائے جا رہے تھے اُس نے بھی زیادہ تر اسی پرچہ کی تحریک سے کروٹ بدلی۔ نئے نئے میدانوں میں شعرا قدم رکھنے لگے۔ مبالغہ اور جھوٹ کی جگہ حقائق و واقعات کے خاکے کھینچے لگے اور شاعری بجائے اس کے کہ محض ایک دل لگی کی چیز سمجھی جاتی تھی ایک کام کی چیز بننے لگی۔

## محمڈن کالج کا ہونا

سب سے عمدہ نتیجہ جو اس پرچہ کے اجرا سے مترتب ہوا اور جس کے لیے درحقیقت یہ پرچہ جاری کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمان جو قدیم سے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کرتے چلے آتے تھے آہستہ آہستہ اُن کی جھجک نکلنی شروع ہوئی یہانتک کہ لاکھوں مسلمان ہندوستان میں اب ایسے موجود ہیں جو انگریزی تعلیم کو اپنی اولاد کے حق میں نہایت ضروری جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بغیر اس کے ملک میں عزت سے رہنا ناممکن ہے۔

## محمڈن کالج کے نتائج

سب سے بڑی ملکی اور قومی خدمت جو سر سیّد سے بن آئی اور جس کا احسان بظاہر صرف مسلمانوں کی قوم پر مگر درحقیقت ہندوستان کی تمام اقوام پر ہے، وہ مدرسۃ العلوم کا قائم کرنا ہے۔ ہندوستان کی ایک ایسی قوم کا جس کی تعداد

قریب چھ کروڑ کے ہے تعلیم سے محروم رہنا تمام ملک کے لیے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ایسا ہی مضر تھا جیسا کہ ایک مخصوص عضو کا ماؤف ہونا

## ہندوؤں میں تحریک کا پیدا ہونا

انسان کے تمام اعضائے رئیسہ کیلئے خطرناک ہوتا ہے اس کے سوا صرف مدرسۃ العلوم کی ریس سے شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں قومی تعلیم کا جوش حد سے زیادہ پیدا ہو گیا اور انھوں نے قومی چندہ سے متعدد کالج کھول لیے۔ پھر خود مدرسۃ العلوم میں کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا گیا جس کی رو سے وہ مسلمانوں کے لیے مخصوص سمجھا جائے اس میں ابتدا سے آج تک ہندو، مسلمان، عیسائی، بنگالی، پارسی سب قوموں کے طالب علم برابر پڑھتے رہے ہیں چنانچہ ۱۸۷۵ء سے اب تک جس قدر ہندو طالب علم محمڈن کالج اور اس کی لا کلاس سے مختلف امتحانوں میں کامیاب ہوئے ان کی تعداد یہ ہے گریجویٹ ۲۲، انڈر گریجویٹ ۷، ۶ انٹرینس ۸۷، ال ال بی ۸ وکالت ہائی کورٹ ۲ وکالت ضلع ۵ میزان ۹۲) اور متعدد ہندو گریجویٹ اسی کالج کے بیرسٹری یا میڈیسن میں ولایت جاکر کامیاب ہو چکے ہیں بس یہ کہنا کچھ بناوٹ میں داخل نہیں ہے کہ محمڈن کالج نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام ہندوستان کی بھلائی کے لیے قائم کیا گیا ہے اور اس سے غیر قوموں کو بھی برابر فائدہ پہنچتا رہا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سرسید کا بڑا مقصد اس کالج کے قائم کرنے سے یہی تھا

## مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے موانع

کہ کسی طرح مسلمانوں کی حالت درست ہو اور وہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ

ہوں مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطع نظر اُن سخت مخالفتوں کے جو مدرسۃ العلوم قائم کرتے وقت پیش آئیں اور جن کا حال ہم آیندہ عنوان میں لکھیں گے مسلمان پہلے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ ابتدا سے ہندو اور مسلمانوں کے خیالات میں جو تفاوت انگریزی تعلیم کے متعلق تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ ۱۸۲۳ء میں جبکہ گورنمنٹ نے کلکتہ میں ہندوؤں کے لیے ایک سنسکرت کالج قائم کیا تو ہندوؤں نے ایک عرضداشت اس مضمون کی گذرانی کہ ہم کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہمارے لیے سنسکرت کی تعلیم کا سامان مہیا کرے بلکہ اس کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو انگریزی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرے۔ برخلاف اس کے ۱۸۳۵ء میں جب کہ واقعۂ مذکورہ پر گیارہ برس گزر چکے تھے اور ہندوؤں کا شوق دوبالا ہوگیا تھا کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انھوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔

قطع نظر مذہبی خیالات کے مسلمان زیادہ تر اس وجہ سے بھی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے کہ ابتدائے اشاعت اسلام سے وہ جس ملک میں گئے اور جہاں جاکر رہے مستثنےٰ صورتوں کے سوا کبھی اُن کو غیر ملک اور غیر قوم کی زبان سیکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی وہ جہاں جاتے تھے اپنی زبان اور اپنا علم ادب اپنے ساتھ لیجاتے تھے جس طرح اسپین میں جاکر انھوں نے اسپینش زبان یا ایران میں ژند زبان نہیں سیکھی، اسی طرح

ہندوستان میں آکر اس ملک کی زبانوں کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی اور اس لیے غیر زبانوں کے سیکھنے کی فی الواقع اُن میں قابلیت نہ رہی تھی. برخلاف اس کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں غیر زبان سیکھنے کا ملکہ اپنے میں بخوبی پیدا کر لیا تھا جو قومیں ملازمت پیشہ تھیں وہ اپنی اولاد کو کم سے کم فارسی زبان سکھانا نہایت ضروری جانتی تھیں اور اکثر شوقین لوگ فارسی کی تکمیل کے لیے عربی بھی سیکھتے تھے.

پس مسلمانوں کو جس قدر کہ مذہبی خیالات انگریزی تعلیم سے مانع تھے اُس سے زیادہ اُن کی طبعی ناسناسبت جو تیرہ سو برس سے اُن میں متوارث چلی آتی تھی ایک اجنبی زبان کے سیکھنے کی اُن کو اجازت نہ دیتی تھی. مدارس انگریزی میں انگریزی زبان کے سوا اور بھی بعض سبجکٹ ایسے تھے جن سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کچھ مناسبت نہ رہی تھی. جغرافیہ جس میں اُن کے اسلاف نے اگلے زمانہ میں بے انتہا ترقی کی تھی اب وہ اُس کو محض لغو جاننے لگے تھے تاریخ کا حال بھی اسی کے قریب قریب تھا. ریاضی سے فی الواقع مسلمانوں کو کچھ لگاؤ باقی نہ رہا تھا. مسلمانوں کے ذہن میں عموماً یہ بات تہ نشین تھی اور اب تک ہے کہ انگریزی زبان میں منطق اور حکمت و فلسفہ بالکل نہیں ہے اور دنیا میں عربی کے سوا کوئی علمی زبان نہیں ہے.

اس کے سوا اور بہت سے موانع تھے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں. اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت سرسید نے محمڈن کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا اس وقت مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کیا حالت ہو گی! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء یعنی اس وقت سے جبکہ کلکتہ، مدارس اور بمبئی یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں،

# ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی تعلیم کی کیا حالت تھی،

۱۸۷۵ء یعنی اُس وقت تک کہ علیگڑھ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا، تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوئیٹس کی تعداد صرف بیس تک پہنچی تھی جن میں ۱۷ بی اے اور ۳ ایم اے تھے حالانکہ اُس وقت تک ہندو گریجوئیٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہنچ گئی تھی جن میں ۷۱۵ بی اے اور ۱۳۱ ایم اے تھے نیز جو نفرت یا نامناسبت اور اجنبیت مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے چلی آتی تھی اُس بات کا اندازہ بھی اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ اگر بالفرض اُن کو تعلیم کا خیال پیدا بھی ہو جاتا تو بھی اُن میں انگریزی تعلیم کے ساتھ دلبستگی اور مناسبت پیدا کرنے کے لیے کس قدر عرصہ درکار تھا؛ اور وہ کتنی مدت میں اس قابل ہو سکتے تھے کہ اپنی ہموطن قوموں کے ساتھ جو چالیس برس پہلے سے انگریزی تعلیم پر دلدادہ اور اُس کے حاصل کرنے میں سرگرم تھیں تعلیمی دوڑ میں شریک ہوں۔

# علیگڑھ کالج نے ۱۹ سال میں کتنے مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دی

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد جو نتائج نہایت قلیل عرصہ میں علیگڑھ محمڈن کالج سے ظہور میں آئے اُنکو نہایت غنیمت سمجھنا چاہیے علیگڑھ محمڈن اسکول ۱۸۷۵ء میں اور محمڈن کالج ۱۸۷۸ء میں کھولا گیا تھا اور کالج کے نتائج ۱۸۸۰ء سے نکلنے شروع ہوئے اُس وقت سے ۱۸۹۸ء

تک کہ جس کو ۱۹ برس سے زیادہ مدت نہیں گذری اس نے صرف اپنے مسلمان طلبہ میں سے ۲۴۶ گریجویٹ اور ۲۷۲ انڈر گریجویٹ پیدا کیے ہیں۔

جو طالب علم کہ محمڈن کالج کی لا کلاس میں لکچر سنتے ہیں وہ ۱۸۹۰ء سے قانونی امتحانوں میں شریک ہونے لگے ہیں اس وقت سے اب تک صرف مسلمانوں میں سے ۱۲ ال ال بی کے امتحان میں اور ۵ وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

اور اگر اس سخت گیری پر جو آٹھ سات برس سے قانونی امتحانوں میں ہونے لگی ہے۔ نظر کی جائے تو اس قلیل عرصہ میں مذکورۂ بالا نتائج خاص کر مسلمانوں کے حق میں بہت غنیمت ہیں۔

## محمڈن کالج کا اثر ملک کے دیگر حصوں پر

مگر محمڈن کالج کے فوائد کو صرف اُن نتائج ہی میں منحصر نہ سمجھنا چاہئے جو خاصکر اُس کے طالب علموں نے یونیورسٹی کے مذکورۂ بالا امتحانوں میں حاصل کیے ہیں بلکہ اُس کا اثر ہندوستان کے تمام حصوں اور تمام صوبوں تک پہنچا ہے اور اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ لفٹننٹ گورنر بنگال نے ۱۸۹۶ء کے آغاز میں ایک موقع پر مسلمانان بنگالہ کی تعلیم کے متعلق یہ کہا تھا کہ "۱۸۸۱ء میں جبکہ میں نے بنگال کو چھوڑا تھا تو صوبۂ مذکور کے تمام مدرسوں اور کالجوں میں ایک لاکھ پچاسی ہزار مسلمان طالب علم تھے اور اپنے واپس آنے پر مجھکو معلوم ہوا ہے کہ اس تعداد کی نوبت قریب چار لاکھ نوے ہزار کے پہنچ گئی ہے" چونکہ ۱۸۸۱ء ہی سے زیادہ محمڈن کالج کا چرچا ہندوستان میں ہوا ہے اور صوبۂ بنگال

میں ظاہرا کوئی زبردست تحریک مسلمانوں کی تعلیم کیلئے نہیں ہوئی اسلئے سوا اس کے تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور محمڈن کالج کی شہرت سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے اور کوئی بات خیال میں نہیں آتی۔

نیز اسی کالج کی ریس اور اسی کے بانی کی چیخ پکار سے متعدد[ڈ] کالج اور بے شمار اسکول خاص مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے لیے ہندوستان میں کھول لیے جس کا ایک صریح نتیجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۸ء سے لیکر اس وقت تک کہ محمڈن کالج کے طالب علم یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے اور اس کی شہرت سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا ولولہ پیدا ہوا۔ یعنی ۱۸۸۱ء تک جو کہ چوبیس برس کا زمانہ ہوتا ہے تمام ہندوستان میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف ۴۲ تک پہنچی تھی مگر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء تک یعنی صرف بارہ سال میں تمام ہندوستان کے مسلمان گریجویٹس کی تعداد ۴۲ سے بڑھ کر ۲۲۹ تک پہنچ گئی اور ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۶ء تک یعنی تین سال میں صرف الہ آباد یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۵ مسلمان بی اے اور ایم اے کے امتحانوں میں کامیاب ہوئے اور اگر بدقسمتی سے وہ مشکلات جو گذشتہ دس برس سے طالب علموں کو پیش آ رہی ہیں اور جنھوں نے خاص کر مسلمانوں کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا ہے پیش نہ آتیں تو اور بھی زیادہ عمدہ اور بہتر نتیجے ظہور میں آتے

# تعلیم کی ابتدائی مشکلات

اس کے سوا جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے

---

سلہ جیسے لاہور، امرت سر اور کراچی کے محمڈن کالج یا حیدرآباد اور بہاولپور کے اسسٹنٹ کالج ۱۲

کہ قومی تعلیم کی چال ابتدا میں نہایت سست اور دھیمی ہوتی ہے۔ کم عمر لڑکے جن سے قومی تعلیم کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ باوجودیکہ ان کو حد سے زیادہ ترغیب اور اشتعال کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے دائیں بائیں کوئی سامان ایسا نہیں دیکھتے جس سے ان کو تعلیم میں کچھ مدد مل سکے، یا اس کی طرف کافی توجہ ہو۔ نہ تو قومی سوسائٹی میں ان باتوں کا چرچا ہوتا ہے جن سے تعلیم کا شوق اور اس کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو۔ اور نہ خاندان کے چھوٹے بڑوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے جس سے مدرسہ کی پڑھائی میں کسی قسم کی اعانت کی توقع ہو۔ برخلاف اس کے جب قوم میں تعلیم کی بنیاد پڑ جاتی ہے تو ان کو گلی کوچہ اور گھر کے در و دیوار سے یہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ اگر مسلمانوں میں تعلیم کا شوق اسی نسبت سے آیندہ بھی بڑھتا رہا جیسا کہ گذشتہ ۲۳ برس میں بڑھتا رہا ہے تو ان کی ترقی کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جائے گی۔

## ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان میں پیدا ہونا

ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں در حقیقت اس وقت سے پیدا ہوا ہے جبکہ سرسید اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر انگلستان گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہندوستان سے کوئی مسلمان اور شمالی ہند سے کوئی ہندو یا مسلمان ولایت میں تعلیم کے لیے نہیں گیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس سفر کی جرأت زیادہ تر اس اسکالرشپ کے سہارے سے ہوئی تھی جو سید محمود کی

تعلیم کے لیے گورنمنٹ نے عنایت کیا تھا لیکن چونکہ وہ خود بھی مع اپنے بڑے بیٹے کے ۱۷ مہینے ولایت میں ٹھیرے تھے اور سید محمود کی تعلیم ختم ہونے تک ایک خدمت گار برابر پانچ برس ان کے ساتھ رہا تھا اور بعض ایسے اخراجات بھی جو اوروں کو اٹھانے نہیں پڑتے تھے سرسید کو برداشت کرنے پڑے تھے۔ اس لیے علاوہ دس ہزار روپیہ کے جو گورنمنٹ نے عطا کیا تھا پچاس ہزار روپیہ اُن کو اپنی جایداد اور کتابیں بیچ کر اور رخصت کے زمانے کی تنخواہ کٹوا کر گویا اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑا۔ اگرچہ سرسید کو اُس سے بہت بڑی زیر باری ہوئی مگر ہندوستان کے لیے آیندہ ولایت جانے کی راہ کھُل گئی۔ سرسید نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بیٹے کو ولایت میں تعلیم دلا کر ملک کے لیے ایک مثال قائم کر دی بلکہ جیسا پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے انھوں نے متعدد تدبیریں ہندوستانیوں کے اور خاصکر مسلمانوں کے ولایت بھیجنے کے لیے کیں جن کا نتیجہ ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کلکتہ بمبئی اور مدراس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں کوئی سال ایسا نہیں جاتا جس میں کچھ ہندو یا مسلمان طالب علم تعلیم کے لیے ولایت نہ جاتے ہوں ایک معتدبہ تعداد ولایت کے تعلیم یافتہ بیرسٹروں اور سول سرونٹس وغیرہ کی جن کا پہلے بنگالیوں اور پارسیوں کے سوا کسی قوم میں وجود نہ تھا، اکثر قوموں میں پیدا ہو گئی ہے جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جیسا کہ نواب محسن الملک نے اپنے لاہور کے لکچر میں بیان کیا ہے اس وقت صرف محمڈن کالج کے ۲۱ طالب علم بیرسٹرایٹ لا ہیں اور ۴ ولایت میں ڈاکٹری کی تعلیم پا رہے ہیں۔

اس حالت کا مقابلہ جب شمالی ہندوستان کی اس حالت سے کیا جاتا ہے جبکہ سرسید نے پہلی ہی بار ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا اور جبکہ

ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں مذہبی خیالات کے سبب یورپ جانے کو عیسائی ہو جانے سے کم نہیں سمجھتے تھے اور غیر ملکوں کے سفر کے بالکل عادی نہ تھے تو دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں شک کرنے کی ظاہرا کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جس طرح مسلمانوں میں ولایت کی تعلیم کا خیال صرف سرسیّد کی تحریک سے پیدا ہوا ہے اسی طرح شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ خیال اسی شخص کی بدولت پھیلا ہے

باوجودیکہ ہندو سنہ ۲۲ سے انگریزی تعلیم میں مصروف تھے مگر وہ ایسے چپ چاپ یہ رستہ طے کر رہے تھے جیسے تناخور آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ پچاس برس گذر گئے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی مگر سرسید کی چیخ پکار صرف مسلمانوں ہی کو جگانے والی نہ تھی بلکہ اُس نے شمالی ہندوستان کے دونوں صوبوں میں اس سرے سے اس سرے تک تعلیم کا غُل ڈال دیا۔ اگرچہ ہندوستان کی تعلیم پر ہندو پہلے ہی سے متوجہ تھے اور سرسید کی تحریک نے سوا اس کے کہ اُن کی ترقی کی رفتار کسی قدر تیز کر دی کوئی بڑا نمایاں اثر اُس پر نہیں کیا، لیکن اس میں شک نہیں کہ ولایت کی تعلیم کا خیال اُن میں صرف مسلمانوں کی ریس اور سرسید کے شور وغل سے پیدا ہوا۔ مذہبی رکاوٹیں ہمارے ملک کے ہندوؤں میں اور ہندوؤں سے بہت زیادہ تھیں، چنانچہ بعض شریف ہندو اس جرم میں کہ انھوں نے ولایت میں جاکر تعلیم پائی، برادری سے خارج کر دیے گئے لیکن چونکہ تعلیم نے انکو ذکی الحس کر دیا تھا اور زمانہ کا ساتھ نہ دینے کے مضر نتائج سے وہ خوب واقف تھے، اس لیے انھوں نے وہ تمام قیدیں جو

ترقی کے مانع تھیں توڑ ڈالیں اور مسلمانوں کو ولایت کی تعلیم میں بھی اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

# سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد کا بڑھنا

سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت میں جس قدر ترقی مسلمانوں نے محمڈن کالج کی تعلیم کے ذریعہ سے بواسطہ یا بلاواسطہ کی ہے اُس کا اندازہ اس طرح پر کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کالج کے قائم ہونے سے پہلے مسلمان ملازموں کی تعداد کیا تھی اور اس کے قائم ہونے کے بعد کہاں تک پہنچ گئی! یا یہ کہ ہندوستان کی دیگر قوموں کے ساتھ صیغۂ ملازمت میں ان کو پہلے کیا نسبت تھی اور اب کیا ہے! بلکہ ہمارے نزدیک اُس کا اندازہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اگر محمڈن کالج قائم نہ ہوتا اور سرسید کی تحریک سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو تعلیم کا خیال پیدا نہ ہو جاتا تو آج کے مسلمان سرکاری محکموں یا ہندوستانی ریاستوں میں ملازم پائے جاتے!

سرکاری ملازمت کی جو شرطیں گذشتہ بیس سال میں وقتاً فوقتاً قرار پاتی رہی ہیں اور انھیں کے قریب قریب ہندوستانی ریاستوں میں بھی قیدیں لگتی جاتی ہیں اُن پر لحاظ کرتے سے اس بات میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ اگر اب تک مسلمان اُسی خواب غفلت میں رہتے اور انگریزی تعلیم سے جس قدر حصہ کہ انھوں نے اس عرصہ میں لیا ہے وہ حصہ نہ لیتے تو آج سرکاری دفتر اور محکمے اُن سے گویا بالکل خالی پاتے اور ہندوستانی ریاستوں میں بھی وہ شاید خال خال ہی نظر آتے۔

ذمہ داری کے عہدے جو پہلے ہندوستانیوں کو ادنی درجہ کی تعلیم یا سعی

سفارش وغیرہ کے ذریعہ سے ملجاتے تھے۔ اب سوا اس کے کہ گورنمنٹ اپنے خاص اختیارات سے کسی مستثنے آدمی کو دیدے، گریجویٹس کے سوا کسی کو نہیں مل سکتے کو مپیٹشن کے قاعدے نے ایجوکیٹیڈ کلاس کے سوا ہر درجہ کے آدمیوں کو عمدہ خدمات سے گویا بالکل محروم کر دیا ہے اور جس قدر ملازمت کے امیدواروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر ملازمت کی شرطیں روز بروز زیادہ سخت ہوتی جاتی ہیں۔ سیکڑوں مڈل پاس اور انٹرنس پاس آٹھ آٹھ دس دس روپیہ ماہوار کی نوکری ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور مشکل سے فیصدی دس کامیاب ہوتے ہیں۔

۱۸۸۰ء میں جبکہ محمڈن کالج کی عمر دو تین برس سے زیادہ کی نہ تھی سر سید نے جو متعدد مضامین پنجاب یونیورسٹی اور مشرقی تعلیم کے خلاف لکھے تھے اُن میں ایک جگہ لکھتے ہیں "جب صدر عدالت دیوانی ہائیکورٹ نہیں ہوئی تھی مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذی علم و لائق شخص وکالت کرتے تھے اور ایسے کامیاب تھے کہ زمانہ ان پر رشک کرتا تھا دفعتہً ۱۸۶۶ء میں صدر عدالت دیوانی ہائی کورٹ ہوگئی اور یورپین زبان نے اپنا راج کیا۔ وہ بار آور درخت علوم مشرقی اور مشرقی زبان کے جن کی پھننگ آسمان تک پہنچی تھی اس طرح کملا کر زمین پر گر پڑے جیسے کوئی نیا نازک پودا پالے کے صدمے سے جھلس جائے اب ہائیکورٹ میں جاکر علمائے علوم مشرقی کا حال دیکھو کہ ان پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کر سکتے ہیں، نہ ملک کا نہ قوم کا۔ تمام عہدوں میں سے مشرقی علوم و مشرقی زبان خارج ہوگئی ہے۔ دیوانی عہدوں میں جن کی بنیاد وکالت کے امتحان پر قائم ہوتی ہے مشرقی علوم و مشرقی زبان کی قدر و پرسش نہیں رہی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ ہائی کورٹ کی وکالت کے

امیدواروں کی فہرست میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایک لائق تحصیلدار عالم علوم مشرقی کو امیدواران ڈپٹی کلکٹری کی فہرست میں اس لیے جگہ نہیں مل سکی کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔"

سرسید کا یہ مضمون ۱۸۹۱ء کا لکھا ہوا ہے جس کو سترہ برس کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اور جس کے بعد سرکاری عہدوں کی شرطیں آج تک برابر سخت ہوتی چلی آئی ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں جو تھوڑی بہت ترقی مسلمانوں نے انگریزی تعلیم میں کی ہے اگر اس کا اب تک کچھ ظہور نہ ہوتا تو سرکاری معزز عہدوں پر شاذ و نادر ہی کسی مسلمان کی صورت نظر آتی اور پائونیر نے جو ۱۸۷۱ء میں صوبہ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ "تمام بنگالہ میں چند مسلمان عہدہ دار ہیں جو جلد پنشن لیں گے اور اُن کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں دکھائی دے گا۔" بعینہٖ وہی حال صوبۂ پنجاب اور اضلاع شمال مغرب و اودھ کا ہو جاتا کہ سرکاری عہدوں پر کسی مسلمان کی شکل دکھائی نہ دیتی پس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں جس قدر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان سرکاری عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ محمڈن کالج کے تعلیم یافتہ ہوں یا کسی اور کالج کے یہ سب اسی شور و غل کا نتیجہ ہے جو سرسید نے ولایت سے آ کر محمڈن کالج قائم کرنے اور مسلمانوں کو اُس کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے تمام ملک میں ڈال دیا۔

## ملازمت میں محمڈن کالج کے طالب علموں کی تعداد

اگرچہ اس صاف اور صریح نتیجہ پر خیال کرنے کے بعد اس بات کی

ضرورت باقی نہیں رہتی کہ نما صکر محمڈن کالج کے جن مسلمان طالب علموں نے گورنمنٹ سروس یا ہندوستانی ریاستوں کی ملازمت میں امتیاز حاصل کیا ہے اُن کی گنتی بتائی جائے تاہم اُن لوگوں کو اطلاع کے لیے جو انگریزی تعلیم یا محمڈن کالج کی علت غائی ملازمت کے سوا اور کسی چیز کو نہیں سمجھتے محمڈن کالج کے اُن طالب علموں کی فہرست[1] جو بالفعل سرکاری یا غیر سرکاری عہدوں پہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مامور ہیں یا عنقریب مامور ہونے والے ہیں نواب محسن الملک کی ایک تحریر سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں :

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| امپیریل سروس | ۱ | جو پولیس اسکول الہ آباد میں تعلیم پارہے ہیں | ۵ | اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ نمک واسٹیشن ماسٹر وغیرہ | ۱۰ |
| سول سروس | ۲ | جج | ۲ | ملازمان سررشتہ تعلیم | ۳۱ |
| بیرسٹرایٹ لا | ۳۱ | منصف | ۷ | ملازمان[2] ریاستہائے ہندوستانی | ۴۹ |
| سول سرجن | ۱ | انسپکٹر وسب انسپکٹر پولیس | ۲۹ | وکلا | ۴۷ |
| جو ڈاکٹری کیلیے ولایت میں تعلیم پارہے ہیں | ۴ | نائب تحصیلدار | ۱۷ | تحصیلدار | ۲۰ |
| جو ڈاکٹری کیلیے لاہور تعلیم پارہے ہیں | ۵ | اسسٹنٹ سب ڈپٹی اور پیم ایجنٹ | ۲ | ملازمان فوج | ۷ |
| ڈپٹی کلکٹر واکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر | ۱۱ | سررشتہ دار وہیڈ کلرک وغیرہ | ۶۴ | میزان | ۳۴۴ |

[1] اس فہرست میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں مگر ہندو خال خال ہیں باقی کُل مسلمان ہیں صرف وکلا میں ہندوؤں کی تعداد کسی قدر زیادہ ہے ۱۲۔

[2] منجملہ ان کے ایک جج ہائیکورٹ اور ایک سکرٹری ہوم ڈپارٹمنٹ حیدرآباد ہے ۱۲۔

# محمڈن کالج کی خصوصیات

علیگڑھ محمڈن کالج کے جو نتائج اوپر بیان کیے گئے اگرچہ اُن کو مسلمانوں کی اس پست حالت کے لحاظ سے جو بیس بائیس برس پہلے تھی اور جو روز بروز زیادہ پست ہوتی جاتی تھی بہت غنیمت سمجھنا چاہیے لیکن ان نتائج سے محمڈن کالج کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی کہ جس کی رو سے اس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دیجا سکے یا اُس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سوا اس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کس قدر زیادہ پائی جاتی ہے کوئی تفاوت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں پس تا وقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی انسٹیٹیوشن نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ نفس تعلیم کے لحاظ سے ہمارے ملک کے کالجوں کو جب تک کہ ان کی باگ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں ہے ایک دوسرے پر ترجیح دینی ناممکن ہے ایک سانچے سے ایک ہی سے پرزے ڈھل کر نکلتے ہیں اور جس قسم کا بیج بویا جاتا ہے ویسی ہی جنس پیدا ہوتی ہے

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

بارہا خود مدبران سلطنت نے ایجوکیشنل درباروں میں کہا ہے کہ سرکاری کالج اور یونیورسٹیاں کامل تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔ پس جو تعلیم کا اصلی مقصد ہونا چاہیے اُس کو سردست ہندوستان کے کسی کالج میں ڈھونڈھنا لاحاصل ہے ہاں اگر ہندوستانیوں میں اتنی ہمت اور اس کے ساتھ قدرت بھی ہو کہ وہ بھی یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح اپنے پرائیویٹ کالجوں میں فیلو سسٹم جاری کریں یا اپنی یونیورسٹی الگ قائم کریں تو ممکن ہے کہ اس ملک میں بھی ویسے ہی محقق اور موحد و مخترع پیدا ہونے لگیں۔ جیسے انگلستان، فرانس اور جرمنی میں پیدا ہوتے ہیں مگر یہ سب ناشدنی باتیں ہیں جن کو ہندوستان کی آب و ہوا راس آتی معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن اگر تعلیمی نتائج سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو محمڈن کالج میں ضرور ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جن کے لحاظ سے اُس کو ہندوستان کے دیگر کالجوں کی نسبت زیادہ مفید کہا جاسکتا ہے ازانجملہ ایک نہایت صاف اور صریح خصوصیت کالج مذکور کی یہ ہے کہ اُس میں ہر سال جس قدر روپیہ اسکالرشپوں میں خرچ کیا جاتا ہے ظاہرا ہندوستان کے کسی گورنمنٹ کالج یا پرائیویٹ کالج میں صرف نہیں کیا جاتا کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کے لحاظ سے یہاں سب جگہ سے زیادہ اس بات میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو غریب طالب علموں کو جو شوقین اور ہونہار معلوم ہوتے ہوں اسکالرشپوں کے ذریعہ سے تعلیم میں مدد دیجائے اور تا بمقدور غریب اور آسودہ حال طلبہ تقریباً یکساں حالت میں طالب علمی کا زمانہ بسر کریں۔ چنانچہ ١٨٩١ء سے لیکر ١٨٩٦ء تک یعنی چھ سال میں کچھ کم ستائیس ہزار روپیہ اس کالج کے طلبہ کو اسکالرشپوں اور وظیفوں میں دیا گیا ہے۔ اگر ذی مقدور مسلمانوں

کو منتظمان کالج کی نسبت ایک سواں حصہ بھی قوم میں تعلیم پھیلانے کا خیال ہو تو مذکورۂ بالا رقم سے دس حصہ زیادہ روپیہ اس مد میں صرف ہو سکتا ہے۔

## سامانِ تربیت

لیکن بڑی خصوصیت اس کالج کی سامان تربیت ہے جس کو بانی کالج نے ہمیشہ تعلیم سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھا ہے اور جس کے بغیر فی الواقع تعلیم کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا ہماری درسگاہوں میں کبھی خیال نہیں کیا گیا اور اسی لیے ہم لوگ تربیت کے مفہوم سے جیسی کہ چاہیے واقفیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ کالج کے بانیوں نے تربیت کے متعلق بہت کچھ تحریروں اور تقریروں میں بیان کیا ہے باوجود اس کے اکثر لوگ تربیت کے مفہوم سے اب تک ناواقف ہیں اور اسی واسطے محمڈن کالج کے کھیلوں پر اور طالب علموں کے لباس وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اسی خیال سے ہم چاہتے ہیں کہ اس مطلب کو زیادہ وضاحت سے بیان کریں۔ کیونکہ سرسید کی لائف میں اس سے زیادہ کوئی مہتم بالشان واقعہ نہیں ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی درسگاہ میں تربیت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ہمارے ہاں تربیت اولاد کا آلہ زیادہ تر تعلیم و تلقین، نصیحت و پند، زجر و توبیخ، یا زد و کوب کو سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام وسائل جب تک کہ لڑکے ایک معتدبہ زمانہ تک عمدہ سوسائٹی میں نہ رہیں اکثر صورتوں میں محض فضول اور بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ مذکورۂ بالا وسائل سے اول تو اکثر صورتوں میں مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں اور اگر کوئی عمدہ اثر دلوں پہ ہوتا بھی ہے تو وہ بہ آب کی طرح جلد زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن سوسائٹی کے اثر سے عمدہ

اخلاق رفتہ رفتہ طبیعت ثانی بن جاتے ہیں اسی سوسائٹی کے اثر سے اہلِ
یورپ کے اخلاق اصولاً ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور
اسی سوسائٹی کے میسر نہ ہونے سے ہم لوگوں کے اخلاق و عادات میں باہم
زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے لڑکے جب کسی درسگاہ میں آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان
کو کچھ سکھایا اور یاد کرایا جائے زیادہ تر اس بات کی ضرورت ہوتی ہے
کہ جو کچھ وہ اپنے گھروں سے سیکھ کر آئے ہیں اُس کو بالکل اُن کے دلوں سے
بھلا دیا جائے۔ قطع نظر ان عام خرابیوں کے جو ہندوستانیوں کے اخلاق
اور معاشرت میں عموماً پائی جاتی ہیں، ہم خاصکر اُن چند خصلتوں کا ذکر کرتے
ہیں جو بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں، جیسے مذہبی تعصبات
باہمی نزاع، رشک و حسد، غیبت، بدگمانی، کاہلی، تن آسانی، تضییع اوقات
ادائے فرائض میں سستی کرنا، غصہ، بے اعتدالی، نافرمانی وغیرہ وغیرہ اور کچھ
شک نہیں کہ ان میں سے اکثر خصلتیں مسلمانوں میں بہ نسبت دیگر اقوام کے
زیادہ دیکھی جاتی ہیں۔ یہی باتیں جب چھوٹے بڑوں میں دیکھتے ہیں تو اُن کی
طبیعتوں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی جاتی ہیں اور آخر کار اُن کی طبیعت
ثانی بن جاتی ہیں۔

انھیں خرابیوں کے تدارک کے لیے محمڈن کالج میں بورڈنگ سسٹم قائم
کیا گیا ہے۔ مگر پہلے اس سے کہ ہم اس سسٹم کے فوائد اور یہ کہ اُس کو طلبہ کی
تربیت میں کیا دخل ہے، بیان کریں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح تعلیم کے
نتیجے اعداد کے ذریعے سے دکھائے جا سکتے ہیں اس طرح تربیت کے نتائج
نہیں دکھائے جا سکتے۔ نیز تعلیم کے کا اثر دفعۃً اور نمایاں ہوتا ہے اور تربیت

کا اثر نامعلوم اور بتدریج ہوتا ہے جس طرح دھوپ اور ہوا اور پانی کی تاثیر سے پودے جو آہستہ آہستہ نشوونما پاتے ہیں اُن کو نمو کرنا مالی کے سوا ہر شخص کو فوراً محسوس نہیں ہوتا اسی طرح تربیت کے نتائج بدیہی طور پر ایک مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کو قائم ہوئے کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا اس لیے یہاں ہم کو زیادہ تر یہ دکھانا مقصود ہے کہ محمڈن کالج میں مسلمان طلبہ کی تربیت کا کیا سامان مہیا کیا گیا ہے؛ وہ کہاں تک اُن کی حالت کے مناسب ہے؛ اور اُس سے آیندہ کن نتائج کی توقع ہو سکتی ہے؛ نہ یہ کہ اس طریقۂ تربیت سے اب تک کیا نتیجے مترتب ہو چکے ہیں؛

# قومیت کا خیال

سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آیندہ نسلوں میں اتفاق و یک جہتی و قومی ہمدردی پیدا کرنے کی ہے جس کے نہ ہونے سے تمام قوم روز بروز مضمحل اور تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے۔ یہ امید رکھنی کہ وعظ نصیحت سے یا اخباروں اور رسالوں میں اتفاق کے فوائد پر بڑے بڑے آرٹیکل لکھنے سے یا اس مضمون پر زوردار اور موثر نظمیں شایع کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا ہو جائے گا، ایسی ہی بات ہے جیسے حُب کے عمل سے دشمنوں میں دوستی پیدا کرنی۔ اُن میں اتفاق پیدا ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ اُن کی نسلیں اتفاق کے سایہ میں نشوونما پائیں اور ایک مدت تک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کریں جہاں مختلف خاندانوں مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں،

ایک مسجد میں نماز پڑھیں، ایک فیلڈ میں مردانہ کھیل کھیلیں، ایک میدان میں گھوڑے دوڑائیں، ایک کلب میں ڈبیٹ کریں، ایک کالج میں پڑھیں اور ایک احاطہ میں دن رات سگے بھائیوں کی طرح شیر وشکر ہو کر رہیں، اور اس طرح اتفاق کی حلاوت ماں کے دودھ کی طرح اُن کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

# ریاضت جسمانی

ریاضت جسمانی جس کا سامان محمڈن کالج میں ہندوستان کے تمام کالجوں سے زیادہ مہیا کیا گیا ہے اور جس میں یہاں کے طالب علموں نے تمام ملک میں بڑی شہرت حاصل کی ہے، اکثر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے طالب علموں کی طبیعت تعلیم سے اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ اور کالج میں رہنے سے جو اصل مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔ مگر جس قوم کی تقلید سے ہم اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلواتے ہیں اُن کے ہاں ریاضت جسمانی تعلیم کا جزو غیر منفک سمجھی جاتی ہے۔ لیکن صرف اُن کی تقلید ہی سے ریاضت جسمانی کو محمدن کالج میں ضروری نہیں ٹھیرایا گیا بلکہ اس لیے اُس کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں وہ قوم میں مستعدی اور جفاکشی کی مثال ہوں اور سستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی ایک قومی خصلت سمجھی جانے لگی ہے بجائے اس کے وہ اُن میں چستی و چالاکی کی بنیاد ڈالیں۔ وہ برخلاف اُن تمام کتاب کے کیڑوں کے جو اپنے تمام قوائے دماغی کتاب کی نذر کر دیتے ہیں اور زندہ دلی و شگفتگی اور تمام امنگیں اور چاؤ بلکہ بعض صورتوں میں اپنی زندگی تک تعلیم پر قربان کر دیتے ہیں، جب کالج کو چھوڑیں تو لکھنے پڑھنے کے سوا وہ دنیا کے تمام کاموں کے لائق ثابت ہوں

وہ ہندوستان کی عام حالت کے برخلاف جہاں ایک شخص کا سپاہی اور عالم ہونا گویا اجتماع ضدین سمجھا جاتا ہے تعلیم یافتہ بھی ہوں اور سپاہی بھی وہ اُن فرسودہ دماغوں کی طرح جن میں کثرتِ مطالعہ سے تحمل اور برداشت کی طاقت نہیں رہتی، چڑچڑے، نازک مزاج اور بد دماغ نہ بنجائیں۔ اگر ان کو یورپین افسروں کی ماتحتی میں رہنے کا اتفاق ہو تو محنت اور جفاکشی کے موقعوں پر ان کا ساتھ دینے سے عاجز اور اُن کی نظر میں ذلیل نہ ہوں۔ وہ ملکی اور فوجی دونوں قسم کی خدمات کے لیے انتخاب ہو سکیں۔ اگر اُن کو نوکری میسر نہ آئے تو اپنے دست و بازو پر بھروسا کر کے ہر کام پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکیں۔ اُن میں ایسی ستعدی پیدا ہو جائے کہ بیکاری اور آرام طلبی جو مسلمانوں کی قومی خصلت بن گئی ہے اور جس کے سبب سے عرب میں "ہندی تنبال" ایک مثال ہوگئی ہے ان کو وبال معلوم ہونے لگے وہ غیر ملکوں کے سفر سے نہ ہچکچائیں، وہ سختیوں کے جھیلنے کے عادی ہو جائیں۔ انھیں اغراض کے لیے محمڈن کالج میں ریاضت جسمانی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ محض تعلیم سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس میں دلیری اور ستعدی کا عنصر پیدا نہ ہو۔ لارڈ ڈفرن اپنے عہد حکومت میں جب محمڈن کالج کے ملاحظہ کو آئے اور ایڈریس میں کرکٹ وغیرہ کا ذکر سُنا تو اس کا جواب دیتے وقت انھوں نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "ہماری قوم نے پہلی فتح کرکٹ کے میدان میں حاصل کی تھی" ایک حکیم کا قول ہے کہ "قومی قوت صحت پر منحصر ہے" اور چونکہ صحت بغیر ریاضت جسمانی کے قائم نہیں رہ سکتی اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ قومی قوت ریاضت جسمانی پر منحصر ہے۔

خصوصاً جس قوم کو خدا نے ہم پر حکمران کیا ہے اور جن کی پسند اور انتخاب

---

ؔ عرب میں ہندی تنبال کے اور بیکار آدمی کو کہتے ہیں ۱۲

کے ساتھ ہماری تمام امیدیں وابستہ ہیں ان کے برابر کرئی قوم روئے زمین پہ ریاضت جسمانی کی فریفتہ نہیں۔ ان کو شیر خوارگی کے زمانہ سے ریاضت کے قابل بنایا جاتا ہے اور جب تک مرض الموت میں مبتلا نہیں ہوتے کبھی ریاضت ترک نہیں کرتے۔ علاوہ معمولی کھیلوں اور ریاضتوں کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کوس گھوڑے یا بائیسکل پریا پیادہ پا سفر کرتے ہیں۔ کشتیاں کھیتے ہیں، گاڑیاں ہانکتے ہیں، برف پر دوڑتے ہیں، پہاڑوں پہ چڑھتے ہیں، کانوں میں اترتے ہیں، لکڑیاں چیرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مصر کا ایک لائق مسلمان اپنے سفرنامہ یورپ میں لکھتا ہے کہ در مخاطر و مہالک میں گھس جانا۔ اخیر دم تک اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا اور جس قدر زیادہ مشکلات پیش آئیں اسی قدر زیادہ ثبات اور استقلال سے ان کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوم میں ایسا نہیں پایا جاتا جیسا انگریزوں کی قوم میں پایا جاتا ہے۔ ایسی قوم کی نظر میں کیا ہمارے نوجوان جب تک کہ انھیں کی برابر بلکہ اُن سے زیادہ جفاکش محنتی، دلیر اور مستعد نہ ہوں محض کتاب کا کیڑا بننے سے کچھ اعتبار یا وقعت حاصل کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

جو لوگ گورنمنٹ سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو والنٹیئر بنایا جائے اور ہم کو فوج میں معزز عہدے دیئے جائیں۔ جب تک کہ وہ بھی مثل انگریزوں کے اپنے تئیں اسپورٹس مین سپاہی نہ بنائیں ہرگز ایسی خواہش کرنے کا استحقاق نہیں رکھتے اور اسی لیے محمڈن کالج کے بانیوں نے ریاضت جسمانی کو تعلیم کا جزو غیر منفک قرار دیا ہے۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ کرکٹ فٹ بال اور جمناسٹک وغیرہ کے شوقین تعلیم میں کوشش نہیں کرتے یا لکھنے پڑھنے سے ان کا دل اچاٹ ہو

جاتا ہے، کیونکہ ہم نے سُنا ہے کہ جب کالج ٹیم نے پچھلے دنوں ہیں بمبئی اور پارسی ٹیم اور پٹیالہ ٹیم پر دو نمایاں فتحیں حاصل کی تھیں اُن میں کئی گریجویٹ تھے۔ اور باقی جتنے کالج کلاسوں میں پڑھتے تھے وہ سب تعلیم کے لحاظ سے بھی اپنی جماعتوں میں اچھے سمجھے جاتے تھے۔

# وقت کا خیال

ایک اور فائدہ بورڈنگ سسٹم سے طالب علموں کے لیے یہ سمجھا گیا ہے کہ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے سے اُن کو ضبط اوقات کی عادت پڑتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کی اولاد تضیع اوقات کرنے والی مشہور ہے، حالانکہ جس قوم کی گورنمنٹ سے ہمارے نوجوان نوکریوں کے خواستگار ہیں اُس کا ایک ایک فرد وقت کو اپنی دولت بلکہ اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے اور فی الحقیقۃ جو لوگ وقت کی کچھ قدر نہیں کرتے نہ وہ دین کے فرائض ادا کر سکتے ہیں نہ دنیا کے۔

وقت کی پابندی بھی وعظ و نصیحت سے یا کتابوں میں اُسکی خوبیاں پڑھنے سے یا کسی نفع کی امید یا نقصان کے خوف سے نہیں ہوتی، بلکہ ایک مدت تک اس کی مشق کرنے سے ہوتی ہے۔ محمڈن کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں جو صغیر سن لڑکے ایک الگ وارڈ میں رہتے ہیں اُن کی ابتدا ایسی ڈالی ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ کالج سے نکل کر ہمیشہ اوقات کے پابند رہیں گے۔

صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک وہ مختلف فرائض میں جکڑے رہتے ہیں نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہواخوری کرنا، یا گیند بلا کھیلنا، ازننگ اسکول، نائٹ اسکول اور بڑے اسکول میں پڑھنا، کھانا کھانا۔ مطالعہ دیکھنا

اور سونا یا سو کر اٹھنا. غرض ہر ایک کام کے لیے خاص اوقات مقرر ہیں جن
میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا۔ ظاہر ہے کہ آٹھ دس برس تک
جب ان کی زندگی اس پابندی اوقات کے ساتھ گزرے گی تو امید نہیں کہ
وہ عمر بھر اس عادت کو چھوڑ سکیں. اگرچہ بڑی عمر کے لڑکوں کے لیے بھی فرائض
اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے. وہ طبیعت ثانی
ہو جاتی ہے. بخلاف بڑی عمر کے لڑکوں کے کہ اول تو ان کو بہت برابر کالج
میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا، دوسرے جو عادتیں وہ باہر سے سیکھ کر آتے ہیں
ان کا زائل ہونا مشکل ہوتا ہے. اسی لیے محمڈن کالج میں بچپن سے رہنا بہ نسبت
بڑی عمر کے لڑکوں کے زیادہ مفید ہے۔

## اطاعت کی مشق

شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری جو ہر قوم کا اور خاصکر محکوم قوم
کا زیور ہے اس کی عادت ڈلوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اس
بورڈنگ ہوس میں موجود ہیں ظاہرا ہندوستان کے کسی انسٹیٹیوشن میں موجود
نہیں ہیں، علاوہ کالج اور ہائی اسکول اور نارمنگ اسکول اور تائٹ اسکول
کے جہاں طالب علموں کو پرنسپل پروفیسروں اور ماسٹروں کی آرڈر میں رہنا ضرور
ہے وہ ہر وقت اپنے تئیں کسی نہ کسی ہیڈ یا افسر کے زیر حکم پاتے ہیں جب
تک وہ بورڈنگ ہاؤس میں ہیں پراکٹر کے محکوم ہیں جب تک ڈائننگ ہال میں
رہتے ہیں ایک یورپین پروفیسر ان کا نگران رہتا ہے. اسی طرح فیلڈ میں
پریزیڈنٹ یا کیپٹن، یونین کلب میں پریسیڈنٹ یا اس کا قائم مقام. جمناسٹک
اور قواعد کے وقت ڈرل ماسٹر، گھوڑے کی سواری کے وقت رائڈنگ

ماسٹر، بیماری کی حالت میں ڈاکٹر اور مسجد میں ایک دیندار عالم اُن کی روک ٹوک کے لیے مقرر ہیں جن کا حکم ماننا اُن کو ضرور ہے۔

ظاہر ہے کہ جب برابر آٹھ سات برس طالب علموں کی زندگی ان ضوابط کے ساتھ بسر ہوگی تو کس قدر باقاعدگی اور اطاعت اُن کی طبیعت میں پیدا ہوجائے گی؛ اور کس قدر وہ دنیا میں ہر جگہ ہر دل عزیز ہو کر رہنا سیکھ جائیں گے؛

ایسی اطاعت جو قواعد و اصول پر مبنی ہو اُس کی عادت اولاد کو ابتدائے عمر میں ڈلوانی ایسی ہی ضروری ہے جیسے ابلق بچھیڑے کو سدھا کر اور باگوں پر صاف کر کے سواری کے قابل بنانا جس طرح اوکھے اور سرکش گھوڑے کا کوئی خریدار نہیں ہوتا اسی طرح نافرمان آدمی کہیں عزیز نہیں سمجھا جاتا، اکثر انگریز افسروں نے لوگوں سے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان ایسے فرماں بردار نہیں ہوتے جیسے ہندو اور اسی لیے یورپین افسران کی نسبت ہندوؤں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کی اولاد جن کا مدار معاش اب تک صرف نوکری پر رہا ہے اُن کو سب سے زیادہ اطاعت اور فرمانبرداری سکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا کہ آزادی اور اطاعت میں منافات ہے صحیح نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دنیا میں سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد طبع سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اُن سے بڑھ کر کوئی اپنے افسر کا حکم ماننے والا اور قانون پر چلنے والا اور قواعد کی پابندی کرنے والا نہیں ہوتا۔ پس محمڈن کالج کے بورڈنگ ہوس میں رہنے سے مسلمانوں کی اولاد ایک ایسی خصلت سیکھتی ہے جس پر اُن کی تمام آیندہ کامیابیاں منحصر ہیں۔

# قومی لباس کا خیال

اس کے سوا مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا کرنے کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت ہے جس کو آج تک ہندوستان کے عام مسلمانوں نے قابل التفات نہیں سمجھا، حالانکہ وہ ایک نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے۔ لباس جس کی نسبت ہمارے بزرگوں کا یہ قول تھا کہ "اَلتَّمَتُّعُ بِاللِّبَاسِ" اور جس سے ایک قوم کی دوسری قوم سے تمیز کیجاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔ انگرکھا، پاجامہ، ٹوپی، عمامہ، پگڑی یا جوتہ غرض کہ کوئی چیز مسلمانوں کے لباس میں ایسی نہیں ہے جس پر قومی خصوصیت کا اطلاق ہو سکے۔ ہندو مسلمانوں میں پہلے صرف اُلٹے اور سیدھے پردہ کی تمیز تھی مگر جب سے اچکن کا رواج ہوا ہے یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ قطع نظر اور ملکوں کے جہاں ہر قوم ایک خاص لباس رکھتی ہے خود ہندوستان میں اکثر معزز قومیں ہیں جو صرف اپنے قومی لباس سے پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے پارسی، مرہٹے، بنگالی، راجپوت وغیرہ۔ مگر مسلمانوں کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی، لباس کا متحد ہونا قومی یگانگت کے بڑھانے اور مغایرت کے دور کرنے میں ویسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا زبان، نسل اور مذہب کا متحد ہونا۔ اس کے سوا جس قوم کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں ہوتی اُن کی مجلسیں، اُن کے میلے اور اُن کی جماعتیں دوسری قوموں کی نظر میں ایک گوہارسے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اسی سبب سے سرسید کو ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور ما بہ الامتیاز پیدا

گریں، اور چونکہ بقول اُن کے آج ہندوستان میں کوئی مسلمان اتھارٹی ایسی موجود نہیں ہے جو ایک نیشنل لباس اختراع کرے اور اس کے رواج دینے پر زور دے، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس اول خود اختیار کر کے قوم میں ایک مثال قائم کی اور پھر محمڈن کالج کے بورڈروں کے لیے اُس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عملدرآمد ہے یونی فارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر بعض سوانح کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکا۔ لیکن محمڈن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہاؤس میں آکر رہتے ہیں بغیر کسی جبر کے اپنے ہمچشموں کو دیکھ کر خود بخود ٹرکش لباس اختیار کر لیتے ہیں جو علاوہ خوش قطع اور خوشنما ہونے کے ہر موسم اور ہر حالت کے مناسب اور قواعد حفظ صحت کے بھی موافق ہے۔ اور جب وہ کالج چھوڑ کر وہی لباس اپنے وطن میں جا کر پہنتے ہیں تو اکثر قوم کے نوجوان اُن کی دیکھا دیکھی وہی لباس اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح محمڈن کالج ہندوستان کے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ ایک قومی لباس کو رواج دے رہا ہے۔

اگرچہ بعض تنگدل انگریز جو ہندوستانیوں کو ہمیشہ پست اور ذلیل حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں وہ اس لباس سے ناراض ہوتے ہیں لیکن چونکہ گورنمنٹ نے ہم کو ہر قسم کا لباس پہننے کی آزادی دی ہے اور انگریزوں میں بھی زیادہ تر وہی فیاض اور آزاد طبع لوگ ہیں جن کے لیے متعصبانہ خیالات نہیں ہیں اس لیے محمڈن کالج کے طالب علم نہایت آزادی سے ٹرکش لباس پہنتے ہیں اور کسی کی بیجا ناخوشی یا ناگواری کا خیال نہیں کرتے۔

---

# کالج کی سوسائٹیاں

تیز پوروڑوں نے کالج کے احاطہ میں متعدد سوسائٹیاں قائم کر رکھی ہیں ازانجملہ ایک کالج یونین کلب اور دوسری اسکول یونین کلب ہے۔ کالج اور اسکول کے طلبہ ہفتہ میں ایک روز مختلف مضامین پر اپنے اپنے صدر انجمن کے روبرو انگریزی یا اردو میں معارضانہ بحث کرتے ہیں مگر کوئی بات آداب مناظرہ اور تہذیب کے خلاف زبان پر نہیں لا سکتے۔ جو لڑکے ڈبیٹ یا اسپیکنگ میں عمدہ لیاقت ظاہر کرتے ہیں ان کو انعام دیے جاتے ہیں۔ اس سے علاوہ اسپیکنگ اور استدلال کا ملکہ پیدا ہوتے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مجادلہ کا ناپسندیدہ طریقہ عموماً جاری ہے اُس کی اصلاح کی ان میں بنیاد پڑتی ہے اور طالب علموں کو مختلف سوالات پر بحث کرنے کے لیے مختلف کتابیں دیکھنے اور ہر ایک سوال پر رائے قائم کرنے کا موقع ملتا ہے۔

طالب علموں ہی نے ایک دوکان ڈیوٹی شاپ کے نام سے بورڈنگ ہاؤس میں کھول رکھی ہے جو مختلف طریقوں سے روپیہ جمع کر کے کالج اور طلبہ کی مدد کرتی ہے اس سے اُن کے دل میں کالج کے ساتھ ہمدردی اور اُس کی امداد کے لیے عملی کام کرنے کی خود بخود ترغیب ہوتی ہے۔

ایک اور سوسائٹی برادرہڈ کے نام سے قائم کی گئی ہے جس میں اُن تمام طالب علموں نے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کہیں نوکر ہو گئے ہیں اپنی آمدنی میں سے فیصدی ایک روپیہ ماہوار چندہ محض کالج کی امداد کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اس کے سوا اور سوسائٹیاں ہیں ایک انجمن اخوان الصفا جس میں اس کے ممبر آزادی کے ساتھ مختلف عنوانوں پر مضامین لکھ کر پیش کرتے ہیں، دوسری لجنۃ الادب جو عربی زبان میں تقریر یا تحریر کی مشق کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔

ایک اور سوسائٹی حال ہی میں سائنس پر لکچر دینے اور اس کے تجربے دکھانے کے لیے طالب علموں نے قائم کی ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں میں علمی مذاق پیدا کرنا ہے۔ یہ سوسائٹی گو ابھی ابتدائی حالت میں ہے مگر چونکہ وہ زمانہ کے مقتضا کے موافق ہے اس لیے اس کے ترقی کرنے کی بہت کچھ امید کی جاتی ہے۔

ان سب سوسائٹیوں کے علاوہ ریاضت جسمانی کے لیے کرکٹ اور فٹ بال اور جمناسٹک کلب اور گھوڑے کی سواری کیلئے رائڈنگ اسکول ہے اگرچہ رائڈنگ اسکول نے مسلمانوں کی کم ہمتی یا بے مقدوری کے سبب ابھی تک کچھ زیادہ ترقی نہیں کی مگر جو کلب ریاضت جسمانی کے لیے قائم ہیں ان میں توقع سے بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے جس کی وجہ سے کالج ٹیم نے تمام ہندوستان کی یورپین اور ہندوستانی ٹیموں میں، جیسا کہ کالج کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہے۔ توقع سے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔

## مذہبی تعلیم

مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کی خصوصیات میں سے ہے، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ شاخ جیسی کہ ایک محمڈن کالج میں ہونی چاہیے ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہنچی لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے اور منتظموں پر عائد

نہیں ہوتا۔ اول تو دو مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لیے جدا جدا مقرر ہیں اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی۔ انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی دوسرے دنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے۔ وہ اس قدر مشکل اور طویل الذیل ہوتے ہیں کہ اُن کے پورا کرنے میں طلبہ کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُن پر مذہبی تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ کالج چھوڑ دیں گے یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ بااینہمہ جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل اس کی سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے۔ ہندوستان کے کسی کالج میں اُس کا وجود نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان کے جن کالجوں کی تقلید سے اس کالج میں تربیت کا مذکورۂ بالا سامان مہیا کیا گیا ہے اُن کے مقابلہ میں اس کالج کو مشکل سے ایک خاکا یا ایک ادھورا نمونہ اُن کالجوں کا کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگلستان کے مذکورۂ بالا کالج کتنی کتنی مدت میں موجودہ حالت تک پہنچے ہیں تو جس حد تک علی گڑھ محمڈن کالج بیس بائیس برس کے عرصہ میں پہنچ گیا ہے۔ اس سے کچھ کم تعجب نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بڑے بڑے نامور کالج اور یونیورسٹیاں جو آج تمام یورپ میں مشہور و معروف ہیں کئی کئی سو برس تک نہایت گمنامی اور پستی کی حالت میں رہی ہیں اور جس طرح بتدریج قوم میں تعلیم بڑھتی گئی اُسی طرح آہستہ آہستہ اُن کی حالت ترقی کرتی گئی۔ پس ہم کو اس کالج کی موجودہ حالت

پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن اصول پر وہ قائم کیا گیا ہے اگر انھیں اصول کے موافق وہ ترقی کرتا چلا گیا تو پچاس ساٹھ ہی برس وہ کس درجہ پر پہنچ جائے گا۔

بیشک کالج کے اندرونی انتظامات میں بہت سی باتیں قابل اعتراض موجود ہیں جن کو سرسید کی خود رائی اور ضد اور ہٹ کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط نہ تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ صدیوں کے کام مہینوں اور دونوں میں پورے نہیں ہو سکتے اور ایک شخص کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک قومی انسٹی ٹیوشن کو اس حد تک پہنچا جائے جس کے بعد کسی اصلاح یا ترقی کی ضرورت باقی نہ رہے اور ایک ریفارمر جس نے اگلے وقتوں کے بہت سے خیالات اور بہت سی رایوں کی اصلاح کی ہو اس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ساتھ کے ساتھ اپنے خیالات اور اپنی رایوں کی بھی اصلاح کرتا جائے۔

# یوروپین اسٹاف

ایک اور خصوصیت اس کالج کی یوروپین اسٹاف ہے جس کو بانی کالج نے متعدد وجوہ سے نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ اول تو ہندوستانی تعلیم یافتہ علمی لیاقت اور طرز تعلیم کے لحاظ سے بھی یوروپین پروفیسروں کی برابری نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض ایسے لائق ہندوستانی پروفیسر میسر بھی آجائیں تو ان کا اثر طلبہ کی تربیت پر جو اس کالج کا اصلی مقصود ہے ویسا ہرگز نہیں پڑ سکتا جیسا انگریز پروفیسر کا پڑ سکتا ہے۔ ڈیوٹی کا خیال، وقت کی قدر، قواعد حفظ صحت کی پابندی، سیلف ہیلپ

مستعدی اور ریاضت جسمانی کی عادت۔ یہ تمام خصلتیں یورپ میں بھی انگلش قوم کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں خصوصاً انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کے گریجویٹ شریفانہ اخلاق کے لحاظ سے تمام قوم میں ممتاز گنے جاتے ہیں۔ اس کے سوا کالج کا نظم ونسق اور افسرانہ رعب وداب جیسا کہ ایک انگریز معلم کالج یا اسکول میں قائم رکھ سکتا ہے ہندوستانی معلموں سے اس کی ہرگز توقع نہیں کیجا سکتی۔ اسی لیے کالج کے قواعد میں یہ اصول قرار دیا گیا ہے کہ کم سے کم ایک پرنسپل اور دو پروفیسر کالج میں اور ایک ہیڈ ماسٹر اسکول میں ہمیشہ یورپین ہونا چاہیے اور جہانتک کالج کی آمدنی میں گنجائش ہو اس تعداد میں اور اضافہ کیا جائے اور جب کسی یورپین پروفیسر کی ضرورت ہو تو انگلستان کی کسی مشہور یونیورسٹی کا گریجویٹ جس کی علمی اور اخلاق قابلیت پر اُس کے اُستادوں نے شہادت دی ہو ایک ہزار روپیہ سفرخرچ دے کر بلایا جائے۔ چنانچہ اب تک چار چار پانچ پانچ یورپین افسر کالج اور اسکول میں برابر مقرر رہے ہیں اور اگر کالج فنڈ میں گنجائش ہو تو ممکن ہے کہ عند الضرورۃ اُن کی تعداد اس سے زیادہ بڑھ جائے۔

اگرچہ بظاہر جو بیش قرار تنخواہیں یورپین عہدہ داروں کو دیجاتی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یورپین اسٹاف نے عام طور پر اُس ضرورت کو بخوبی ثابت کر دیا ہے جس کی بنا پر سرسید نے اُن کالج کا جزو اعظم قرار دیا ہے۔ وہ باوجود قومی، مذہبی اور ملکی مغایرات کے محمڈن کالج کو گویا اپنا قومی انسٹیٹیوشن سمجھتے ہیں وہ اپنے طلبہ کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں، ان کی دعوتوں اور پارٹیوں میں، اُن کی مجلسوں میں، اور اُن کے مباحثوں میں خود بھی شریک

ہوتے ہیں۔ اور اسٹیشن کے یوروپین افسروں اور اُن کی لیڈیوں کو شریک کرتے ہیں اور اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں اُن کا اعتبار زیادہ ہو، اُن کو گورنمنٹ کا ادب اور انگریزوں کی محبت سکھاتے ہیں۔ خود اُن کا برتاؤ جو ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ ہے انگلش نیشن کی محبت اور وقعت اُن کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ وہ طرح طرح سے اُن کو غیرت دلاتے ہیں اور اُن کی غفلت کے نتائج سے اُن کو خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمدہ خصلتوں، شائستہ عادتوں، فرائض کی پابندی، صفائی ضبطِ اوقات اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرکٹر پر نہایت قوی اور پائیدار اثر پیدا کر رہے ہیں جو کسی اور طریقے سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا وہ غریب طالب علموں کی طرح طرح سے امداد اور تقویت کرتے ہیں، بیمار دل کی خبر لیتے ہیں، کالج کے چندوں میں شریک ہوتے ہیں، اس کی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں، اس کی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں اور اس میں وہ تمام انتظامات اور تربیت کے طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں آہستہ آہستہ جاری کرتے جاتے ہیں وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لڑکوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں مسجد کی غیر حاضری پر اُن کو سزائیں دیتے ہیں، مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی اُن کو تاکید کرتے ہیں، مولود کی مجلسوں اور اُن کے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں

ایک بڑا بدیہی ثبوت اس بات کا کہ وہ محمڈن کالج میں کس وقعت اور محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، یہ ہے کہ مسٹر آرنلڈ پروفیسر آف فلاسفی جو کالج کی بدقسمتی سے یہاں کا تعلق ترک کرکے لاہور کالج میں چلے گئے ہیں اُن کی روانگی کے زمانہ میں ہر شخص کو جو کالج سے تعلق رکھتا تھا اس قدر افسوس ہوا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا خصوصاً کالج کلاسوں کے طالب علم جو اُن کا لکچر

سنتے تھے اُن کو مسٹر آرنلڈ کی اور مسٹر آرنلڈ کو ان کی جدائی کا جس قدر رنج اور قلق ہوا تھا اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان سے پہلے جب مسٹر والس پروفیسر اور مسٹر سورسٹ ہیڈ ماسٹر نے کالج سے قطع تعلق کیا تھا اس وقت بھی تمام کالج کو اسی کے قریب قریب رنج ہوا تھا جیسا کہ اس سال مسٹر آرنلڈ کے جانے سے ہوا اور اسی طرح مسٹر ڈنٹن مرحوم ہیڈ ماسٹر کے قبل از وقت مرجانے پر کالج کے تمام متعلقین نے مثل اپنے عزیزوں کے رنج و ماتم کیا ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کالج کو ہمیشہ ایسے ہی دلسوز اور مسلمانوں کے ہمدرد پروفیسر ملتے رہیں گے جن کا ذکر اوپر ہوا یا جیسے کہ اب کالج میں موجود ہیں لیکن بہرحال یورپین اسٹاف کا اس کالج میں ہونا خاصکر مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء سے، بلکہ اُس وقت سے جبکہ ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ نکل کر انگلش قوم کے ہاتھ میں گئی، ہندوستان کے مسلمانوں کا حال بعینہٖ ایک نوجوان بیوہ کا سا رہا ہے کہ کیسی ہی عفیفہ اور پاک دامن ہو مگر بدگمانیوں سے کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح اپنے مذہب کی رُو سے اس بات کی ضرورت ہے کہ سچے دل سے انگلش گورنمنٹ کے وفادار رہیں اسی طرح ملکی مصلحت سے یہ بھی ضرور ہے کہ حکمران قوم کو کبھی اپنی طرف سے بدگمان ہونے کا موقع نہ دیں۔ آج کل انگریزی تعلیم سے انگریزوں میں تقریباً ویسی ہی بدگمانی پائی جاتی ہے جیسی کسی زمانہ میں جہالت اور تعصب سے پائی جاتی تھی۔ پس ایک ایسا ہوم انسٹیٹیوشن جہاں چار چار سو مسلمان ایک وقت میں انگریزی تعلیم پاتے ہیں اور کئی کئی برس تک دن رات وہیں زندگی بسر کرتے ہوں، جب تک

کہ اُس میں متعدد یورپین افسر اُن کے نگران اور اُن کے خیالات کی اصلاح کرنے والے موجود نہ ہوں حکمران قوم کے اطمینان کے لائق نہیں ہو سکتا۔

انھیں خیالات سے سرسید نے کم سے کم چار یورپین افسروں کا ہمیشہ کالج اور اسکول میں رہنا کالج کے قواعد میں داخل کر دیا ہے اور اس تدبیر سے کالج کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس سے بہت زیادہ فائدے پہنچنے کی آیندہ توقع ہے۔ زیادہ تر اسی خصوصیت کی وجہ سے گورنمنٹ پندرہ ہزار چھ سو روپیہ سالانہ کی امداد اس کالج میں دیتی ہے اور اسی سبب سے تمام اینگلو انڈین افسر اور حکام عموماً اس کالج کی نسبت عمدہ خیال رکھتے ہیں، دور دور سے نابالغ سردار زادوں اور رئیس زادوں کو تعلیم کے لیے یہاں بھیجتے ہیں ہر صوبہ میں یہاں کے طالب علموں کو خوشی سے نوکریاں دیتے ہیں۔ بعض اوقات پرنسپل سے خود درخواست کر کے یہاں کے طلبہ کو نوکری کے لیے بلاتے ہیں، بڑے بڑے جلیل القدر انگریز کالج کو آ کر دیکھتے ہیں، چار وائسرائے اور چھ سات لفٹننٹ گورنر اب تک یہاں آ چکے ہیں۔ لارڈ نارتھ بروک نے دس ہزار روپیہ اسکالرشپوں کے لیے اس کالج کو عنایت کیا ہے اور اُن کے سوا کئی وائسرائوں اور لفٹننٹ گورنروں نے اس میں چندہ یا تمغے دیئے ہیں خصوصاً سرسید کی وفات کے بعد جو خاص توجہ اور مربیانہ سرپرستی حضور لارڈ ایلگن اور آنریبل مسٹر لاٹوش اور خاصکر سر انٹونی مکڈانل نے کالج کی نسبت ظاہر فرمائی ہے اس کی شکر گذاری سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور منتظمان کالج خصوصاً کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام امتیازات زیادہ تر یورپین اسٹاف اور خاصکر مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل کالج کی بدولت اس انسٹیٹیوشن کو حاصل

ہونے ہیں۔ انھیں وجوہات سے سرسید کالج کی باگ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں جانی نہیں چاہتے تھے جس سے یوروپین اسٹاف کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ رکھنے کی، جیسا کہ وہ خود اُن کے ساتھ رکھتے تھے، توقع نہ ہو۔

# کالج کی نسبت مدبران سلطنت کی رائیں

جو رائیں اور خیالات محمڈن کالج یا اُس کے طلبہ اور اس کے بانی کی نسبت مدبرانِ سلطنت نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں یا تقریروں میں ظاہر کیے ہیں ان میں سے کچھ کچھ فقرے انتخاب کر کے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

## سر جان اسٹریچی

۱۸۸۰ء میں سر جان اسٹریچی نے اُس ایڈریس کے جواب میں جو ہندوستان سے جاتے وقت اُن کو کالج میں دیا گیا تھا کہا کہ "سب سے بڑا اور اخیر کام جس میں انھوں نے (یعنی سید احمد خاں نے) اپنی زندگی اور اپنے تمام وسائل کو صرف کیا ہے یعنی اپنے ہموطنوں کی تعلیم اور ان کی حالت کو ترقی دینے اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان زیادہ تر اتحاد اور ہمدردی پیدا کرنے کا وہ کام ہے جس کے بعض نتیجوں کو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ یہ نتیجے آیندہ زمانہ میں اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہوں گے لیکن اب بھی میں اس کالج کی ترقی کو شمالی ہندوستان کی پچھلی تواریخ کے نہایت عظیم اور دلچسپ واقعات میں سے تصور کرتا ہوں"۔

پھر صاحب ممدوح نے اپنی کتاب "انڈیا" میں اول ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا یہ فقرہ جو محمڈن کالج کے متعلق ہے نقل کیا ہے کہ "بعض

اعتبارات سے یہ کالج ہندوستان میں سب انسٹیٹیوشنوں سے اعلیٰ درجہ کا انسٹیٹیوشن ہے جو تعلیمی اور ملکی دونوں حیثیتوں سے بڑی عظمت اور وقعت کا وعدہ کرتا ہے۔ انگریزی حکومت کے آغاز سے لے کر اب تک مسلمانوں کی ذاتی کوشش کا یہ پہلا اظہار ہے۔ علیگڑھ کی جماعت نے ایک مثال پیدا کی ہے جس کی اگر اچھی طرح سے پیروی کی جائے تو قومی تعلیم کا مسئلہ حل کر دے گی۔ اُن لوگوں کی جنھوں نے ایسی دلسوزی سے محنت کی ہے اور اُس بدرقہ کی جو سرکار کو تعلیم اور ترقی کے کام میں ملا ہے جہاں تک قدر و منزلت کیجائے نامناسب نہ ہوگی" اس کے بعد وہ اپنی کتاب "انڈیا" میں اہل انگلستان سے محمدن کالج کی سفارش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "انھیں (یعنی اہل انگلستان کو) اپنی مدد سید احمد خاں کے کالج کے واسطے بھیجنی چاہیے۔ اُن کو اس سے زیادہ طمانیت بخش موقع نیکی کرنے کا نہیں ملے گا"

## ڈاکٹر ہنٹر

ڈاکٹر ہنٹر نے ۱۸۸۲ء میں جبکہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسیڈنٹ تھے اضلاع شمال مغرب کے دورہ کے وقت صرف محمڈن کالج کی عظمت و شان کے لحاظ سے کمیشن کا پہلا اجلاس علیگڑھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ جو ایجوکیشن کے باب میں تھی وہ کالج کے بڑے ہال میں آکر کی اور کالج کی نسبت کہا "صاحبو یہ کالج جس میں ہم جمع ہوئے ہیں، چونکہ یہ ایک نہایت عظیم اور شریف کوشش کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے کی گئی ہے اس کمیشن کا پہلا اجلاس جو اضلاع شمال مغرب میں ہونا چاہیے تھا علیگڑھ میں تجویز ہوا ہے ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہماری موجودگی اور اس مقام پر آنا اُس سیمت ہلیپ

کی عظیم الشان مثال کی خوبی کا ایک ثبوت خیال کیا جائے گا۔ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہیلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی "۔ پھر کہا کہ "یہ ایک نہایت شریف کام ہے جو کسی فانی انسان کے ہاتھوں سے دنیا کے پردہ پر ہوا ہو اور یہ میرے پاس موجود ہے وہ بہادر اور فیاض دل شخص جس نے بیس برس کی پُر صبر اور پُر استقلال کوششوں سے اس کام کو انجام دیا ہے " پھر کہا کہ " پہلے دس برسوں میں میرے دوست سید کو اکثر مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور اس کے اختیار کیے ہوئے کام میں بہت کم ترقی ہوئی۔ اس کو اپنے بعض خیالات چھوڑ کر نئی تجویزیں اختیار کرنی پڑیں اور لوگوں کی مخالفت اور ناراضی اور اپنے پرانے دوستوں کی سرد مہری اور جاہل دشمنوں کی پرضرر شورش نہایت تحمل سے برداشت کرنی پڑی مگر اس نے ایک لمحہ کے واسطے ہمت نہ ہاری۔ رفتہ رفتہ مگر مضبوطی سے اس کے مقصد نے ترقی پائی۔ لوگوں نے اس پر اعتماد کیا کیونکہ وہ اپنے کام پر اعتماد رکھتا تھا "

## سر الیفرڈ لائل

سر الیفرڈ لائل نے اس کالج کی نسبت کہا کہ " اس نظیر کے قائم کرنے سے کالج کے بانیوں نے گورنمنٹ اور رعایا اور علی العموم ہندوستان کی تعلیم کے حق میں ایک عمدہ خدمت کی ہے۔ کیونکہ وہ ہم کو ایک ایسے مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دے رہے ہیں جواب تک شاید ہی دنیا کے کسی حصہ میں خاطر خواہ طور پر حل ہوا ہو "

---

# سر آکلنڈ کالون

سر آکلنڈ کالون نے محمڈن کالج کے طالب علموں کی نسبت کہا کہ "جو شخص ان نوجوان آدمیوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلے ہیں وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹی کے گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں علیگڑھ کالج کا طالب علم زمانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ہندوستانیوں کے اس فرقہ کا ایک نمونہ ہو گیا ہے جو انگریزوں کی خواہش کی بخوبی داد دینے کے واسطے کوشش کرتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی ان کی خواہشوں کی اسی طرح داد دیں۔"

# مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ

مسٹر کین جو پارلیمنٹ کے ایک نامور اور بنی نوع کے خیر خواہ ممبر ہیں اور جو پچھلے برسوں میں شراب اور مسکرات کے استعمال کے خلاف ہندوستان میں لکچر دینے اور اصلی حالات تحقیق کرنے کے لیے آئے تھے، انھوں نے سفر ہندوستان کے متعلق ایک کتاب موسوم بہ پکچر سک انڈیا لکھی ہے جس کے ایک باب میں علیگڑھ کالج کی نسبت نہایت عمدہ اور مفصل خیالات ظاہر کیے ہیں ان میں سے ہم چند فقروں کا خلاصہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج دوسرے کالجوں سے اس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ ایک خاص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولٹکل جوش

پھیلانے والا ہے۔ اسی فیلنگ کا یعنی اس بات کا کہ قومی بہبودی اسی اصول پر منحصر ہے جس کا وہ پابند ہے، یہ نتیجہ ہے کہ اُس کی بڑی امداد کی گئی ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کا ترقی یافتہ گروہ بلکہ گورنمنٹ انگریزی بھی نہایت توجہ اور شوق سے اُس کی جانب نظر رکھتی ہے۔" دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "گورنمنٹ کالجوں سے یہ کالج دو خاص باتوں میں مختلف ہے۔ اول تو اس میں مسلمان طالب علموں کی مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز سن کر طالب علم اسی وسیع احاطہ کی تمام اطراف سے اپنے آباؤ اجداد کے عقیدہ کے موافق عبادت کرنے کیلیے مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ نماز کے علاوہ قرآن اور دینیات اور اخلاق کی کتابوں کا پڑھنا کالج کے سلسلہ خواندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے امید کیجاتی ہے کہ جو طالب علم اس کالج سے نکلیں گے وہ قدیم خیالات پر نئے علوم کا پیوند لگا دیں گے اور اُس کے ذریعہ سے پُرانے خیالات کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلیں اور جو طریقہ قوم کو اس کی ذلیل حالت سے نجات دینے کا موجود ہے اس کو اختیار کریں۔ دوسرا اصول جس میں یہ کالج سرکاری مدارس سے ممتاز ہے یہ ہے کہ اس میں بخلاف سرکاری مدارس کے صرف عقلی تعلیم ہی پر توجہ نہیں کیجاتی، بلکہ وہ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر قائم کیا گیا ہے۔ سب طالب علم ایک احاطہ میں رہتے ہیں، ایک جگہ کھانا کھاتے ہیں اور ایک صحت بخش کالج لائف سے حظ اٹھاتے ہیں۔ کسی ملک میں ایک ایسے انسٹیٹیوشن کا پایا جانا مشکل ہے جو اس کالج کی بہ نسبت زیادہ تر زبردست جوش باہمی اتحاد کا پیدا کرتا ہو۔ قوم کی امیدیں اس انسٹیٹیوشن کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ ایک بڑی کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے باب میں ایسی قوم نے کی ہے جس میں تقدیر پہ بھروسا کرنے کے عقیدہ نے تمام ہمتیں اور ارادے پست

کر رہے ہیں۔" پھر کرکٹ کلب کے متعلق لکھتے ہیں کہ "کالج کی ایک ٹیم تمام اپر انڈیا میں ہندوستانی ٹیموں سے گوئے سبقت لیجاتی ہے اور اسٹیشن کی نہایت عمدہ الیونوں کا مقابلہ کرتی ہے" پھر یونین کلب وغیرہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ" ڈیبٹنگ سوسائٹی جو کیمبرج یونین کلب کے نمونہ پر قائم کی گئی ہے لڑکوں کو جلسۂ عام میں گفتگو کرنے اور انگریزی طریقہ پر کاروبار انجام دینے کا سبق دیتی ہے۔ کالج کی دعوتوں اور جلسوں، مذہبی تہواروں، شاعرانہ صحبتوں، کرکٹ، فٹ بال اور جسمانی ورزشوں کے باعث نوجوان مسلمانوں کو اپنی زندگی کے مختلف طریقوں میں دل بہلانے کے لیے مدد ملتی ہے اور اُن کی مختلف لیاقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ معلموں اور طالب علموں میں کسی قسم کا تفرقہ جو قومی اختلافات سے پیدا ہوتا ہے مطلق نہیں ہے۔ علیگڑھ میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان جو صفائی قلب اور دل میل جول دیکھا جاتا ہے۔ ویسا شاذ و نادر ہی ہندوستان میں کہیں اور دیکھا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے انگریز جنٹلمین اور لیڈیاں کالج کے طالب علموں کی پنچ پر دعوت کرتے ہیں اور کالج کے ہال میں ان کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح پر محبت کی فیلنگ کی ایک ایسی بنیاد قائم کی گئی ہے کہ اگر اس کو ترقی ہو جائے تو وہ ہندوستان کے باشندوں اور انگریزی حکومت دونوں کے حق میں بیشمار فائدوں کا باعث ہوگی۔ ایسے موقعوں پر معزز بزرگ سید نے اکثر اوقات پُر جوش سرگرمی کے ساتھ اپنی یہ دلی آرزو ظاہر کی ہے کہ انگریز اور مسلمان سچے دوست ہو جائیں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے کام کیا کریں اور انھیں موقعوں پر اس نے کالج کے اُس نشان کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ہلال پر ایک صلیب لگی ہوئی ہے۔"

# سر انٹونی مکڈانل

سر انیٹونی مکڈانل نے مئی ۱۸۹۶ء میں ٹرسٹیان کالج کی ایڈریس کا جواب دیا تھا اس میں انھوں نے کالج کا ذکر کرتے وقت فرمایا "ایک بڑے شاعر کا قول ہے کہ صلح کی فتوحات لڑائی کی فتوحات کی نسبت کچھ کم نہیں ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ہمارے عہد کی مصالحت آمیز فتوحات میں اس کالج کا قائم ہونا یقیناً ایک فتح ہے جس سے سب کے دلوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور کسی کے دل کو تکلیف یا رنج نہیں پہنچا۔ یہ ایک ایسی فتح ہے جس کی رونق رو بہ زمانہ کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتی" پھر فرمایا کہ "میں اس انسٹیٹیوشن کو نہایت عزت کے لائق سمجھتا ہوں جس طرح پر کہ میں کسی شخص کو پسند کرتا ہوں اسی طرح پر میں اس ... انسٹیٹیوشن کو پسند کرتا ہوں جو آپ اپنے اوپر بھروسا رکھتا ہو اور فخر یہ طور پر آزاد ہو اور اسی کے ساتھ گورنمنٹ کی فیاضانہ مہربانی کی واجبی طور پر قدر کرتا ہو" پھر اسپیچ کے خاتمہ پر یہ الفاظ کہے "اس بات کی امید کرنا کچھ مبالغہ نہیں کہ یہ کالج ترقی پاکر آئندہ مسلمانوں کی بڑی درسگاہ ہو جائیگا اور یہ مقام مشرق کا قرطبہ ہو جائیگا۔"

لارڈ ایلگن نے نومبر ۱۸۹۷ء میں، جبکہ سرحد پر سرکاری فوج آفریدیوں سے لڑ رہی تھی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت انگلو انڈین اخبارات حکمراں گروہ میں بدگمانی پھیلا رہے تھے، محمڈن کالج میں آنے کی خود خواہش ظاہر کی اور جو ایڈریس ٹرسٹیان کالج کی طرف سے اُن کی خدمت میں پیش کی گئی اُس کے جواب میں انھوں نے اس وقت جبکہ کالج کے تمام طالب علم اُنکے سامنے حاضر تھے یہ فرمایا "صاحبو کوئی وقت ایسا نہیں ہے جبکہ اس قسم کا مجمع میری طبیعت کو اس قدر خوش معلوم ہو سکے جیسا کہ یہ معلوم ہوتا ہے پچھلے چند

مہینوں میں اور اس وقت گورنمنٹ ہند بالکل اپنی خواہش کے برخلاف اُن قوموں کے ساتھ جو تمہارے ہم مذہب ہیں. علانیہ لڑنے پر مجبور ہوئی ہے اور ایسے شخصوں کی کچھ کمی نہیں ہے جنھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت اور اُس کی مسلمان رعایا کے درمیان مخالفت روز بروز روبہ ترقی ہے. صاحبوان قابل افسوس ہنگاموں میں ہم نے پھر اُس بات کو دیکھا ہے کہ جو ہم اکثر اوقات سابق میں دیکھ چکے ہیں. یعنی حضور ملکۂ معظمہ کی نسبت مسلمان رعایا کی خیر خواہی اور وفاداری کو اور میں اس جگہ پر ایک زیادہ تر پرامن موقع پر اس بات کو تسلیم کرنے اور معلوم ہو لے سے خوش ہوں کہ اس کالج کے اندر پر امن صورتوں میں خیر خواہی اور وفاداری کا وہی جوش ترقی پر ہے جیسا کہ میدان جنگ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے عمدہ خیالات مدبران سلطنت انگلشیہ اس کالج کی موجودہ حالت دیکھ کر وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہتے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ ایک تعلیمی انسٹیٹیوشن کی عمدگی پر ان لوگوں کی شہادت سے بہتر کسی کی شہادت نہیں ہو سکتی ۔

یہ ہے سید احمد خاں کی زندگی کا وہ کارنامہ جس کی اگرچہ مسلمانوں نے عام طور پر ابتک کچھ قدر نہیں کی لیکن یورپ کے نامور اخبار ٹائمز آف لندن نے گذشتہ اپریل میں اسی کارنامہ پر سر سید کی نسبت لکھا تھا کہ " اس شخص کو ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں تعلیم کا پرو نٹ کہا جائے تو بجا ہے " اگرچہ اس عظیم الشان کام کی ابتدائی مشکلات اُس مرحوم کی جانفشانی اور استقلال سے تقریباً بالکل حل ہو گئی ہیں، مذہبی مخالفتوں اور بدگمانیوں کا طوفان فرد ہو گیا ہے، کالج کی سالانہ آمدنی اور خرچ کی نوبت پون لاکھ کے

قریب پہنچ گئی ہے۔ عمارتیں جس اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر بنانی منظور تھیں گو ابھی اُن کی تکمیل نہیں ہوئی مگر قوم کی تھوڑی سی توجہ سے پوری ہو سکتی ہے۔ یورپین اور نیٹو اسٹاف توقع سے زیادہ عمدہ اور قابل اطمینان بہم پہنچ گیا ہے۔ یونیورسٹی کے نتائج امتحان کالج اور اسکول کی وقعت اور اغنیاء لوگوں کی نظر میں روز بروز زیادہ کرتے جاتے ہیں، بورڈنگ ہاؤس ایک بے نظیر نمونہ پر جیسا کہ کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا تھا طلبہ کی تربیت کے لیے قائم ہو گیا ہے مذہبی تعلیم و تربیت کا سامان بھی جہاں تک کہ منتظمانِ کالج کی قدرت میں تھا مہیا کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ گورنمنٹ نے اُس کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، مگر درحقیقت اُس کا تھامنا اُس کی اصلاح کرنا اور اس کو ترقی دینا قوم کا اور صرف قوم ہی کا کام ہے۔ اگرچہ سرسید کی زندگی میں تو لوگ قوم کی طرف سے بالکل مایوس تھے اور سمجھتے تھے کہ اُنکی آنکھیں بند ہوتے ہی کالج کی حالت دگرگوں ہو جائے گی مگر خدا کا شکر ہے کہ سرسید کے بعد مسلمانوں نے بالکل خلاف توقع اور خلاف امید کالج کی طرف توجہ ظاہر کی ہے کہ بقول ایک ظریف کے اگر سرسید کو یہ خبر ہوتی کہ میرے بعد لوگ ایسی سرگرمی ظاہر کریں گے تو وہ بن آئی موت مر جاتے۔

## ترقی تعلیم کی دیگر تدبیریں

سرسید نے ترقی تعلیم کی غرض سے صرف محمڈن کالج قائم کرنے اور اُس میں تعلیم و تربیت کا سامان کا مہیا کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کی اصلاح اور ہائی ایجوکیشن کی ضرورت پر وہ اخیر دم تک اپنی تحریروں اور اسپیچوں میں برابر زور دیتے رہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں

کے نظام تعلیم کو وہ ہمیشہ ہندوستان کے حق میں غیر مفید خیال کرتے تھے اور جب سے ملک میں یہ خیال پھیل گیا تھا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے اُن کو سخت اندیشہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے جو مرمر کر تعلیم کے وسائل مہیا کیے گئے ہیں، کہیں یہ تمام کوششیں برباد نہ ہو جائیں اور سرشتۂ تعلیم ہی اوسے نہ پڑ جائیں. اِس لیے وہ ہمیشہ یونیورسٹیوں کے نظام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جب کبھی اُن کو گورنمنٹ کے تیور ہائی ایجوکیشن کے برخلاف معلوم ہوئے انھوں نے فوراً اُس کی حمایت پر قلم اٹھایا اور نہایت دلیری اور بے باکی سے اس پالسی کی تغلیط کی. ۱۸۸۲ء میں انھوں نے ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دیتے وقت یونیورسٹی کے قواعد پر خوب دل کھول کر اعتراض کیے اس کے سوا ہمیشہ بذریعہ تحریر اور تقریر کے یونیورسٹی کے نقص اور سقم ظاہر کرتے رہے۔

## ہائی ایجوکیشن کی حمایت

ہائی ایجوکیشن کے متعلق انھوں نے کمیشن کو آگاہ کیا کہ لوگوں میں عموماً یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن بند کرنا چاہتی ہے پس اگر گورنمنٹ کوئی کالج توڑے گی خواہ اُس کے توڑنے کی کیسی ہی معقول وجوہات ہوں لوگ یہی سمجھیں گے کہ سرکار ہم کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔

## پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت

اس سے پہلے ۱۸۸۱ء میں جس شد و مد کے ساتھ انھوں نے اسی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگی۔ اس مخالفت کی بنیاد

یہ تھی کہ اول لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات میں جو اسپیچیں کیں اُن سے مشرقی علوم کی ترغیب و تحریص کی بو آتی تھی۔ اس کے بعد جو ایڈریس اہل پنجاب نے لارڈ رپن کی حضور میں گذرانے اور جو جواب حضور ممدوح نے اُن پر دیے اُن سے یہ احتمال قوی ہو گیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کالج کو یونیورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں ہائی ایجوکیشن کا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ہز اکسلنسی کے جواب میں یہ الفاظ موجود تھے کہ "ترقی و اشاعت زبانہائے مشرقی و علوم مشرقی نہایت ہی کار احسن ہے۔ اور جہاں میری محدود واقفیت معاملات ہندوستان میں ہے۔ میں اُن خیالات سے اتفاق رکھتا ہوں جو میرے نزدیک آپ لوگ رکھتے ہیں کہ اس ملک میں صرف زبانہائے دیسی کے توسل سے علوم و فنون کی ترقی و اشاعت بہترین سہولت سے ہو سکتی ہے۔" اور جب ایڈریس کے جواب میں ہز اکسلنسی نے یہ ارشاد فرمایا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "ساڑھے تین لاکھ روپیہ جو سرمایہ یونیورسٹی کالج ہے والیانِ ریاست و دیگر روسائے پنجاب نے دراصل زبانہائے دیسی کی تکمیل سے تعلیم کو رواج دینے کی غرض سے عطا کیا تھا۔ سینٹ کو اس بارہ میں کچھ بھی شک نہیں کہ علم کو زبانہائے دیسی کے توسل سے ترقی دینا تعلیم کی ضروریات کو ملک کے حسب حال بنانے کا بہترین طریقہ ہے اور سینٹ اور گورنمنٹ ہند کا بھی یہی مقصد ہے۔"

جب یہ ایڈریس اور اس کا جواب شایع ہوا اور سرسید کی نظر سے گذرا تو اُن کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا اور جیسا کہ اُن کی طرز تحریر سے پایا جاتا ہے عنانِ صبر اُن کے ہاتھ سے جاتی رہی انھوں نے حد سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ پے در پے تین آرٹیکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف

لکھ کر شائع کیے جن کا تمام پنجاب میں غل پڑ گیا تعلیم یافتہ گروہ نے جن میں زیادہ تر ہندو ایجوکیٹڈ شامل تھے تینوں آرٹکلوں کو ایک جگہ جمع کر کے چھپوا دیا اور تمام پنجاب میں ان کو عام طور پر شایع کر دیا جس سے پنجاب یونیورسٹی کے اکثر حامیوں کی رائیں بدل گئیں اور ڈاکٹر لائٹنر جو مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کے نہایت سرگرم حامی تھے اور پنجاب یونیورسٹی کو گویا ورنیکلر یا اورنٹیل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے انھوں نے سرسید کے آرٹکلوں کا انگریزی اور اردو دونوں ہی زبانوں میں جواب لکھ کر مشتہر کیا مگر اس عربی مثل کے موافق " قَدْ سَبَقَ السَّیْفُ الْعَذْلَ "[1] سرسید کی تحریریں اپنا کام کر چکی تھیں اور اس لیے اب اُن کا جواب لکھنا اور اُن کی تردید چھاپنی بے سود تھی، اگرچہ یہ تینوں آرٹکل بہت لمبے ہیں اور یہاں اُن کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بھی سرسید کی ملکی خدمات میں سے ایک خدمت ہے اور اس کی وقعت کا اندازہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اُن تحریروں میں سے کچھ نقرے بطور نمونہ کے ناظرین کو دکھائے جائیں اس لیے ہم تینوں آرٹکلوں میں سے بعض بعض مقامات اس موقع پر نقل کرتے ہیں :

پہلے آرٹکل کو جس کا عنوان "مشرقی علوم و فنون" ہے وہ اس طرح شروع کرتے ہیں " ہم کو نہایت ہوشیاری سے دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے اور ہمارے ملک کی بہبودی اور ترقی کے لیے ہے . ایسا نہ ہو کہ صرف دھوکا ہو. ہم کو اس وقت پچھلے زمانہ کے قصے اور کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا کہ ایشیا میں ایشیائی سلطنت کے زمانہ میں علوم و فنون کیا تھے اور اُن

---

[1] یعنی تلوار چل چکی اب ملامت بے فائدہ ہے.

کے وقت میں اُن کو کیسی ترقی اور کیسی سرسبزی تھی محض بے فائدہ ہے۔ ہم کو
اپنے زمانہ کے حالات پر جو گورنمنٹ انگلیشہ کی حکومت کا زمانہ ہے، غور کرنا
اور اُس کو ہندوستان ہی کی حدود میں محدود رکھنا ہمارے لیے زیادہ مفید اور زیادہ
تر بکار آمد ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے وہ مختلف طریقے جوایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں
کی تعلیم کے متعلق ابتدائے عملداری سے اختیار کرتی رہی (یعنی اول ہندوستانیوں
کی تعلیم کے فرض سے غافل رہنا، پھر ان میں علوم مشرقی کے رواج دینے میں
کوشش کرنا اور آخر کار لارڈ میکالے کے اصرار سے اہل ہند کو یورپ کے
علم وحکمت کی تعلیم دینا) بیان کیے ہیں پھر انھوں نے دینیات کو مستثنےٰ کرنے
کے بعد مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی جس کو پنجاب یونیورسٹی از سر نو زندہ کرنا
چاہتی تھی، خوب قلعی کھولی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ہم صاف صاف
کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو مشرقی علوم کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں
کے ساتھ نیکی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ میکالے کو دعا
دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے کہ اس نے اس دھوکے کی ٹٹی
کو اٹھا دیا تھا، کیا وہ ٹٹی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر لگائی جاتی ہے! ایڈریس
کے ساتھ (جو لارڈ رپن کو دیا گیا تھا) بڑے بڑے ہندوستانی سرداروں کا ہونا
اور بہت بڑی فیاضی سے بڑے بڑے چندوں کا دینا مثل اسی فیاضی کے
ہے جو ہمیشہ وہ اصلی مقصد سے ناواقف رہ کر دیگر اسباب سے کیا کرتے
ہیں۔ اُن کی شان وشوکت ایسے امر کی جو فی الحقیقہ کچھ وقعت نہیں رکھتا، وقعت
نہیں بڑھا سکتی۔ چند نا عاقبت اندیش ہندوستانی شاید ان باتوں سے خوش
ہوتے ہوں گے اور گورنمنٹ کا احسان مانتے ہوں گے۔ مگر دور اندیش آدمی

ان تمام باتوں سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہایت افسوس دیا پوسسی سے گورنمنٹ کی اور اُن یوروپین اعلیٰ درجہ کے حکام کی کارروائی کو جو اس میں شریک ہیں دیکھتے ہیں

ہم نہایت سچائی سے اور گورنمنٹ کی دلی خیر خواہی سے بتانا چاہتے ہیں کہ سمجھدار اور دور اندیش ہندوستانی ان تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں ؛ نہایت بدخیال اُن کے دل پیدا ہوتا ہے۔ چند سال گذرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے جبکہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا ) کہ اُن کو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تعلیم دینا منظور نہیں ہے اور وہ ہم کو اسی قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جس قدر کہ اس کو ضرورت ہے۔ وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اس کو انتظام ملک اور انتظام دفتر کے لیے چند ایسی پُتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں مگر سمجھ نہ سکتی ہوں جیسے کہ مانچسٹر میں سوت کاتنے کے لیے پُتلیوں کی ضرورت ہے۔ جو کچھ کہ وہ (یعنی گورنمنٹ ، ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی کوئی اس کا شکرگذار نہ تھا اس لیے کہ اُس کو خود غرضی پر محمول کیا جاتا تھا نہ رعایا پروری پر"

" کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا (یعنی جب کہ ہندوستان میں کلکتہ بمبئی اور مدارس یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں ) کہ ہندوستانیوں میں سے یہ خیال دور ہوا تھا اور ہندوستانی یہ یقین کرتے تھے کہ گورنمنٹ نے اپنی پالسی بدل دی ہے اور درحقیقت اُسکو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا اور ہندوستانیوں کو انھیں کے فائدہ کیلئے تعلیم دینا مقصود ہے۔ مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبرانِ سلطنت کی پالسی پھر بدلی ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ درجہ کی حقیقی تعلیم ، بنیادہ مناسب نہیں سمجھتی۔ اُن کو (یعنی ہندوستانیوں کو ) اب تک یقین

نہیں ہے کہ یہ پالسی درحقیقت مستحکم ہوگئی ہے اور اس پر عمل کرنا فی الواقع قرار پا چکا ہے۔ مگر ایسے واقعات جو پیش آتے جاتے ہیں، جیسے کہ حضور عالی لارڈ لٹن کے وقت میں انڈین سول سروس کے قواعد[1] قرار پانے اور جیسے کہ جناب ممدوح نے بعض اسپیچوں میں علوم مشرقی کی ترقی کی ترغیب دی، یا جیسے کہ یہ حال میں واقعہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو کامل یونیورسٹی بنانے کی درخواست کے وقت پیش آیا، وہ اندیشہ ہندوستانیوں کو نہایت تردد میں ڈالتا ہے اور وہ خوف زدہ ہوکر خیال کرتے ہیں کہ شاید وہ پالسی مستحکم ہوگئی ہے اور وہی دھوکے کی ٹٹی پھر ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی کی جاتی ہے جس کو ہمارے محسن لارڈ مکالے نے اپنی نہایت سچی تحریروں اور زبردست ہاتھوں سے اٹھایا تھا۔ ہم نے کوئی مجلس لائق ہندوستانیوں کی ایسی نہیں پائی جس میں ان خیالات کی روز بروز ترقی نہ ہوتی ہو۔ ہمارا دلی مقصد ہے کہ ہم اصلی حال اُن ہندوستانیوں کی فیلنگ کا جن کی فیلنگ درحقیقت قدر و غور کے لائق ہے گورنمنٹ سے مخفی نہ رکھیں اور اس میں کوشش کریں کہ گورنمنٹ ایسی جماعت کی باتوں سے جن کے ظاہری بدن زر و جواہر سے جگمگاتے ہیں اور جن کے تمام کام درحقیقت و بجز اسباب پر مبنی ہیں، نہ واقعی واقعات پر، دھوکے میں نہ آوے۔"

دوسرے آرٹیکل میں جس کا عنوان " ورنیکلر یعنی ہماری زبان " ہے۔ انھوں نے اول ان مشکلات کو بیان کیا ہے جو مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں ترجمہ کرکے شایع کرنے میں پیش آتی رہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی

---

[1] چونکہ انڈین سول سروس کے قواعد میں امیدواروں کے لیے کسی یونیورسٹی کی ڈگری کی شرط نہیں تھی اسلیے یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن کو موقوف کرنا چاہتی ۱۲

کا کلکتہ میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے قائم کرنا، پھر دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونا اور پھر اسی مقصد کے لیے سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا قائم ہونا اور تینوں جگہ ناکامی کے "سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہونا نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "جب غیر قوم یعنی مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو یہاں کے باشندوں میں سے وہی لوگ برسرعرصہ اور حکومت میں شریک ہوئے جنھوں نے اُن کے علوم، اُن کی زبان، اُن کے سے خیالات، اُن کا سا تمدن، ان کا سا لب ولہجہ اور اُن کی سی روش اختیار کی۔ ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا کہ ہم مشرقی علوم، دیسی زبان اور دیسی علوم کو ترقی دے کر عزت و دولت وحشمت وحکومت حاصل کریں گے بعینہٖ ایسا ہی ہے جیسے کوئی امریکا کے اصل باشندوں کو خیال دلاوے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں ترقی کر کے اپنی حکمران قوم میں عزت و دولت وحشمت وحکومت حاصل کرو گے۔"

"قومی ترقی اور حکومت دونوں ماں جائی بہنیں ہیں۔ پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اُس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتح مند قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے سے اپنے فتحمندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے۔ علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جن میں اُن فتحمندوں نے کاملیت حاصل کی ہے۔ سوشل عادات اور علمی و عملی و ملکی خیالات اُس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کی مناسبت پیدا نہ ہو اُس وقت تک باہمی دوستی کا برتاؤ محالات سے ہے۔ اسی مناسبت کے نہ ہونے سے آج تک ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے باہم دوستانہ

برتاؤ نہیں ہے۔ خوشامد کی باتیں جو کوئی چاہے سو کرے اور پولٹکل طریقہ میں جو کچھ بیان کرنا ہو کیا جائے مگر ہندوستانیوں کا حال اپنی فتحمند قوم کے ساتھ غلامی کی حالت سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہم اس کا الزام اپنی فتحمند قوم کے ذمہ نہیں دھرتے بلکہ خود اپنی قوم کے ذمہ ڈالتے ہیں کہ اُس نے خود اپنے تئیں اس لائق نہیں بنایا کہ ہماری فتحمند قوم ہم سے دوستانہ برتاؤ کرسکے پھر علوم مشرقی کی ترقی اور جھوٹی سوٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دیں گی! اور ہم کو کونسی عزت و دولت و حشمت و حکومت بخشیں گی! یونیورسٹی کالج لاہور نے ابتک ہم کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے جو آیندہ پوری یونیورسٹی ہو کر اور مردہ علوم مشرقی کو زندہ کر کے اور ہماری پُرانی شائستگی کو پھر پیدا کر کے ہم کو پہنچاوے گا۔ کچھ شبہ نہیں کہ یونیورسٹی کالج اب بھی ہماری ترقیوں کا سد راہ رہا ہے اور جب وہ یونیورسٹی ہو جائے گا اور ضرور ہو جائے گا تو ملک کے لیے، قوم کے لیے، ملکی اور قومی ترقی کے لیے آفت عظیم ہو گا ہم پر احسان رکھ کر ہم کو دھوکے میں ڈالا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مشرقی علوم و تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں اور کس مطلب سے؟ اس کا جواب کسی پیرایہ میں اور کیسے ہی میٹھے لفظوں میں دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہی ہے کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لیے۔"

"گورنمنٹ نے ہمارے لیے سول سروس میں داخل ہونے کا رستہ گو اس میں کیسی ہی مشکلات پڑ گئی ہوں ابھی تک کھُلا رکھا ہے۔ بیرسٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلومہ اور انجینیری کا سرٹفکیٹ حاصل کرنے کے لیے کوئی امر ہم کو مزاحم نہیں ہے۔ ہندوستان میں انڈین سول سروس کے عہدے کو جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت کی ضرورت

نہیں سمجھی گئی ہے۔ جانے دو۔ مگر ہائی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری امیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں۔ ہندوستانیوں کا کونسل قانونی ہیں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے۔ ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ان حقوق کے واجبی طور سے حاصل کرنے کے لیے ہم کو کیا کرنا ہے! کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی! کیا ہماری پرانی شائستگی کو پھر ہمارے لیے مہیا کرنے والی تجویز؛ معمولی عہدے بھی، جیسے وکالت و منصفی و سب ججی ہے، بغیر انگریزی زبان کی کافی لیاقت کے ہم کو میسر نہیں آسکتے، پھر کیا مردہ علوم مشرقی کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کو ترقی سے ہم کو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے؛ یونیورسٹی کالج لاہور۔ جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی راہ چلنے سے روکے، ہم کو ہمارے حقوق سے محروم رکھے اور ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کرسکیں، ہمارے حق میں اور کیا کرسکتا ہے!

ہم کو ایسا لائق ہونا چاہیے کہ ہم دور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں ہم بساطی کی سی دوکانداری سے نکلیں۔ ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں، ہماری تجارت کی "محمڈن اینڈ ہندو کمپنی" کے نام سے کوٹھیاں لندن میں، ایڈنبرا میں، یروسلم میں۔ سینٹ پیٹرسبرگ میں، برلن میں، وانشا میں، قسطنطنیہ میں، پیکن میں۔ واشنگٹن میں اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بحری و بری سفر اسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور قومیں کرتی ہیں جس سے ہم کو عزت، دولت، حشمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو۔ پھر کیا ہمارے مردہ مشرقی علوم کا زندہ ہونا اور مشرقی زبانوں کا ترقی دینا اور ہماری پرانی شائستگی کو پھر قائم کرنا ہم کو اس قابل بنا دے گا؛ ہرگز نہیں۔ پس ہم کو علوم مشرقی

کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صاف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہوسکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے جو لوگ دور اندیش ہیں وہ کبھی ایسی پالسی کو پسند نہ کریں گے اور اس میں ہندوستان کی فلاح نہ تصور کریں گے۔ بلکہ اپنے حق میں ہندوستان کے حق میں اور گورنمنٹ کے حق میں شدید مضر سمجھیں گے۔

اس کے بعد اُن اسباب کی طرف جن سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے۔ اشارہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کر دیا ہے اور انھوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بیجا اور نا واجب اور نا منصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کی ہے، مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں اور گورنمنٹ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چیں جس قدر گورنمنٹ انگریزی کے قدر دان ہیں شاید کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ پس نکتہ چینی کے اندیشہ سے ہماری تعلیم کو برباد کرنا ہمارے حق میں کچھ انصاف نہیں ہے۔ ہم کو بالغ العلوم اور مالک العلوم کے خطاب دینا اور پھر نابالغ کے درجے پر رکھنا ہم کبھی پسند نہیں کر سکتے۔"

"ہمارے لیے سیدھا رستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے یوروپین لٹریچر اور یوروپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں۔ جہاں تک ہم کو یونیورسٹی کے بیچے خطاب حاصل ہو سکتے ہیں حاصل کریں جب اس سے بھی زیادہ ہم میں ہمت ہو آکسفورڈ و کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو جائیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں۔ اپنے تئیں مہذب و تعلیم یافتہ جنٹلمین اس کے اصلی و حقیقی معنوں میں بنائیں

اور جو فیض تعلیم و تربیت و تہذیب ہم نے اُن مہذب ملکوں میں حاصل کیا ہو اس کو اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں میں پھیلاویں بے شک ہم کو ایسا کرنے میں بہت مشکلات ہیں، ادھر ہم کو اپنی قوم کی جہالت و تعصب سے مقابلہ کرنا ہے اور اُدھر اپنی فتحمند قوم کے اُن تنگدل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت کرنا ہے جو ہماری سوشل اور پولٹکل حالت کی ترقی اپنی طبیعی تنگدلی کے برخلاف سمجھتے ہیں۔ ہماری انگلش لائف، انگلش تمدن جنٹلمین کیسے اخلاق، یہاں تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشم خشم آلود سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے کوئی نہایت نیک دل بڑے مجرم کو دیکھتا ہو۔ مگر ہم کو اپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہیے اور جو تکالیف اور مشکلات ہم کو پیش آئیں نہایت تحمل اور پختہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہییں، مگر ہم اس بات کو مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ گریٹ ریفارمر (یعنی زمانہ) ان باتوں کو ضرور ہونے دیگا اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی و خفگی اس کو روک نہیں سکے گی لیکن بے شک یہ تنگدل کے خیالات ناراضی کو ترقی دینے والے اور فاتح و مفتوح میں ہمدردی و محبت کو توڑنے والے ہیں۔"

یہ دو آرٹکل جن سے مفہوم ہوتا تھا کہ سرسید نے خاصکر پنجاب یونیورسٹی پر حملہ کیا ہے جب یونیورسٹی کے حامیوں کو شاق گذرے اور اُن کے برخلاف پنجاب سے بعض مضامین شائع ہوئے تو سرسید نے ایک تیسرا آرٹکل جس کا عنوان "ہماری زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعلیم" تھا اور لکھا جس سے صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ درحقیقت ہمارا روئے سخن پنجاب یونیورسٹی کی طرف نہیں بلکہ گورنمنٹ کی پالیسی کی طرف تھا جس سے خوف تھا کہ رفتہ رفتہ تمام ہندوستان کی یونیورسٹیاں بھی اصول نہ اختیار کرلیں۔ اس آرٹکل کو اُنھوں

نے اس طرح شروع کیا ہے "ہمارے دو آرٹکلوں نے ہمارے پنجاب کے دوستوں کو گھبرا دیا ہے بلکہ کسی قدر رنجیدہ کر دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان آرٹکلوں سے ہم کو بالتخصیص یونیورسٹی پر حملہ کرنا مقصود ہے اور اپنے حسن ظن سے اس کی بنیاد حسد پر قائم کی ہے۔ ہم کو افسوس ہے اگر یہ کمینہ خصلت ہم میں ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج جس کے اصول سے بلاشبہ ہم مختلف الرائے ہیں اگر وہ یونیورسٹی ہو جائے تو ملک کو ایسے اور وسیع ملک کو جس میں تین اور یونیورسٹیاں موجود ہوں کوئی معتد بہ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہوتی ہے اور اس سے ملک کو برخلاف ہماری رائے کے فائدہ پہنچنے والا ہے تو چشم ما روشن۔ ہماری عین خوشی ہے کہ ملک کو فائدہ پہنچے اور ہماری رائے غلط ثابت ہو۔ اور اگر وہ فی الحقیقۃ ملک کو فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے تو اس کو ہونے دو۔ اس سے مخالفت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ خود اس میں ناکامی کا بیج ہے اور وہ آپ ہی ناکام ہو جائے گی۔"

اس کے بعد وہ مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی تعلیم کے نتائج کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں کہ "بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت توجہ کی مگر وہ ایک کو بھی سنسکرت میں ان پنڈتوں کے برابر نہیں بنا سکا جو دھوتی باندھے کمرے پہنے سنکنکا اور شیوالہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی مقدس زبان سنسکرت کو تحصیل کرتے ہیں۔ مگر ان کی تحصیل سے ملک کو بجز اس کے کہ بنارس میں دس پانچ منگتا پنڈت اور زیادہ ہو گئے کیا نتیجہ حاصل ہوا؟ یونیورسٹی کالج لاہور نے بلخ و بدخشاں[1] کے طالب علموں کو جو کچھ تعلیم دی

---

[1] سید کے آرٹکل سرسید کے خلاف لاہور سے نکلے تھے ان میں لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کالج میں بلخ و بدخشاں کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔

ہو۔ ہم کو اس کا حال معلوم نہیں. مگر آج تک ( ہندوستان میں ) اُس نے ایک کو بھی عربی یا فارسی میں اُن لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنھوں نے مسجد کے حجروں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کر اور درود فاتحہ کی روٹی پر گذران کر کر عربی و فارسی کو تحصیل کیا اور اعلیٰ درجہ کا تبحر اُن میں پیدا کیا. مگر اس کا نتیجہ بجز اس کے کہ مُردوں کی روٹیاں کھانے والے اور زیادہ ہو گئے ملک کو کیا فائدہ پہنچا! اگر پنجاب یونیورسٹی قائم ہو جائے اور ہم کو علوم مشرقی میں ویسی ہی تعلیم دے ( گو ویسی تعلیم بھی ممکن نہیں ) تو بجز اس کے کہ چند بھکاری اور چند فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملک میں اور زیادہ ہو جائیں اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؛ ہم کو صاف صاف بتاؤ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو.... پروفیشنسی اور ہائی پروفیشنسی کے خطاب مرحمت فرمائے ہیں وہ کس مرض کی دوا ہیں اور اُن سے ملک کو، قوم کو، اُس کی دولت کو، اُس کی حکومت کو، اس کی تجارت کو، اُس کے اخلاق کو، اُس کی روشن ضمیری کو اور اس کی وسعتِ خیالات کو کیا فائدہ پہنچا یا آیندہ پہنچ سکتا ہے؛ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس تعلیم سے مقصد یہی ہے کہ ایسے نہ ہونے پائیں تو سب کچھ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد سرسید نے اس اعتراض کا سائنٹفک سوسائٹی جو انھوں نے علیگڑھ میں قائم کی تھی وہ بھی تو اسی اصول پر مبنی تھی کہ مغربی علوم ترجموں کے ذریعہ سے ملک میں شایع کیے جائیں. جواب دیا ہے. اور جو آسمان و زمین کا فرق سوسائٹی کے قیام کے وقت میں اور موجودہ زمانہ میں ہو گیا تھا اُس کو دکھایا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اُس زمانہ کے مناسب حال بلاشبہ ایک شخص کو جو سچے دل سے اپنی قوم اور ملک کی ترقی کا خواہاں ہو، اس خیال کا پیدا

ہوتا کہ ہم دیسی زبان کے ذریعہ سے اپنے ملک و قوم کو ترقی دیں نہایت بیجا اور واجب خیال ہو سکتا تھا، مگر رفتہ رفتہ تمام حجاب رفع ہونے گئے اور خود زمانے نے بتادیا کہ کدھر جاتے ہو اور ٹھیک رستہ کدھر ہے"

پھر آرٹیکل کو اس طرح ختم کیا ہے کہ "ہم کہہ چکے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کسی اصول پر قائم ہو، صحیح پر یا غلط پر، ہم کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اس لیے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ پنجاب یونیورسٹی پر کوئی حملہ کریں۔ ہاں۔ بلاشبہ ہم کو اس وقت خوف پیدا ہوتا ہے جبکہ ہم ایسے لوگوں کو جن کے ہاتھ میں خدا نے ہمارے ملک کی بھلائی بُرائی نفع نقصان سپرد کیا ہے، مُردہ مشرقی علوم و مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے پر مائل پاتے ہیں تو ضرور سمجھتے ہیں بلکہ بہ لحاظ حب قومی اپنا فرض جانتے ہیں کہ اس امر کو بیان کریں کہ مردہ علوم مشرقی اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے کی فکر میں پڑنا ہمارے لیے، ملک کے لیے، بلکہ گورنمنٹ کے لیے کچھ بھلائی نہیں ہے۔ اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں کہ ان کا مقصد مغربی علوم و مغربی زبان کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا ہونا چاہیے اور گورنمنٹ سے التجا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں یورپ کے علوم اور یورپ کی حکمت کو ترقی دینا اُس کا مقصد ہو۔"

## الہ آباد یونیورسٹی کی مخالفت

پھر ۱۸۸۹ء میں جب کہ الہ آباد یونیورسٹی اُسی اصول پر جس پر پنجاب یونیورسٹی کے قائم ہونے کا گمان تھا، قائم ہونے لگی اور سرسید کو معلوم ہوا کہ سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر سابق جو مشرقی علوم کے بڑے قدر دان تھے اُن کی پُرانی تجویز کے موافق یہ یونیورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور

مشرقی زبانوں کو ترقی دے تو انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی کی بھی اسی شدومد
کے ساتھ مخالفت کی جیسے کہ پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ اُن
کے ایک آرٹیکل کے چند جملے بطور نمونہ کے میاں لکھے جاتے ہیں۔ انھوں
نے کہا ”افسوس ہے کہ لوگوں میں یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے اور دن بہ دن
اُس کو وسعت ہوتی جاتی ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی
کی ہوگی۔ شاید اُس کی صورت میں کچھ تبدیلی ہو مگر اس کی پالسی وہی ہوگی جو پنجاب
یونیورسٹی کی تھی۔ پس علوم مشرقی کی ترقی کا دھوکا دے کر انگلش ہائی ایجوکیشن
کو گھٹانا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کولھو کے بیل کی آنکھیں بند کرکے دن
رات ایک ہی سرکل میں کولھو کے گرد پھراتے جاتا ہے اسی طرح ہندوستانی
رعایا کی آنکھیں بند کرکے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا بے شک
ایک مہذب گورنمنٹ کا کام ہے۔ ہم اپنا یقین ظاہر کرتے ہیں کہ الہ آباد یونیورسٹی پنجاب
یونیورسٹی کی بہن نہیں ہونے کی وہ انگلش ہائی ایجوکیشن کے لیے بمنزلہ ایک
مادر مہربان کے ہوگی۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ ہمارا خیال غلط ہے تو یہ
سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے! ہماری رائے میں اس کا جواب
صاف ہے۔ استقلال و استقلال، استقلال، ہمت، ہمت، ہمت، کوشش
کوشش، کوشش۔ ہم کو گورنمنٹ کی پالسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے اور خود
اپنے لیے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور
اگر ہم میں سیلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے
کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائیوں پر نہیں۔“
اگرچہ بالیقین یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سرسید کی تحریروں کا کیا اثر ہوا اور
آیا فی الواقع پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی کا مقصد مشرقی علوم

کی آڑ میں انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا تھا یا نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ جو خیالات دونوں یونیورسٹیوں کی نسبت شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں پھیل گئے تھے اور جو یہاں تک کہ معلوم ہوا ہے وہ خیالات محض بے بنیاد نہ تھے۔ ابتک علانیہ طور پر اُن کا کچھ ظہور نہیں ہوا۔ بظاہر دونوں یونیورسٹیوں میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں پایا جاتا جو ہائی ایجوکیشن کا سدراہ ہو۔ بے شک پنجاب یونیورسٹی جس طرح بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتی ہے۔ اسی طرح اورنٹیل کالج کے طلبہ کو بی او ایل اور ایم او ایل یا بالغ العلوم اور مالک العلوم وغیرہ کی بھی ڈگریاں دیتی ہے مگر جیسا کہ سرسید نے کہا تھا کہ " اس میں ناکامی کا بیج ہے اِس لیے وہ آپ ہی آپ ناکام ہو جائے گی " اورنٹیل کالج روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایک عرصہ کے بعد وہ فضول سمجھ کر توڑ دیا جائے۔

سرسید نے جو مذکورۂ بالا آرٹیکلوں میں مشرقی علوم (یعنی قدیم منطق فلسفہ طبیعات اور ہیئت وغیرہ جن کا درس و تدریس مسلمانوں میں قدیم سے جاری ہے) اور مشرقی زبانوں کو ترقی دینے یا دیسی زبانوں میں مغربی علوم کے شائع کرنے پر اس قدر لے دے کی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اس کے بالکل مخالف تھے۔ مشرقی زبانوں کی نسبت انھوں نے خود اپنے پہلے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ " بلاشبہ ہم اس بات کو کہ پنجاب یونیورسٹی کالج۔ قدیم مشرقی زبانوں کو ترقی دے۔ پسند کرتے ہیں کیونکہ قدیم لینگوج ماڈرن لینگوج کی زیور ہیں " اسی طرح انھوں نے مغربی علوم کے دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونے کی نسبت دوسرے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ " ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عام تعلیم کے لیے ہماری زبان نہایت عمدہ وسیلہ ہے جو تحصیلی دو تہائی

مکتبوں میں محدود رہنی چاہیے۔" اس کے سوا انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں خود اس مضمون کا رزولیوشن پیش کیا تھا کہ "علوم عربی جو ہماری قومی نشانی ہیں اور علوم مذہبی جو ہماری روحانی تربیت کا ذریعہ ہیں بدستور قائم رہیں اور مسلمانوں کے اوقاف کا روپیہ اُن کی ترویج اور ترقی میں صرف کیا جائے۔ پس انھوں نے جو علی العموم مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر اور دیسی زبانوں کے ترجموں کی مخالفت کی ہے اُس سے اُن کا صرف یہ مطلب ہے کہ ہندوستان کے کالجوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم محض انگلش لینگوج کے ذریعہ سے ہونی چاہیے نہ یہ کہ کالجوں میں انگلش لینگوج بطور سیکنڈ لینگوج کے برائے نام رہ جائے اور اصل مقصود مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی ترقی اور مغربی علوم کو بذریعہ دیسی زبانوں کے تعلیم دینا قرار دیا جائے۔

# ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت

مذکورۂ بالا آرٹیکلوں کے سوا اُن کی بیشمار تحریریں اسی موضوع پر علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی جلدوں میں موجود ہیں جن میں شاید سب سے اخیر وہ آرٹیکل ہے جو علیگڑھ گزٹ مورخہ ۱۹ فروری ۱۸۹۸ء میں اُن کے مرنے سے سوا مہینے پہلے شائع ہوا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے سردست ٹیکنیکل ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی ضرورت ہے جو ابتک بالکل پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔ چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیچوں میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے اس سے بھی سرسید کو یہی اندیشہ ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ کا منشا ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کے موقوف کرنے کا ہے اور اسی لیے جب کوئی ایسی اسپیچ اُن کی نظر سے گذرتی تھی وہ ضرور اس کے برخلاف کچھ

شبہ کچھ لکھتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں ایک رزو لیوشن ٹیکنیکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا اور رزولیوشن کی تائید میں ایک طول طویل اسپیچ کی تھی جو کانفرنس کی روئداد میں مندرج ہے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ اگر ٹیکنیکل تعلیم کالجوں اور اسکولوں میں محض اوپشنل طور پر جاری کی جائے اور ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریری تعلیم کو اُس سے کچھ صدمہ نہ پہنچے تو ہم کو اس میں کچھ عذر نہیں ہو سکتا لیکن اگر موجودہ طریقۂ تعلیم میں کوئی ایسی تبدیلی کیجائے جو ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریری تعلیم میں مخل ہو تو ہم کو علانیہ یہ بات ظاہر کردینی چاہیے کہ ہم ایسی تبدیلی سے سخت ناراض ہیں. سرسید کو یہ خیال اس سبب سے پیدا ہوا تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں بغرض ترقی ٹیکنیکل ایجوکیشن بار بار یہ خیال تکمیل تجاویز گورنمنٹ متعدد دفعہ ایسے امور پیش ہوئے تھے جو سرسید کے نزدیک علانیہ لٹریری تعلیم کو روکنے والے تھے اور انھیں دنوں میں گورنمنٹ شمال مغرب نے ایک رزولیوشن بغرض ترقی ٹیکنیکل ایجوکیشن مشتہر کیا تھا اور ایک کمیٹی اس بات کے دریافت کرنے کو منعقد کی تھی کہ ٹیکنیکل تعلیم کو کن طریقوں سے ملک کے حق میں مفید بنایا جائے سرسید نے اس خوف سے کہ کہیں یہ سب تمہیدیں ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کی نہ ہوں یہ رزولیوشن کانفرنس کے جلسہ عام میں جس میں ایک ہزار لائق ہندوستانی موجود تھے اس غرض سے پیش کیا تھا کہ اس باب میں ہندوستانیوں کی عام رائے معلوم ہونے کے بعد یونیورسٹی کو اُس سے آگاہ کیا جائے چنانچہ یہ رزولیوشن جس کی تائید مولوی حشمت اللہ ایم اے اور مسٹر تھیوڈور بک نے بڑے زور کے ساتھ کی تھی تمام مجمع کے اتفاق سے پاس ہوا اور الہ آباد یونیورسٹی اور گورنمنٹ شمال مغرب کو اس تمام کارروائی کی اطلاع دی گئی.

سرسید نے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے لیے انھیں تدبیروں اور کوششوں پر بس نہیں کی جو اُن کی زندگی کے ساتھ ختم ہونے والی تھیں بلکہ وہ قوم کی تعلیمی مشکلات کی حل کرنے والی ایک ایسی انجمن چھوڑ گئے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اس کو قائم رکھا تو وہ تمام معاملات میں جو قومی تعلیم سے علاقہ رکھتے ہیں سرسید کا نعم البدل ثابت ہوگی

# محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قائم کرنا

انھوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس کا ذکر پہلے حصہ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ انھوں نے اس قومی انجمن کو اپنی زندگی میں برابر گیارہ برس تک جاری رکھا اور اس عرصہ میں وہ تمام مرحلے جو ابتداءً ایسے کاموں میں پیش آتے ہیں نہایت خوبی کے ساتھ طے کر دیے اور آیندہ نسلوں کے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا کہ کس طرح اُس کو چلائیں اور کیونکر اُس سے فائدہ اٹھائیں جو کام قوم کے کرنے کے تھے ایک جم غفیر کے صلاح و مشورے سے قوم کو اُن کے کرنے کی صلاح دی اور جو باتیں گورنمنٹ پر ظاہر کرنے کی تھیں اُن کو بطور ایک جماعت کی رائے کے باوقعت صورت میں گورنمنٹ کے کان میں ڈالا اور اپنی بے نظیر لیاقت اور حسن تدبیر سے ایک ایسی مجلس کو جس میں تعلیم و تعلم کی روکھی پھیکی باتوں کے سوا کچھ نہ تھا، چند سال کے عرصہ میں ایسا دلچسپ بنا دیا کہ پانچ پانسو اور ہزار ہزار کوس سے ہندوستان کے مسلمان جو ایسی صحبتوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے خرچ کثیر برداشت کر کے ایسے چاؤ اور امنگ کے ساتھ جیسے کہ لوگ پھول والوں کی سیر یا شالا مار کے میلے میں دور دور سے آتے ہیں۔ اس علمی مجمع میں آ آ کر شریک ہونے لگے۔

# سول سروس فنڈ اور سول سروس کلاس

ایک اور تدبیر ترقی تعلیم کی جو قوم کی معمولی بے پروائی سے براہ راست پوری نہ ہو سکی، سول سروس کلاس اور سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا قائم کرنا تھا جن کو سرسید نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ جو مسلمان اپنی اولاد کو ولایت کی تعلیم کے لیے تیار کرنا چاہیں اُن کو محمڈن کالج میں ایک خاص طریقہ پر ابتدائی تعلیم دی جائے اور بعد امتحان کے جو لڑکے ولایت میں جانے کے قابل سمجھے جائیں اُن کو چندہ کے ذریعہ سے مدد دی جائے۔ یہ تجویز بھی اگر چل جاتی تو مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے حق نہایت مفید تھی۔ یہاں تک کہ ایجوکیٹڈ کلاس کے ہندو بھی اس ایسوسیئشن میں شریک ہونے کی دل سے آرزو کرتے تھے چنانچہ ۱۸۸۴ء میں جبکہ سرسید نے پنجاب کا دوسرا سفر کیا تو لاہور کے مقام میں برہمو سماج اور آریہ سماج کے تقریباً پچاس معزز ممبروں نے اور نیز انڈین ایسوسیئشن لاہور نے سرسید سے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ "اس ایسوسیئشن میں اگر ممکن ہو تو ہندوؤں کو بھی شامل کیا جائے وہ بہت خوشی سے اس میں چندہ دینے کو تیار ہیں" اگرچہ اور طریقوں سے ہندو مسلمانوں کے لیے ولایت کی تعلیم کی راہ کھل گئی مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار وہ کلاس اور وہ ایسوسیئشن دونوں توڑ دی گئیں۔

# کونسل کی ممبری

کونسل کی ممبری کے زمانہ میں جو ملک کی خدمت سرسید نے کی اُس کو نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں نے برابر تسلیم کیا ہے

چنانچہ جو ایڈریس انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے ۱۸۸۴ء میں اُن کو دیا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "ہندوستان کی قانونی کونسل میں جو آپ نے نہایت منفعت بخش کارروائی کی اُس کی نسبت یہاں (یعنی ایڈریس میں) صرف سرسری طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے اور آپ جو اُس زمانہ میں جبکہ آپ مجلس مذکور (یعنی کونسل) میں کام کرتے تھے بے غدارانہ طور پر تمام فرقوں کی بہبودی فکر رکھتے تھے اور قومی خیالات کو دلیری اور راستبازی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ قومی مطالب کا خیال رکھتے تھے اس کے لحاظ سے آپ ہماری طرف سے اور ہمارے ہموطنوں کی طرف سے دلی احسانمندی کے مستحق ہیں" اس طرح برہم سماج اور آریہ سماج کے ایک معزز ڈپوٹیشن نے جیسا کہ سفرنامہ پنجاب میں مذکور ہے سرسید کی ممبری کونسل کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ "ہم ممبران آریا سماج اور برہم سماج لاہور تمام ہندوؤں کی طرف سے آپ کی ان کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے قانونی کونسل میں اور نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لیے کی ہیں، ہندو راجہ مہاراجہ (غالباً یہ اشارہ راجہ شیو پرشاد کی طرف ہے) جن سے بہت کچھ امید کیجاتی تھی ملک کے لیے خیر خواہ نہ ثابت ہوئے لیکن آپ نے حب الوطنی کو ہاتھ سے نہ دیا اور البرٹ بل[1] اور دیگر مفید ملک تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی۔"

---

(حاشیہ بہ تفصیل) [1] البرٹ بل سے مراد وہ مشہور مسودہ قانون ہے جو لارڈ رپن کے عہد میں وائسرائیگل کونسل کے لیگل ممبر مسٹر البرٹ نے ۱۸۸۳ء میں یہ اجلاس کونسل پیش کیا تھا اور اسی لیے یہ مسودہ البرٹ بل کے نام سے

(حاشیہ)

مشہور ہوگیا تھا۔ اس مسودہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں کو بھی مثل یورپین مجسٹریٹوں کے یوروپین اور یوریشین باشندگان ہند کے فوجداری مقدمات کے فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ چونکہ اس مسودہ کو یوروپین اور یوریشین باشندوں کے حقوق سے تعلق تھا اس لیے جس قدر کہ لجیس لیٹو کونسل میں اور اخباروں میں اس مسودہ پر بحث اور نکتہ چینی اور مخالفت ہوئی تھی ویسی شاید ہی ہندوستان کے کسی مسودۂ قانون پر ہوئی ہو۔ ہندوستانی ممبروں میں سے سرسید نے اور آنریبل کرسٹوداس پال نے اس مسودہ کی بڑے زور سے تائید کی تھی مگر راجہ شیو پرشاد مثل اکثر یورپین ممبروں کے اُس کے مخالف تھے جس کی وجہ سے بنگالی اخباروں میں اُن پر سخت لتاڑ ہوئی تھی۔ جو اسپیچ سرسید نے اس مسودہ کی تائید کی تھی اس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

انھوں نے کہا "مائی لارڈ! میں اس بات سے واقف ہوں کہ اس بل کی نسبت اخبارات میں بہت بحث ہوئی ہے اور یورپین اور یوریشین باشندوں کے غیر سرکاری گروہ میں اُس کی نسبت بڑا تہلکہ مچا ہوا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ قانون مجوزہ سے اُن کی آزادی خطرہ کی حالت میں ہے۔ اگرچہ ہر طرح پر میری یہ خواہش ہے کہ جو رائیں یورپین اور یوریشین لوگوں نے ظاہر کی ہیں اُن پر بخوبی غور کیا جائے لیکن مائی لارڈ میں اقرار کرتا ہوں کہ جو طریقہ مسودۂ قانون سے برخلاف تحریک کرنے والوں نے اختیار کیا ہے اُس پر میں دلی افسوس کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ تحریک کرنے والوں نے اختیار کیا ہے اُس پر میں دلی افسوس میرے

(حاشیہ)

ہموطنوں کے برخلاف نہایت سخت اور کسی قدر بے احتیاطی کے ساتھ کلمات استعمال کیے ہیں۔ مائی لارڈ! اس مقام پر میں اپنی دلی امید ظاہر کرتا ہوں کہ ہندوستان کے کسی حصہ میں میرے ہموطن ان شخصوں کی پیروی نہ کریں گے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ واضعانِ قانون کی غور کے واسطے دلائل اور دعوؤں کے پیش کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ عام طور پر مجمع کر کے سخت گفتگو کرنا ہے۔ میرے نزدیک جو مخالفت اس مسودۂ قانون کی نسبت کی گئی ہے وہ زیادہ تر اس سبب سے ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے معاملات میں ہندوستان کے قوانین کی تاریخ سے واقفیت نہیں ہے اور جو خفیف تبدیلی قانون مروجہ میں اس بل کی رو سے کوئی تجویز کی گئی ہے اُس کے سمجھنے میں انھوں نے غلطی کی ہے۔ میں کانسٹیٹیوشنل لا کے مسائل سے واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس مسودۂ قانون کے برخلاف جو یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں حضور قیصر ہند کی یوروپین اور یورپین رعایا ایسے حقوق رکھتی ہے جن کے سبب سے وہ ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل کے اختیار سے باہر ہے۔ اس کی قانونی صحت کی نسبت میں بلا تامل شبہ کر سکتا ہوں۔ میں ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل کا ایک ناچیز ممبر ہونے کی حیثیت سے اس قسم کی پابندی کو ناپسند کرتا ہوں۔ ہم نے اپنے اختیارات انگلستان کی بڑی پارلیمنٹ سے حاصل کیے ہیں اور جب تک ہم ان اختیارات کی حد سے تجاوز نہ کریں اس وقت تک میرے نزدیک ان تمام معاملات میں جو ہندوستان

(حاشیہ)

سے متعلق ہیں، اس کونسل کی قانونی حکومت کی نسبت شبہ کرنا بیجا
معلوم ہوتا ہے۔ جو تحریک بالفعل اس مسودہ کے برخلاف کی گئی ہے
اس میں ہم انھیں دلیلوں اور رایوں کی تکرار پاتے ہیں جو اب سے
پہلے خطرہ پیدا کرنے والوں نے اُس وقت پیش کی تھیں جبکہ
ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتوں کے ہندوستانی ججوں کو صیغۂ دیوانی کی
اُن نالشات کی تجویز کا اختیار دیا گیا تھا جن میں یورپین اور یوریشین
فریق مقدمہ ہوں ہیں بغیر اندیشۂ تردید کے یہ بات کہہ سکتا ہوں
کہ جن مقدمات میں یوروپین شریک ہوتے ہیں اُن میں ہندوستانی
ججوں کے اختیارات دیوانی کے عمل میں لانے سے قومی اختلاف
کی بنا پر کوئی ناانصافی بلکہ شکایت بھی نہیں پیدا ہوئی ہے بیشک
اُس زمانہ کے خطرے پیدا کرنے والوں کے اندیشے بے اصل
تھے اور ان کی پیشین گوئی غلط ثابت ہونے والی تھی اس وقت
تمام برٹش انڈیا میں ہندوستانی جج اہل یورپ پر اختیارات
دیوانی ایک ایسے طریقہ میں استعمال کرتے ہیں جو درحقیقت اس
الزام کے لائق نہیں ہے کہ قومی امتیاز کا اُس میں اثر پایا جاتا ہے۔
لیکن بعض اوقات یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ دیوانی کا اختیار
فوجداری کے اختیار سے مختلف ہے۔ دیوانی کا اختیار صرف جایداد
پر موثر ہوتا ہے اور فوجداری کا اختیار ذاتی خصلت اور آزادی پر
پس ہندوستانی ججوں کے دیوانی کے اختیار کی اطاعت سے
یہ لازم نہیں آتا کہ فوجداری کے معاملات میں بھی اُن کے اختیار
پر رضامندی ظاہر کیجائے ۔"

(حاشیہ)

"مائی لارڈ! میں اس وجہ کو نہیں سمجھ سکتا جس پر یہ امتیاز مبنی ہے۔
عدالت ہائے دیوانی کی ڈگریات ایک شخص کو دولتمند سے مفلس
کر سکتی ہیں، دیوانی کے بعض صیغے صرف ذاتی تعلقات ہی سے
متعلق نہیں ہوتے مگر اُن میں ذاتی گرفتاری کے اختیارات بھی
شامل ہوتے ہیں اور انصاف کی غرض سے اُن میں اُس قسم کی
کارروائی کی اجازت دی گئی ہے جو فوجداری کی عدالتوں کے واسطے
قرار دی گئی، دیوانی کے مقدمات میں واقعات کی نسبت نتیجوں
کے قرار دینے کا قاعدہ زیادہ تر وہی ہے جیسا فوجداری کے مقدمات
میں ہوتا ہے ہندوستان میں دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں
امر حق کی تحقیقات ایک ہی قانون شہادت کے بموجب کیجاتی
ہے۔ عدالتہائے دیوانی کی تجویزوں سے فریقین کی نیکنامی پر تقریباً
اسی طرح دھبا لگ سکتا ہے اور ان کی عزت برباد ہو سکتی ہے
جیسی فوجداری عدالتوں کے احکام سے۔ پس میرے نزدیک دونوں
عدالتوں کے جوڈیشنل اختیارات میں امتیاز قرار دینے کے لیے
کوئی معقول بنیاد موجود نہیں ہے۔ اگر راست بازی انصاف اور
قومی بے تعصبی دیوانی کے معاملات میں ہندوستانی ججوں میں پائی
جاتی ہے تو اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ اُن میں وہی خصلتیں
فوجداری کے اُن مقدمات میں نہ پائی جائیں جن میں یورپین اور
یوریشین شریک ہوں، تمام ہندوستانی مجسٹریٹ اب بھی ان
مقدمات فوجداری میں جن میں ایل یورپ نالشی ہوں اور بطور
فریق ضرر رسیدہ کے عدالتوں سے چارہ جوئی کریں، اختیارات

(حاشیہ)

عمل میں لاتے ہیں۔ میں نے ابتک کبھی یہ نہیں سنا کہ یوروپین
انگریزی رعایا نے ہندوستانی مجسٹریٹوں سے داد خواہی کرنے میں
کوئی عذر کیا ہو، پس جب کہ یہ صورت ہے تو اس بات کی کوئی
وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں پر ان مقدمات میں
جن میں یوروپین انگریزی رعایا کی نسبت نالشیں پیش کی جائیں
اس قسم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ جو مجسٹریٹ کو دادرسی کے مجاز ہیں۔
ضرور ہے کہ وہ سزا دینے کے بھی مجاز ہوں اور رعایا کے کسی
فرقہ کا یہ کہنا ناواجب اور بیجا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندوستانی
مجسٹریٹوں کے روبرو چارہ جوئی کے واسطے تو جائیں گے لیکن اس
بات کو گوارا نہ کریں گے کہ جو نالش ہم پر کیجائے اُس میں وہ ہماری
نسبت تجویز کریں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ مجھکو یہ صحیح اطلاع دی
گئی ہے کہ جزیرہ لنکا میں جو اس ملک کے متصل واقع ہے۔
اور جو برطانیہ کی وسیع سلطنت کا ایک جزو ہے۔ ہندوستانی
مجسٹریٹ اور جج یوروپین انگریزی رعایا پر فوجداری کا اختیار عمل میں
لاتے ہیں اور وہاں اس جوڈیشل ناقابلیت کو جو قومی تفرقہ پر مبنی
ہو، کوئی جانتا بھی نہیں حالانکہ انگریزی سرمایہ اور انگریزوں کی تجارتی
اولوالعزمی کو بجائے اس کے کہ وہ اس جزیرہ سے جاتی رہی ہو
نہایت ترقی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک لنکا میں قہوہ کے کاشتکاروں
کے مطالب بنگالہ کے نیل کے کاشتکاروں کے مطالب سے کسی
حالت میں کمتر نہیں ہیں اور لنکا کے باشندے ہندوستان کے باشندوں
کی نسبت کسی طرح پر کچھ کم ایشیائی نہیں ہیں اور نہ لنکا میں اُن کا

حاشیہ ا

کوئی نہایت مضبوط محب قوم بھی میزان شائستگی میں اس سے زیادہ نہ اعلیٰ رتبہ کا دعویٰ کرے گا جو وہ ہندوستان کے باشندوں کی نسبت قرار دے گا مگر باوجود اس کے یوروپین انگریزی رعایا پر فوجداری کے اختیار کے معاملہ میں برٹش انڈیا کا قانون لنکا کے قانون سے پیچھے ہے. پس مائی لارڈ! میرے نزدیک یہ کچھ ناواجب بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے یہ خیال کریں کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ قانون میں اصلاح کرنے کی شدید ضرورت ہو گئی ہے. مائی لارڈ! جیسا کہ میں نے اس مسودہ کو سمجھا ہے اس میں یہ تجویز نہیں کی گئی ہے کہ ہر ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کو انگریزی یوروپین رعایا کی نسبت تجویز کرنے کا اختیار دیا جائے بلکہ صرف انھیں ہندوستانیوں کے معاملہ میں جنھوں نے اپنی مسلمہ راست بازی اور لیاقت کی بدولت جوڈیشل سروس میں ایسے عہدے حاصل کیے جائیں جو رتبہ میں اعلیٰ درجہ کے انگریزی عہدیداروں کے مساوی ہیں اس مسودہ میں ان جوڈیشل ناقابلیتوں کے دور کرنے کی تجویز کی گئی ہے جو قومی امتیاز پر مبنی ہیں. اس قسم کے ہندوستانی عہدیداروں کی تعداد نہایت محدود ہے اور اسی وجہ سے اس مسودہ کی نسبت یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ بغیر کافی غور و تامل کے پیش کیا گیا ہے یا اس کے سبب سے دادرسی کے موجودہ ذریعوں میں کسی بڑی عملی تبدیلی کا ہونا متصور ہے۔"

"جس دلیل پر قومی امتیازات کا نہایت لحاظ کیا گیا ہے میرے نزدیک اس میں بڑی غلطی ہے جس چیز کی لوگ ان ملکوں میں جن

(حاشیہ)

کو شائستہ گورنمنٹ کی برکت حاصل ہے اطاعت کرتے ہیں۔
وہ کچھ خاص شخصوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ قانون کے احکام ہیں
جب تک کہ قانون منصفانہ بے طرفدار اور بارحم ہوگا اور جب تک
اس قانون کا عمل درآمد ٹھیک ٹھیک طور پر کیا جا سکے گا اس وقت
تک ان شخصوں کی قومیت جو قانون کی تعمیل کریں، باریک خیال
والوں کے نزدیک بھی چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہونی چاہیے۔
جس چیز کی تعظیم اور ادب اور اطاعت درکار ہے وہ قانون کی
حکومت ہے نہ کہ خاص خاص شخصوں کی۔ پس جو لوگ ہندوستانیوں
کو اپنی برابری کا مستحق نہیں سمجھتے وہ اگر غور کریںگے تو معلوم ہو جائے
گا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ گورنمنٹ کے نوکر ہیں جن کے متعلق
گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ قانون کے مناسب عمل
درآمد کے واسطے انتظام کرنا گورنمنٹ کا فرض ہے اور اس
مقصد کے واسطے گورنمنٹ کو نہایت عمدہ ذریعے
جو بہم پہنچ سکیں منتخب کرنے پڑتے ہیں اور یہ ایک پوچ اور
غیر واجبی تجویز معلوم ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کی کوئی رعایا اس بات
پر اصرار کرے کہ عہدہ داروں کا انتخاب کسی خاص قوم یا فرقہ پر حصر
رکھا جائے۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے
اصول کی نسبت کسی جدید فیصلہ کی حاجت نہیں ہے، اس سوال
کی نسبت اس وقت بحث کی گئی تھی اور اُس کا فیصلہ عمدہ طور
پر ہو گیا تھا جبکہ انگلستان نے اپنی عالی حوصلگی اور انصاف سے
ہندوستان کے باشندوں کو یہ حقوق عطا کیے تھے کہ سلطنت
کی ملازمت میں ہندوستانیوں کی اسی حیثیت پر نوکری دیجائے

(حاشیہ)

جیسی کہ خاص انگریزوں کو، اس فیصلہ کا پچھلے برسوں میں عملی طور پہ نفاذ کیا گیا ہے اور انتظامی مصلحت اُس خفیف تبدیلی کی مقتضی ہوئی ہے، جو اس بل میں تجویز کی گئی ہے۔"

"لیکن مائی لارڈ! اس مسودہ کی تائید میں انتظامی مصلحت کی بہ نسبت زیادہ اعلیٰ درجہ کی وجوہات موجود ہیں، یعنی میں آزادی انصاف اور انسانیت کے اُن عمدہ اصولوں کا ذکر کرتا ہوں جن کی جائے قرار کہیں اس قدر نہیں جیسی کہ اُس قوم کی طبیعت میں ہے جس نے سب سے پہلے غلاموں کو آزاد کیا اور سب سے پہلے ہندوستانیوں کو اس امر سے مطلع کیا کہ کانسٹیٹیوشنل حقوق کے معاملہ میں قوم و مذہب کے امتیازات کی قانون کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں ہونی چاہیے تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ کسی ملک کی فلاح و بہبودی کی برباد کرنے والی اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے کہ حاکم اور محکوم کے درمیان قومی تفرقہ قائم رکھا جائے۔ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس بات کا خواہاں نہیں ہوسکتا کہ انگریزی قوم اور ہندوستان کے باشندوں کے درمیان دوستانہ خیالات کو بہ نسبت اُس کے جیسی کہ اب تک ہوئی ہے اور زیادہ ترقی ہو قدرت نے دونوں قوموں کو ایک پولٹکل (اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ایک سوشل) رشتہ میں ملا یا ہے جس کو جوں جوں زمانہ گذرتا جاوے گا اسی قدر زیادہ استحکام ہوتا جاویگا۔ مجھکو یقین واثق ہے کہ جبتک قومی امتیازات کو ملک کے عام قانون میں دخل ہوگا اُس وقت تک دونوں قوموں کے درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب میں مزاحمتیں قائم

رہیں گی۔ زندگی کی سوشل خوشی اور موافقت پولٹکل ہمسری سے اور ایک ہی قانون کے زیر حکم رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ذات کا سلسلہ شاید اس قدر عرصہ تک ہرگز قائم نہ رہتا اگر زمانہ قدیم کے مقنن برہمن کے واسطے ایک قانون اور شدر کے واسطے دوسرا قانون نہ بناتے۔ خیر زمانہ سابق کی ضرورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن مائی لارڈ! میں امید کرتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گذر جانے سے ہم شائستگی کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ قومی امتیاز کو بہرکیف ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے۔ میرے نزدیک یقیناً اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یوروپین ہوں یا یوریشین اس بات کو سمجھنے لگیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور ان کے پولٹکل حقوق یا کانسٹیٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ماتحت جو حفاظت کا استحقاق ان کو حاصل ہے وہ کچھ قوم یا مذہب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس بڑے حق کے سبب سے ہے جس میں سب شریک ہیں یعنی اس جلیل القدر شاہنشاہ کی وفادار رعایا ہونے کے حق کے سبب جس کے عہد دولت مہد نے ہندوستان کو امن و آسائش بخشی ہے اور اس کو تجارتی اولوالعزمی اور زمانہ شائستگی کے ہنر اور فنون کے اکتساب کے واسطے ایک مناسب مقام بنا دیا ہے۔"

"مائی لارڈ! چونکہ یہ موقع غالباً اخیر موقع ہے جو قانونی کونسل

جو کام خاصکر مسلمان معزز خاندانوں کی بھلائی کا سرسید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں کرنا چاہا تھا اُس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے یعنی قانون وقف خاندانی کا مسودہ جو بڑی محنت اور جانفشانی اور اعلیٰ درجہ کی قانونی لیاقت سے تیار کیا تھا اور جو بعض قانونی موانعات کے سبب کونسل میں پیش نہ ہو سکا وہ کم سے کم اس بات کو ہمیشہ یاد دلائے گا کہ قوم کی بھلائی کی کوئی تدبیر جو خیال میں آسکتی تھی عام اس سے کہ ممکن الوقوع ہو یا نہ ہو، اس شخص نے اُس کا تعاقب کیے بغیر نہیں چھوڑا۔

## نیشنل کانگرس کی مخالفت اور پیٹریاٹک ایسوسیشن قائم کرنا

نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے جو ۱۸۸۶ء میں سرسید نے مسلمانوں کو باز رکھا اگرچہ افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ اُن کی اس کارروائی سے تعلیم

---

سے مخاطب ہو کر گفتگو کرنے کا مجھکو حاصل ہوگا اس لیے میں اس اخیر گفتگو کو بغیر کہے اس بات کے ختم نہیں کر سکتا کہ حضور کا عہد حکومت اس بات پر دل سے مبارکبادی کا مستحق ہے کہ اُس میں ایک ایسا مسودۂ قانون پیش کیا گیا جس کے ذریعہ سے میں یقین کرتا ہوں کہ حسد انگیز قومی امتیازات بہت کچھ دور ہو جائیں گے اور آخر کار حکام اور محکوم کے درمیان اس ملک میں جس میں بہت سی قومیں مختلف مذاہب کی رہتی ہیں، دوستی اور باہمی ادب اور ہمدردی کو ترقی ہوگی"

، یافتہ ہندوؤں میں عموماً ایک قسم کی ناراضگی مسلمانوں سے پیدا ہو گئی مگر درحقیقت
سر سید نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ ایک خاردار جھاڑی میں جو شاید
اوروں کے لیے درخت بار دار ہو اُن کا دامن الجھنے نہیں دیا۔ سر سید کی اس
کارروائی کو اول اول تعلیم یافتہ لوگ نہایت تعجب سے دیکھتے تھے مگر پچھلے
دنوں میں پونا کے افسوسناک واقعات نے امید ہے کہ اُن کا تعجب رفع کر دیا
ہوگا۔ مسلمان جو تعلیم میں نسبتۃً مرہٹوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اگر کانگریس
والوں کے خیالات عام طور پر اُن میں پھیل جاتے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی
جہالت اور ناعاقبت اندیشی سے بہ نسبت پونا کے برہمنوں کے بہت زیادہ
اپنے تئیں گورنمنٹ کی بدگمانی کا نشانہ بنا لیتے اور جب اُن پر کوئی ایسا بُرا
وقت پڑتا جیسا پچھلے دنوں میں پونا کے برہمنوں پر پڑا تو جو ہمدردی اہل پونا
کے ساتھ ملک نے ظاہر کی اور جس قدر اُن کی طرف سے ڈیفنس میں پیروی کی
گئی اس کا سواں حصہ بھی بدنصیب مسلمانوں کے ساتھ، نہ مسلمانوں کی طرف
سے اور نہ غیر قوموں کی طرف سے ظہور میں آنے کی امید تھی۔ اگر اس میں کسی
کو شک ہو تو وہ مولوی ہدایت رسول کی مثال پر غور کرے جو کانگریس کے
بعض جلسوں میں شریک ہو کر بنگالیوں سے آزادی کا سبق پڑھ کر آئے تھے
اگر عام مسلمانوں میں جو تعلیم سے عموماً بے بہرہ ہیں اور جن میں مشکل سے
پچاس ہزار میں ایک تعلیم یافتہ نکلے گا۔ کانگریسین گروہ کے خیالات پھیل
جاتے تو اُن سے اکثر ایسی ہی بیجا اور نالائق حرکتیں سرزد ہوتیں جیسی ہدایت
رسول سے لکھنؤ کے ایک عام مجمع میں سرزد ہوئی اور جب وہ عدالت میں ماخوذ ہوتے تو اپنے
تئیں ویسا ہی بے یار و مددگار پاتے جیسا مولوی ہدایت رسول کا حال ہوا کہ اُنکو ضمانت تک میسر نہ آئی
اور جو سزا عدالت ماتحت نے اُس کے لیے تجویز کی اس کو بے چون و چرا اقتضائے جرم کی طرح

بھگتنا پڑا۔

پس اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا نہایت افسوس ہے لیکن کانگرس کی شرکت میں جو مضر نتائج مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے وہ اُن کے لیے اس سے بہت زیادہ افسوس ناک ہوتے اس لیے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس شخص کی چیخ پکار سے وہ ایک ایسے اجیٹیشن میں جو دیوانوں کے لیے ہو کی آواز اور ہشیاروں کے لیے خالی بادل کی گرج تھی، شریک ہونے سے باز رہے

اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگرس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ "حلوا خوردن را روئے باید" ہماری قوم میں عموماً پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ مذہبی تعصبات تازہ اکالہ کی طرح قوم کو فنا کر رہے ہیں، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی جان کا مال کا عزت و آبرو کا خواہاں ہے، پولیس ہمارے مذہبی جھگڑوں کی تحقیقات کرتے کرتے اور حاکم سزائیں دیتے دیتے تھک گئے مگر ہم لڑنے جھگڑنے کے لیے اُسی طرح تازہ دم ہیں، تمام قوم ہزاروں بیہودہ رسموں کی پابندی میں گرفتار ہے۔ اسراف اور فضول خرچی ہماری قومی خصلت بن گئی ہے، صدہا خاندان اپنی فضولیوں کے سبب بگڑ گئے اور بگڑتے چلے جاتے ہیں کروڑ ہا روپیہ کی جائداد قرضہ کی ڈگریوں اور عدالت کے جھگڑوں میں غیر قوموں کے پاس منتقل ہوتی چلی جاتی ہے، تعلیم کے لحاظ سے اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو ابھی ہم نے الف بے سے شروع کی ہے۔ عورتوں کی تعلیم جو قومی ترقی کی جڑ ہے۔ اس کے لحاظ سے ہم اب تک بالکل صفر ہیں، تجارت میں گویا ہمارا کچھ حصہ ہی نہیں، دولت

کو ہمارے ساتھ وہ نسبت ہے جو پانی کو چھلنی کے ساتھ ہے، لاکھوں مسلمان شہر شہر اور گاؤں گاؤں بھیک مانگتے پھرتے ہیں مگر ہم اس کا کچھ تدارک نہیں کرتے، ہزاروں اشراف خاندانوں کے لاوارث اور مفلس بچے آوارہ اور مطلق العنان پھرتے ہیں مگر ہم سے اُن کی پرورش اور تعلیم کا کچھ انتظام نہیں ہوسکتا، ہماری حالت پر فی الواقع یہ مثل صادق آتی ہے کہ" اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی "، جب کہ ہماری قوم کا یہ حال ہے تو کس برتے پر ہم نیشنل کانگرس میں شریک ہوسکتے ہیں اور کیا منہ لے کر ہم گورنمنٹ سے اُن حقوق کا مطالبہ کرسکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوئے۔ ہم کو پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے کچھ مانگیں، مانگنے کا استحقاق پیدا کرنا چاہیے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے اُن اصلاحوں کے خواستگار ہوں جو اُس کے اختیار میں ہیں ہم کو وہ اصلاحیں کرنی چاہییں جو خود ہمارے اختیار میں ہیں۔ ہم کو اپنی معاشرت، مذہب، اخلاق اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہزاروں کام کرتے ہیں جن کے بغیر ہماری دنیا اور دین دونوں خراب ہیں پھر ہم سلطنت سے کس بات کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم کو اپنے نبی کا یہ ارشاد یاد رکھنا چاہیے کہ "کَمَا تَکُونُوا یُوَلّٰی عَلَیْکُمْ" (یعنی جیسی تمہاری حالت ہوگی ویسی ہی تم پر حکومت کی جائے گی) اسی لیے سرسید نے اپنی لکھنؤ والی اسپیچ کے آخر میں مسلمانوں کی یہ نصیحت کی تھی کہ" گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں اُن حقوق کا مستحق بناؤ" اور کہا تھا کہ" جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے، اوروں سے پست رہیں گے اور اُس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے

تم کو کی ہیں مجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ۔ میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ اُن سے کہدوں اور اپنا فرض ادا کروں اور خدا کے سامنے جو قادر مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو دھو دوں۔

یہ ہے سلسلہ سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی خدمات کا جن میں بعض ایسی جلیل القدر ہیں کہ جس قوم میں ایک مثال بھی ایسی خدمات کی پائی جائے وہ قوم کم سے کم دنیا کی نظر میں حقیر نہیں سمجھی جاتی، جیسا کہ کہا گیا ہے

"متیٰ تَخْلُ تَمِیْمٌ مِنْ کَرِیْمٍ ۔ وَمَسْلَمَةُ ابْنُ عَمْرٍو مِنْ تَمِیْمٍ"

(یعنی جب کہ مسلمۃ بن عمرو (یعنی میرا ممدوح) بنی تمیم میں سے ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ بنی تمیم جوانمردوں سے خالی ہیں)